نیپال نگری

مستنصر حسین تارڑ

فہرست

"زندہ دیوی... کماری کماری... درشن درشن"

"دیوی دیکھو گے؟"

"کس قسم کی دیوی؟"

"لِونگ گاڈیس... زندہ دیوی.."

"ایک اور دیوی؟..."

شام ڈھلتی تھی اور ہنومان دھوکا کے دربار چوک میں یُوں ڈھلتی تھی کہ چوبی دیوتاؤں' برہنہ بڑی چھاتیوں اور اُن سے بڑی پیٹھوں پر براجمان دیویوں اور ہنومان جی کے باندر بُتوں اور بدشکل شیروں اور سنگی ہاتھیوں اور لکڑی کی حیرت زدہ کھڑکیوں کے بند کواڑوں اور ہزاروں خداؤں کے چرنوں میں بھینٹ کی گئی خوراک' تیل اور سفید چاولوں اور اُن میں سے اُٹھتی ہوئی وہ مہک جو ہم مومنین کو بُو لگتی تھی صرف اس لئے کہ وہ ہمارے خدا نہ تھے ورنہ ہم اُس مہک پر نثار ہوتے اور وہ خوشبو ہمیں سورگ کا راستہ سجھائی دیتی اور کھٹمنڈو کے اس سب سے بڑے اور پسندیدہ ٹمپل کامپلیکس کہ جس میں کئی صدیوں کی بُت پرستی کی ہوائیں ابھی ٹھہری ہوئی تھیں کہ جب لاکھوں برس پیشتر آسمانی خداؤں نے زمین پر اُترنا چاہا تو سب سے کم فاصلے پر ہمالیہ کی بلند برفیں تھیں تو وہ اُن پر اُترے اور دیوی انا پورنا جس چوٹی پر اُتری اُسے اپنا نام دیا اور تب یہ خدا اپنے وقت کے جیٹ لیگ سے تھکے ہارے بلندیوں سے نیچے آئے اور وادیِ نیپال میں بسرام کیا آرام کیا اور اب تک کرتے ہیں اور اُن کی کوئی نیت نہیں کہ وہ واپس اپنے آسمانوں میں جائیں کہ اُدھر اُن کے چرنوں میں تیل ڈالنے والا اور اُنہیں سفید چاول اُبال کر کھلانے والا کوئی

نہیں... اور آسمان پر بھی ایک اور شام ڈھلتی تھی یہی شام اس کھٹمنڈو دربار کے ٹمپل کامپلیکس میں گھومتے آریائی ناکوں والے اور غیر آریائی چپٹی ناکوں والے ان گنت سیاح اس دربار کی ہزاروں برس سے ٹھہری ہوئی صنم آشنا ہوا میں سانس لیتے ہوئے گھومتے تھے اور ہم ذرا احتیاط سے سانس لیتے تھے کہ کہیں یہ صنم پرستی کی ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر ہمیں پھر سے بت پرست نہ بنا دے اور کم کم سانس لیتے تھے ان چپٹی اور تیکھی... تھوم کی تری ایسی تیکھی ناکوں والے گھومتے سیاحوں اور اُن کا پیچھا کرتے نیپالی گائیڈوں اور ہانگ کانگ سے درآمد کردہ پلاسٹک کے لارڈ بدھاز اور کم از کم ہم مومنین کے لئے لارڈ شیوا کے خوفناک نقابوں... گُل دانوں اور شہد کے پیالوں اور تانترک آرٹ کے نمونوں... کہ اس آرٹ فارم کا تانا بانا بدھ مت کے نروان اور ہندو دیومالا کے دھاگوں سے بُنا گیا تھا... اور یُوں نئے دیوی دیوتا ظہور پذیر ہوئے جن کا بدن ہندو اور اُن کی رُوح بدھ تھی... تانترازم اصل میں ایک کوشش ہے رُوح اور مادے کے ملاپ کی... جہاں اس کے پجاری اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قدرت کے مظاہر پر حاوی ہو کر نروان حاصل کرتے ہیں... تو ان تانترک نمونوں پر بھی تو وہ شام ڈھلتی تھی...

اور ایک ریستوران کی کھڑکی میں سے جھانکتی ایک بے حیا اور سُرخ چہرے والی... فروزاں کئے ہوئے چہرے والی بیباک سیاح لڑکی اور اُس کے سامنے براجمان اُس کے گورکھابوائے فرینڈ پر بھی یہی وہ شام تھی جو ڈھلتی تھی...

یہ شام ہنومان دھوکا کے قریب میں جگن ناتھ مندر پر بھی اُترتی تھی جس کی کھڑکیوں کے نیچے اُن دیوی دیوتاؤں کے چوبی مجسمے قطار اندر قطار تھے جو ذرا نہ جھجکتے تھے' کچھ خیال نہ کرتے تھے' کچھ لحاظ نہ کرتے تھے کہ کوئی اُنہیں دیکھ رہا ہے یا نہیں اور شدید طور پر مخربِ الاخلاق حرکتوں میں "مشغول" تھے۔ اُنہوں نے شب کی تاریکی کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور مشغول ہو چکے تھے اور کاما سوترا کے ہر آسن کو کھلے عام پرفارم کر رہے تھے۔ شرمیلی خواتین ذرا پلّو مُنہ میں دبا کر اُنہیں کن اکھیوں سے دیکھتی تھیں اور حساب لگاتی تھیں کہ کیا اُن کے گھر والے نے دیوتاؤں کے اِس آسن کو برتا ہے کہ نہیں اور ہم پاکیزہ رُوحیں لاحول پڑھتے ہوئے اُنہیں نہایت انہماک سے دیکھتے تھے تو شام اُن چوبی مجسموں پر بھی اُترتی تھی جو لذت اور لُطف کی ہمیشگی میں قید تھے...

ہمیں تو نوید دی گئی تھی کہ لذت اور لُطف کی وہ منزل جس میں سرشاری کا چشمہ اُبلنے کو ہوتا ہے تو وہ لمحہ صدیوں پر محیط ہو جائے گا... اور بے شک یہ نوید صرف اُن مومنین کے لئے تھی جو اس دُنیا میں ایسے لمحوں سے پرہیز کرتے ہیں... اور پھر اُنہیں زہد و عبادت کا یہ انعام جنت میں ملے گا۔

لیکن جگن ناتھ مندر کے ان چوبی مجسموں نے وعدۂ فردا پر اعتبار نہیں کیا تھا اور اسی دُنیا میں لذت اور لُطف کی ہمیشگی میں قید تھے... البتہ اُن میں "حرکت" نہ تھی جو ایسے لمحوں میں جزو لاینفک ہوتی ہے...

شرمیلی خواتین ساڑھیوں کے پلّو مُنہ میں دابے ان مشغول خداؤں کو کن اکھیوں سے تکتی تھیں اور یقیناً اُس شب اُنہوں نے اپنے مجازی خداؤں کی زندگی کو حرام کرنا تھا۔

تو شام لُطف اور ہمیشگی کے ان مظاہر پر بھی اُترتی تھی۔

"ایک اور دیوی؟" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

اس شہرِ کھٹمنڈو میں اِنسان کم تھے اور دیوی دیوتا زیادہ... اور اُن میں سے اکثر حُسن کے کسی پیمانے پر پورے نہ اُترتے تھے اور لحاظ نہ کرتے تھے کہ کوئی اُنہیں دیکھ رہا ہے یا نہیں... تو اس جنسی کیفیت میں ایک ڈھلتی شام میں ایک اور دیوی...

"ایک اور دیوی...؟"

"لیکن صاحب... یہ تو زندہ دیوی ہے... اس کے درشن سے آپ سیدھا ڈائرکٹ سورگ میں جاتا ہے..." پرکاش نے کہا...

اور یہ پرکاش کیا تھا؟...

دُنیا بھر کے سیاحتی مقامات پر پائے جانے والے گائیڈز کا ایک پروٹو ٹائپ تھا... چرب زُبان' کمینہ' آپ کے چہرے کی بجائے جیب پر نظر رکھنے والا۔ آپ کو وہی کہانیاں سُنانے والا جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ نہایت طوطا چشم اور آپ چاہیں یا نہ چاہیں اپنے آپ کو آپ کے ساتھ نتھی کر دینے والا۔ اس کی قومیت مختلف ہوتی ہے لیکن اس کی خصلت بین الاقوامی ہوتی ہے... وہ فلارنس میں مائیکل انجلو کا "ڈیوڈ" دکھا کر آپ سے ایک لاکھ لیرے ڈیمانڈ کر سکتا ہے' استنبول کی کسی مسجد میں سر پر رومال ڈالے آپ کے ہمراہ جائے گا

اور باہر آتے ہی دامن پکڑ لے گا۔ بنکاک کے کسی براتھل ہاؤس میں لے جائے گا اور آپ کا بٹوہ خالی کر دے گا۔ غرناطہ کے البسین محلے میں کسی جپسی کے غار کے دہانے پر آپ کو ملے گا اور "سینور" کہہ کر جھکے گا اور جب اُٹھے گا تو آپ کی جیب میں ایک سوراخ ہو گا... اور ہنزہ کے بازار میں ملے گا تو ہنزہ واٹر کے وعدے کر کے آپ کو قلاش کر دے گا بس یہ بھی وہی گائیڈ تھا جو ہمارے ساتھ نتھی ہو رہا تھا اور بہت دیر سے ہمارے پہلو میں چلا آتا تھا اور اُس کی مسکین شکل سے ہرگز یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ بالآخر یہ بھی طوطا چشم ہو جائے گا اور وہ ہماری درخواست کے بغیر ہنومان دھوکا اور دربار چوک کی عمارات اور مندروں کے بارے میں معلومات فراہم کئے چلا جاتا تھا...

میں چونکہ ایک تجربہ کار گائیڈ دیدہ تھا اس لئے میں نے سُنہری بابا سے کہا "بابا اس کردار کو جلد از جلد رُخصت کر دیجئے۔ اس کی رفاقت ڈالروں کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔"

لارڈ بائرن عرف سُنہری بابا نے چلتے ہوئے ایک فحش سا ٹھمکا لگایا اور بولے "تارڑ صاحب یہ تو نہایت عاجز سا بندہ ہے۔ اتنا مسکین ہے کہ صرف اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں ورنہ حالات کا مارا ہوا لگتا ہے..."

"تھوڑی دیر بعد ہم اس کے مارے ہوئے لگیں گے۔"

"اور یُوں بھی نیپالی بھائی ہے کیا سوچے گا کہ پاکستانی بھائی ایسے ہوتے ہیں... ایک کونے میں بیٹھا دہی کھا رہا ہے آپ کا کیا لیتا ہے..." اور اس کے ساتھ سُنہری بابا نے ایک ایسا قہقہہ بلند کیا جس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے شاید ہنومان جی کے کسی بُت کی دُم ہوا میں بلند ہو گئی ہو گی...

کہا جاتا ہے کہ ایک سردار جی جب دور دیسوں میں کمائی کر کے وطن لوٹے تو گھر کا صحن بے شمار بچّہ لوگ سے بھرا ہوا تھا... اُن کی یادداشت میں جب اُنہوں نے اپنی سردارنی کو چھوڑا تھا ایک دو بچّے تھے تو انہوں نے پُوچھا اور کسی ایک نونہال کی جانب اشارہ کر کے پُوچھا کہ بسنت کورے یہ کب پیدا ہوا تھا... بسنت کور نے دوپٹے کا پلّو مُنہ میں دبا کر حیا سے دوہری ہوتے ہوئے بتایا کہ سردار جی یاد نہیں جب آپ صرف دو دن کے لئے فلاں سال چھٹی پر آئے تھے تو یہ وہ ہے... یُونہی متعدد بچوں کے جواز پیش کئے

گئے لیکن اُن میں سے ایک ایسا تھا جس کی آمد کا کچھ اَتا پتہ نہ ملتا تھا کہ اس کا ورود سردار جی کی کونسی آمد کے بعد ہوا تھا اور تب سردارنی نے کہا کہ... سردار جی یہ تو ایک کونے میں بیٹھا دہی کھا رہا ہے آپ کا کیا لیتا ہے...

چُنانچہ پرکاش بھی وہی بچّہ تھا جس کے ورود کا کوئی جواز میسّر نہ تھا... اور جب میں اُس کی بھڑکا دینے والی تپک اور جلن پیدا کرنے والی موجودگی سے عاجز آ گیا تو میں نے کہا "تم اپنے آپ کو گُم کیوں نہیں کر دیتے؟ وہائی ڈونٹ یُو گیٹ لاسٹ؟"

"صاحب... یہ ہمارا شہر ہے"۔ اُس نے نہایت ملائمت سے کہا "ہم اس میں گُم نہیں ہو سکتا"۔

"تو خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو..."

"کونسے خدا کے لئے صاحب... مہاراج ہنومان کے لئے۔ وشنو کے لئے۔ شیوا کے لئے۔ بدھ کے لئے... انا پورنا کے لئے... کس خدا کے لئے؟"

"یار کسی بھی مناسب خدا کے لئے..."

تب اُس نے ترُپ کا پتہ پھینکا "دیوی دیکھو گے؟"

"کس قسم کی دیوی؟"

"لِونگ گاڈیس... زندہ دیوی"

"ایک اور دیوی..."

"شاید سری دیوی ہو..." لارڈ بائرن نے اپنی سُنہری ریش پر ایک حلالہ کی خواہش کرتے مولوی کی طرح ایک شہوت بھرا ہاتھ پھیرا "تارڑ صاحب کیا حرج ہے"

"اور اس سے پُوچھیں اِس دیوی کی عُمر کتنی ہے؟" فاروق جو دراز قد اور لاہوری محاورے کے بقول ذرا ڈشکرا اور لاپرواہ تھا اُس کی آنکھوں میں اُن دیویوں کے بدن اُترنے لگے جن کو اُس نے اپنے برسوں میں دیکھا اور پرکھا تھا... کتنا پرکھا تھا؟ کون کیا کہہ سکتا تھا...

گمشدہ خالدہ کی وہ خفیف سی آواز آئی جو نہ سُنائی دیتی تھی اور نہ سمجھ میں آتی تھی اور اِنسان ٹاک ٹوئیاں مارتا رہتا تھا کہ اس عفیفہ نے کیا کہا ہے "تارڑ صاحب... دیوی دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"لو.. ذرا جھانک لیتے ہیں.." طاہرہ بی بی دے گرل گائیڈ نے اپنی عینک ذرست کی اور فوراً ہوشیار ہو گئیں... ذرا جھانک لیتے ہیں' اُن کا تکیہ کلام تھا اور وہ اِسے ایسے ایسے نازک مقامات پر استعمال کرتی تھیں کہ اِنسان دنگ رہ جاتا تھا۔ مثلاً طاہرہ بی بی ذرا دیکھیں تو سہی اس جاپانی خاتون نے کتنا خوبصورت بلاؤز پہن رکھا ہے... تو فوراً جواب آ رہا ہے کہ ذرا جھانک لیتے ہیں.. یا یہ جو یورپی سیاح ہمارے آگے آگے چل رہا ہے تو دیکھیں اس کی جین پھٹی ہوئی ہے تو.. ذرا جھانک لیتے ہیں..

"تو یہ لونگ گاڈیس... سچ مچ زندہ ہے؟" میں نے پَرکاش سے پُوچھا۔

"جی صاحب.. لیکن وہ اپنے مندر میں سنگھار کرتی ہے اور وہاں بجلی نہیں دیئے جلتے ہیں اور دیوی اُن کی روشنی میں سنگھار کرتی ہے۔"

"لپ سٹک کا کونسا شیڈ استعمال کرتی ہے؟" خالدہ نے بال جھٹک کر پُوچھا..

پَرکاش کہتا گیا "اور وہ پجاریوں کو درشن نہیں دیتی.. کتنے لوگوں کو درشن دے.. اور شاید اس وقت نیپال میں کوئی ایک ٹورسٹ نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اُس نے لونگ گاڈیس کو دیکھا ہے.. لیکن.."

"لیکن کیا برخوردار..." گرل گائیڈ ہمشیرہ نے فوراً کہا۔

"لیکن... اگر میں آپ کے ساتھ جاؤں تو شاید وہ درشن دے.. اُس کا شکل دیکھے گا تو سیدھا سورگ میں جائے گا.. آپ لوگ سورگ میں نہیں جانا چاہتے؟"

"رِند کے رِند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی.." لارڈ بائرن نے حسب عادت غالب کو بے وجہ کوٹ کر دیا "تارڑ صاحب جنّت ہاتھ سے جا رہی ہے اس لونگ گاڈیس کے درشن کر لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے؟"

"اور یہ جو پَرکاش دی ٹِنکر ہمارے ساتھ چپکی ہوا چلا آ رہا ہے یہ بعد میں پیسے مانگے گا تو اس کا کیا کریں گے؟"

"جنّت کے لئے تھوڑی سی انوسٹمنٹ کر دیں گے جناب عالی.. اگرچہ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے.."

پچھلے دو ہزار برس سے وادی کھٹمنڈو سلطنت نیپال کی نگہبانی کر رہی ہے.. اور

یہاں دُنیا کے دو بڑے مذاہب ہندو اور بدھ کی مقدس ترین یاترائیں ہیں۔ نیپال کی قدیم تاریخ قصّوں اور داستانوں کی دُھند میں ملفوف ہے۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ ایک زمانے میں وادیٔ کھٹمنڈو ایک وسیع جھیل تھی.. جسے مانجو سیری نے خشک کر دیا.. اور اس کے بعد اپنے گندھارا کے اُس بدھ نے جو بدھ کی پیدائش سے پیشتر ایک اور بدھ تھا جو بودھی ستوا کہلاتا تھا اس وادی میں قدم رکھا' یہاں ایک جھونپڑا بنایا اور قیام کیا... اُس کے بعد اشوک اعظم بھی اپنے نئے مذہب کے پرچار کے لئے مہاتما بدھ کی جائے پیدائش پر ایک ستون نصب کرنے کے لئے ادھر آیا...

اور بودھی ستوا اور اشوک کے بعد... ایک طویل داستان ہے کہ کون کون آیا...

لیکن اُن کے بعد اگر کوئی عظیم ہستیاں اس وادی میں آئیں تو وہ ہم تھے... اور پَرکاش ہمارا پیچھا نہ چھوڑتا تھا اور لونگ گاڈیس کے درشن کے لالچ دیتا تھا...

وادیٔ کھٹمنڈو میں تین بڑے دربار ہیں...

تین ٹمپل کامپلیکس ہیں...

ہنومان دھوکا۔ پٹن اور کھٹمنڈو سے دُور بھگتوں کا شہر۔ بھگتا پور۔

نیو روڈ کے مصروف سپر سٹورز اور نیون لائٹس سے بھڑکتے اور ٹریفک کے شور سے بھرپور چوراہے میں آپ اُترتے ہیں۔ ذرا ایک جانب ہوتے ہیں تو شور کی نبضیں رُک جاتی ہیں۔ آپ ہنومان دھوکا کی مکانکی ٹریفک سے خالی وسعت میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور یکدم شانت ہو جاتے ہیں۔ نروان چند قدم کے فاصلے پر آپ کا منتظر ہوتا ہے.. اپنے قدموں کی آواز بھی سُنائی دینے لگتی ہے... اور ہنومان جی دُم اُٹھائے ماتھے پر سُرخ تلک لگائے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

نیپال کا مَلّا خاندان (اور اِسے ہرگز مُلّا نہ پڑھا جائے) چونکہ اپنے آپ کو راجہ رام چندر کی اولاد میں سے سمجھتا ہے یعنی یہ مقامی شاہ صاحبان ہیں جیسے ہمارے ہاں.. صدیقی' علوی اور قریشی برادران ہوتے ہیں اور اسی لئے ذرا غیر ملکی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو مقامی شودھروں سے سپیریئر سمجھتے ہیں ویسے ہی یہ مَلّا حضرات ہیں.. کہا جاتا ہے کہ ہنومان جی یعنی مقدس باندر صاحب نے سری لنکا کے بن باس کے دوران راجہ رام چندر کے ساتھ نہایت شفقت برتی تھی اور اُن کے لئے پورے کے پورے سالم پہاڑ.. یعنی

ماؤنٹین رینج اپنی ہتھیلی پر اُٹھا کر بمشکل پرواز کی تھی اس لئے یہ ملّا خاندان اُن کا شکر گزار ہے اور اُنہیں مرشد مانتا ہے... یعنی 'باندر جنھاں دے مرشد ہُو۔' چُنانچہ یہ پُورا علاقہ اس پوتّر اور پہنچے ہوئے باندر کے مجسموں سے منصوب ہے۔ یہی وہ نصیب کو جگا دینے والے اور خفیہ بخت کو بیدار کر دینے والے ہنومان جی ہیں جو اِن ملّاؤں کے محافظ تھے پیر و مرشد اور او تار تھے جو دورانِ جنگ انہیں فتح کی قربت میں لے جاتے تھے گویا ان کے وہ سبز پوش تھے جو دشمن طیاروں کے بم ان کی نگری سے اِدھر اُدھر کر دیتے تھے۔ چُنانچہ نیو روڈ چوک سے اَندر داخل ہوتے ہی داخلے پر ایک ایسے بندر کا مجسمہ ہے جس کا بندر ہونا سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف ایک ناک مُنہ سے عاری پتھر ہے اور نہ اُس کی دُم ہے اور نہ یہ کسی کی جُوئیں نکالتا ہے...

اس کے پتھر ماتھے پر سُرخ پینٹ کے اتنے کثیر تلک تھوپ دیئے جاتے ہیں کہ ہنومان مہاراج باقاعدہ کیمونسٹ پارٹی کے بنیادی ممبر لگتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کے کندھوں پر ایک سُرخ چادر اوڑھا دی جاتی ہے اور اُن کے سر پر تانی ہوئی چھتری باقاعدگی سے تبدیل کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں داتا صاحب کے عرس کے موقع پر اُنہیں غسل دیا جاتا ہے اور چادر تبدیل کی جاتی ہے... اگرچہ قبر اور پتھر کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اِنسان کو ثواب کی ضرورت ہوتی ہے۔ قبر اور پتھر اگر احتجاج بھی کریں تو بھی ان کی کون سُنتا ہے...

وادیٔ کھٹمنڈو میں رواں دریاؤں ... بھاگ متی اور وشنو متی کے درمیان واقع اس ہنومان دھوکا۔ دربار چوک میں ہم آئے تھے تو دوپہر تھی اور اب شام ڈھلتی تھی.. ان کیمونسٹ ہنومان جی کی قربت میں ایک "سُنہری دروازہ" ہے جس کے باہر دو شیر پہرا دے رہے ہیں.. شیوا اور شکتی اِن شیروں پر سوار ہیں اور مُجھے تو قدرے خوفزدہ لگے... شیر پر سواری کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بے شک آپ ایک دیوتا ہی کیوں نہ ہوں۔ اس "سُنہری دروازے" کا موازنہ... اور دُنیا میں کہیں بھی اگر کوئی دروازہ ہو گا اور وہ ذرا سُنہری ہو گا تو اُس کا موازنہ اطالیہ کے مائیکل انجلو اور ڈی ونچی کے شہر فلارنس کے مرکزی چوک میں ایستادہ "جنّت کے دروازے" سے کیا جاتا ہے۔

میں نے فلارنس میں اس جنّتی دروازے کی ساخت اور کاریگری کو نہایت انہماک اور ہمدردی سے دیکھا تھا... اپنے آپ کو اس کی صنّاعی کے سحر میں گرفتار کرنے کے

لئے مجبور کیا تھا اور تب بھی نہیں جان سکا تھا کہ اس پر کندہ پیغمبروں کی کہانیاں... اور ان میں حضرت نوح علیہ السلام کی کہانی بھی تصویر ہوئی تھی... میں نہیں جان سکا تھا کہ اس دروازے میں وہ کون سی ایسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے جنّت کے دروازے کا خطاب دیا گیا ہے... اگر یہی جنّت کا دروازہ ہمارا منتظر ہے تو ایسی محبت سے ہم باز آئے... کچھ اسی طور اس نیپالی "گولڈن گیٹ" کو دیکھ کر... تمامتر ہمدردی اور انہماک کے باوجود میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں ذوقِ جمال کی وہ کونسی ایسی خصوصیت ہے کہ اس کا درشن لازمی ٹھہرے...

سوات۔ چنیوٹ۔ سرگودھا۔ بھیرہ اور بھٹ شاہ میں ایسے درجنوں دروازے تھے جن کی کاریگری ایسی تھی کہ اِنسان جنّت میں جانے سے جھجکتا نہ تھا...

البتہ اِس گولڈن گیٹ کے اُوپر تین ایسی شبیہیں تھیں جن کو میں نے ذرا شوق سے دیکھا۔ ان میں عظیم رزمیے مہابھارت کا ایک منظر اُبھارا گیا تھا...

وہاں لارڈ کرشنا جلوہ گر تھے اور موصوف قطعی طور پر تنہائی پسند نہ تھے اور جب بھی جلوہ گر ہوئے نہایت حسین رفاقت میں جلوہ گر ہوئے.. تو یہاں بھی وہ اپنی دل پسند اور نہایت عزیز... رُکمنی اور ستیابھاما گوپیوں کی ہمراہی میں جلوہ افروز تھے اور کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا... دیوتاؤں کو کم از کم اتنی تو آزادی اور لبرٹی ہوتی ہے کہ وہ گوپیوں کے ساتھ چہلیں کرتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں اور پھر بھی مقدس رہتے ہیں۔ اور ایک ہم اِنسان لوگ ہیں کہ ذرا کسی لڑکی کا تذکرہ کر دیا' ذرا کسی شکل کی دیدہ زیبی کے سحر کو بیان کر دیا تو فی الفور فتویٰ نہیں تو اعتراض وارد ہو گیا کہ جی تارڑ صاحب کے سفرناموں میں لڑکیاں بہت ہوتی ہیں۔ ہنگامہ ہے کیوں برپا...

ہنومان دھوکا سے آگے بڑے چوک کے سامنے جو ایک چوبی محل ہے اُس کی میناکاری اور کاریگری ایسی ہے کہ آپ سر اُٹھا کر اُس کی کھڑکیوں' چھجّوں اور راہداریوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کی گردن کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی اُٹھتی ہے کہ یہ کیا ہے جس کی خبر مجھ کو نہ تھی۔ یہ کیسی کشیدہ کاری ہے کہ اِنسان کے ہاتھوں نے اسے تخلیق کیا.. اس محل کے قدیم چھجّے اور ستون جن پر دیوی دیوتاؤں اور جنگلوں اور صحراؤں میں جتنے بیل بُوٹے اور گُلِ رعنا ہیں وہ سب کھدے ہوئے ہیں اور شاید زندہ ہو جانے کے لئے کسی پھونک

کے منتظر تھے... اگر یہ صرف حیرت سے زندہ ہو سکتے تو کب کے ہو چکے ہوتے.. ان کے لئے تو صرف میری حیرت ہی کافی تھی.. وہ کھڑکیاں اور جھکاؤ والی چھتیں اپنے سامنے ایک نابینا کی طرح نہیں تکتی تھیں بلکہ ایک ترچھے زاویے پر آپ پر جھکتی چلی آتی تھیں اور آپ کو دیکھتی تھیں اور میں ذرا سرنگوں ہوتا تھا کہ لکڑی کے طلسم کا یہ جنگل جسے اِنسان کے عقیدے نے جنم دیا ہے ابھی مجھ پر گر جائے گا...

یہ وہی پیچیدہ اور مرصع میناکاری تھی جو قصر الحمرا کے ایوانوں میں گچ اور چُونے سے کی گئی تھی.. ماکلی کے مقبروں میں سُرخ پتھر میں بھی یہی کاریگری غروب آفتاب میں سُرخ ہو کر اِک جہانِ حیرت وجود میں لاتی تھی جو اِنسان کو گنگ کر دیتا تھا... وہ بولنے جوگا نہیں رہتا تھا.. تخلیق کار کافر ہو یا مومن... اگر وہ دل کی گہرائی سے عقیدے پر یقین رکھتا ہے تو اس کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہوتا... وہ بدن کے اُس مقام پر اثر کرتی ہے جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا.. میں نے اگرچہ وادیٔ کھٹمنڈو کی پہاڑیوں کو اور کشور ہندوستان کی فصیل کو جس میں بے شک ایورسٹ اور اناپورنا سربلند تھے اپنے ایبٹ آباد اور کے ٹو سے کمتر جانا تھا لیکن.. اِس محل کی چوبی کاریگری اور ایسی کڑھائی کو جیسے وہ ایک پھول دار فیتہ ہو۔ جھالر ہو.. جیسے لکڑی میں گوٹے کناری کا کام ہو لاہور شہر کے جھروکوں اور کھڑکیوں کی نسبت بہت برتر جانا...

صدیوں پیشتر کہیں ایک جنگل تھا جو اِنسانی ہاتھوں نے مُوم کیا' اُسے سنوارا سنگھارا پھر اُس سے پتے بُوٹے اور بیلیں بنائیں اور اُن کے درمیان میں دیوی دیوتاؤں کے معبد بنائے اور اُسے لا کر کھٹمنڈو دربار میں بڑے چوک کے سامنے رکھ دیا.. اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ لوگ جب اسے کھودتے تھے' اس کی جھالریں اور پھول دار فیتے بناتے تھے تو وہ جانتے تھے کہ صدیوں بعد ایک سیاح آئے گا جو سر اُٹھا کر اُسے دیکھے گا تو اُس کی گردن کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اُٹھے گی اور وہ کہے گا کہ یہ کیا ہے جس کی مجھے خبر نہ تھی.. اس لئے کہ جب کبھی کوئی سنگ تراش "فاسٹنگ بدھا" یا "ڈیوڈ" تراشتا ہے تو اُسے صدیوں بعد اُسے دیکھنے والے کسی ایک سیاح کی آنکھوں میں در آنے والی حیرت کا علم ہوتا ہے.. اور یہی وہ متوقع حیرت ہوتی ہے جو اُسے تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔

میں اِس محل کے اندر نہیں جا سکتا تھا کہ یہ اب بھی عوام الناس کی آنکھوں کے

لئے بند اور پوشیدہ ہے.. اگرچہ اِسے سربراہان مملکت اور بلند مرتبت شخصیات کے لئے.. شاہ نیپال کی رفاقت میں کھولا جاتا ہے اور دکھایا جاتا ہے...

میں ہمیشہ ایک شدید آزردگی سے ٹیلی ویژن کے خبرنامے میں شاہوں کی موجودگی میں کسی بھی سربراہِ مملکت کو خانہ کعبہ کے اندر جاتے دیکھتا ہوں یا تنہائی میں روضہ اقدس کی اُس جالی کی قربت میں جس میں تین سوراخ اُس کے اندر خوابیدہ ہستیوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں نوافل ادا کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اس شدید ناانصافی پر غصہ آتا ہے.. شاہ و گدا کا فرق تو ختم کر دیا گیا تھا.. تو پھر بیشتر شاہ جو مکر اور فریب اور دھوکے سے شاہ ہوتے ہیں وہ قربت میں کیوں ہیں اور گداؤں کو دھکے کیوں دیئے جا رہے ہیں.. شاہ بیشک اُس لمحے جب وہ کعبہ کے دروازے میں سے اندر داخل ہو کر دُنیا کے بت کدے میں خدا کے پہلے گھر کے اندر جھاڑو دے رہے ہوں تب وطن لوٹ کر اپنے مخالفوں کو تختہ دار پر لٹکانے کے منصوبے بنا رہے ہوں یا اپنے سوس اکاؤنٹس کا بیلنس یاد کر رہے ہوں... حاضری کے حقدار ہوتے ہیں اور گدا اپنا کشکول اُٹھائے راندۂ درگاہ ہوتے ہیں...

اگرچہ گداؤں کا کشکول چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہوں.. بھر دیا جاتا ہے.. اور شاہوں کے لبادے قربت میں بھی خالی اور بے مُراد رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود غصہ تو آتا ہے..

اس چوبی جنگل کے سامنے جو بڑا چوک ہے اُس میں کئی سو برس پیشتر شاہانِ نیپال کی تاجپوشی ہوا کرتی تھی.. اُن کے سر پر ایک بڑی کلغی والا تاج رکھا جاتا تھا.. یہ رسم اب بھی چلی آتی ہے۔ ذرا آگے تل چوک میں ایک بلند مینار نما کھمبہ ایستادہ ہے اور یہاں جو مذہبی جشن ہوتے ہیں اور وہ نہایت کثرت سے ہوتے ہیں' اُن کے دوران دیوی تالیجو کے لئے جانوروں کی قربانی ہوتی ہے اور اُن کے خُون سے ماتھوں پر جو تلک لگائے جاتے ہیں وہ پاکیزگی اور پارسائی تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ ہیں.. یعنی شارٹ کٹ ہیں۔

اور اِسی تل چوک میں ایک اور مینار ہے.. جسے "بسنت مینار" کہا جاتا ہے...

یہ بسنت مینار کھٹمنڈو کے دربار سکوئر میں کیوں ہے لاہور کے بھاٹی دروازے کے سامنے کیوں نہیں ہے اس کی سمجھ نہیں آئی... بسنت ہم مناتے ہیں اور مینار انہوں نے کھڑا کر دیا ہے...

ایک لاہوریا ہو اور اُس کی اُنگلیوں پر اب بھی ڈور کے تیز شیشے سے کٹنے کے نامعلوم نشان ہوں.. وہ اب بھی شوربے میں اُنگلیاں ڈالنے سے جھجکتا ہو کہ کہیں تیز مرچیں "چیروں" کے اَندر جا کر اذیت نہ دیں تو یہ لاہوریا تو ہر صورت اس بسنت مینار کے سامنے ٹھہرے گا کہ یہ یہاں کیوں ہے بھاٹی دروازے کے سامنے ایستادہ کیوں نہیں...

اس مینار کو بسنت پنچھی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا...

یہ تہوار یہاں بھی بہار کی آمد پر جنوری فروری کے دنوں میں منایا جاتا ہے اور حیرت انگیز طور پر پنجاب کی طرح وادیٔ نیپال میں بھی اُنہی دنوں میں سرسوں کے کھیت زرد رُو چینی شہزادیوں کے چہروں کی طرح بسنتی ہوتے ہیں.. ایسے بسنتی کہ اُن سے ایک چولا رنگا جا سکتا ہے...

اسی تہوار کے موقع پر علم اور عرفان کی دیوی سرسوتی کی پُوجا ہوتی ہے...

یہ وہی دیوی ہے جسے چولستان میں بالآخر خشک ہو جانے والے... ویدوں کے زمانے کے دریا سرسوتی کے نام سے پکارا گیا...

جس کے کناروں پر پاروشنی رہتی تھی...

ورچن اور سومرو جس کے کناروں پر آباد تھے...

پکلی جس کی مٹی سے برتن بناتی تھی اور اُن پر ایسے ایسے گُل بُوٹے الیکتی تھی کہ جب تین ہزار برس بعد قلعہ ڈیراور کی رات میں کیپٹن مردان علی ریت کُریدتے ہوئے ایک ٹھیکری دریافت کرتا ہے اور اُسے الاؤ کی روشنی میں دیکھتا ہے تو کہتا ہے.. یہ کس کے ہاتھ تھے جنھوں نے یہ گُل بوٹے اُلیکے تھے...

وہ "بہاؤ" کے تھم جانے سے آگاہ تھا اور "راکھ" کو اپنے چہرے سے پونچھتا تھا...

تو یہ وہی سرسوتی تھی جو چولستان کے صحراؤں میں بہتی تھی اور اب ایک دیوی کی صورت نیپال میں ٹھہراؤ میں تھی...

جو طالب علم کسی امتحان کی تیاری میں ہوتے ہیں اور کامیابی کے متمنی ہوتے ہیں تو وہ سرسوتی کی پرستش کے لئے آتے ہیں... پوجا کرتے ہیں اور بھینٹ چڑھاتے ہیں۔
اور بسنت کے تہوار پر ہزاروں پجاری سرسوتی کے مندر میں سربسجود ہوتے ہیں

اور پھر شاہ نیپال بہار کے گیت گاتی ناریوں کے جلو میں اس میلے کا افتتاح کرتے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ یہ معصوم نیپالی لوگ نہیں جانتے۔ ہرگز آگاہ نہیں ہیں کہ بہار کی آمد کا یہ تہوار صرف پاکستان کے شہر لاہور میں منایا جاتا ہے... اہلِ لاہور اگرچہ سرسوتی کے پجاری نہیں لیکن بہار کے پجاری ہیں.. اور تب اس تخت لاہور کے جھروکے اور در دیوار اور راتیں فلڈ لائٹس سے منور ہوتی ہیں' بجلی کے چاند آسمان کو روشن کرتے ہیں اور اہلِ لاہور اس مکر چاندنی کے آسمان پر اُڑتی ہر پتنگ کی اُڑان میں ایک سرسوتی دیوی دیکھتے ہیں۔

ہر سُدھ گُڈے کو فضا میں اُٹھتے دیکھ کر اُسے لارڈ شیوا سے زیادہ متبرک جانتے ہیں۔ ہر "چھترے" کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ اُنہیں ہنومان جی سے کہیں بڑھ کر پوتّر دکھائی دیتا ہے...

اور وہ "کُپ" جو کندھے مارتا تخت لاہور کی فصیلوں کی قید سے آزاد ہو کر ناک کی سیدھ میں فلک کو جاتا ہے.. ایک ایسے بدھ کی طرح دکھائی دیتا ہے جو اپنے شاہی محل کی قید میں سے نکل کر آسمانی جنگلوں کا رُخ کرتا ہے۔

لاہور کے آسمان پر بسنت کے دِن دیوی دیوتاؤں کی بھرمار ہوتی ہے.. اور...

اور اُن کے پجاری اُن کی ڈور تھامے انہیں اپنی نظروں کے مندروں میں سجائے اُن کی پُوجا کرتے ہیں اور زخمی اُنگلیوں کا بلیدان کرتے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ دیوی دیوتا لاہوری آسمان پر اُڑان کرتے ہیں بلکہ جب وہ کٹ جاتے ہیں... عرف عام میں "بو" ہو جاتے ہیں تو اہلِ لاہور اُن کے پیچھے گلیوں بازاروں منڈیروں اور سڑکوں پر پاگل پجاریوں کی طرح اُن کے حصول کے لئے جان داؤ پر لگا دیتے ہیں کہ کہیں ان کے پوتّر بدن زمین سے نہ چھو جائیں' وہ اُنہیں فضا میں ہی دبوچ لیتے ہیں زمین پر گرنے نہیں دیتے...

ایسے مومن پجاری بھلا دیوی دیوتاؤں کے نصیب میں کب آئے ہوں گے...

اِک دِن رہیں بسنت میں
اِک دِن جئیں بہار میں
اِک دِن پھریں بے انت میں

اِک دِن چلیں خمار میں

دو دِن رُکیں گرہست میں

اِک دِن کسی دیار میں...

اِک دِن رہیں بسنت میں...

یہ ایک مہادیو منیر نیازی کہتا ہے۔

حیاتی کے کسی ایک دِن بسنت میں رہنا...

کسی اِک دِن بہار میں جینا...

کسی بے انت میں ایک دِن پھرنا...

اور کسی ایک روز خمار میں چلنا...

بس یہی زندگی کا انت ہے...

بسنت پور مینار کے آس پاس نیپال کے آسمان پر ایک دھوکا باز شام اُترتی تھی' کوئی فلڈ لائٹس کی مکر چاندنی نہ تھی اور نہ کوئی پتنگ اس چاندنی میں رَاستے بناتی تھی تو کیسی بسنت تھی... یہ کیسا بسنت بخار تھا؟

اِسی دربار چوک میں حواس کو مرعوب کرنے والا شاندار مندر "ماجو دیول" ہے جس کی سیڑھیاں شہر روم کی رومن سیڑھیوں کی طرح آسمان کو اُٹھتی چلی جاتی ہیں۔ کسی رِدی لکشمی نے اِسے 1690ء میں شیوا کی پرستش کے لئے تعمیر کیا تھا... پَرکاش کا کہنا تھا کہ اگر ہم اس کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر جائیں تو وہاں وادیٔ کھٹمنڈو کا ایسا فضائی منظر ہو گا جو کسی اور مقام سے دکھائی نہیں دیتا... ہم نے اُن سینکڑوں سیڑھیوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا' نیپالی بھائی ہمیں تمہارے بیان پر پُورا یقین ہے' اگر شک ہوتا تو ضرور اوپر جا کر دیکھتے...

ماجو دیول مندر کو عرف عام میں "ہپی ٹمپل" کہا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا... اور وہ زمانہ میری آوارہ' آوارہ گردیوں کے زمانوں کی قربت میں تھا... جب حشیش ایک دیوی تھی جس کی ایک دُنیا پجاری تھی... اس کے ہرے بھرے اوپن ایئر معبد ایران' افغانستان اور پاکستان میں بکثرت تھے جہاں ملنگ بابوں کی صدیوں سے یہ ایک روحانی خوراک تھی اور درگاہوں اور خانقاہوں میں اس کا دھواں اگربتیوں اور موم بتیوں کے دھویں سے مل کر اُنہیں وہاں لے جاتا تھا جہاں سے اُن کو اپنی خبر بھی نہیں آتی

تھی... ہم مشرقیوں کو تو صدیوں سے اس کی خبر تھی لیکن اُس ایک زمانے میں یہ خبر یورپی اور امریکی ہپیوں تک بھی پہنچ گئی... کہ یہ وہی حشیش ہے جو حسن بن صباح کی جنت میں لے جاتی ہے...

ہپی کلچر اور فلاور کلچر اپنے عروج پر تھا...

اور حشیش کی دیوی بلند ترین سنگھاسن پر براجمان دُھواں دیتی تھی...

میں اُن زمانوں میں زمینی راستے سے یورپ کی جانب سفر کرتا تھا تو یُوں لگتا تھا جیسے میں کسی وَن وے سٹریٹ میں ٹریفک کی خلاف ورزی کر رہا ہوں کہ میں واحد مسافر ہوتا تھا جو اُس سمت میں سفر کرتا تھا اور بقیہ کل خدائی یورپ اور امریکہ سے اپنی پھٹی ہوئی جینوں اور نیکروں میں بے ترتیب داڑھیوں اور ڈھیلی چولیوں میں' بے خواب آنکھوں میں ہرے کرشنا ہرے راما الاپتی ہوئی میرے پاس سے گذرتی جاتی تھی اور اُن سب کی منزل نیپال ہوتی تھی۔ میں ایک تنہا مسافر اُن کے دیاروں کی جانب اور اُن کا جم غفیر سُنہری گھاس کی تلاش میں حشیش اور ہپی کیپیٹل آف دی ورلڈ' کھٹمنڈو کی جانب... جیسے قدیم زمانوں میں تمام شاہراہیں روم کو جاتی تھیں ایسے اُس مایوس اور نامراد عہد کے باشندوں کے سارے راستے کھٹمنڈو کو جاتے تھے...

اُنہی زمانوں میں دربار چوک کا ماجو دیول مندر ہپی مرد و زن کے لئے مخصوص ہوا... اور "ہپی ٹمپل" کہلایا... ارزاں چرس کے سُوٹے لگا کر وہ نروان کی منزلیں طے کرتے تھے لیکن وہ جلدی کے کام کو شیطان کا کام سمجھتے تھے اس لئے ایک سگرٹ کے بعد صرف ایک سیڑھی طے کرتے تھے... اور بالآخر جب وہ اس مندر کی آخری سیڑھی پر پہنچتے تھے اور کھٹمنڈو وادی کے فضائی منظر پر ایک نظر کرتے تھے تو اُسی لمحے لڑھکتے ہوئے نیچے دربار سکوئر میں لینڈ کر جاتے تھے اور آخری سیڑھی پر اوندھے ہونے کے بعد ہرے کرشنا ہرے راما کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پھر سیڑھیاں طے کرتے گرتے پڑتے اوپر اٹھتے تھے... نروان کی منزلیں کتنی کٹھن ہوتی ہیں۔ اُن کی راتیں دربار چوک' سستے ہوٹلوں اور فٹ پاتھوں پر گزرتی تھیں اور وہ وہاں زیادہ جگہ نہیں گھیرتے تھے۔ ایک شخص کی جگہ پر دو بدن بسیرا کرتے تھے کیونکہ شنید ہے کہ چرس کے نشے میں اِنسان جس کام پر جُت جائے بس جُتا ہی رہتا ہے تاآنکہ پولیس دخل اندازی نہ کرے...

لیکن کھٹمنڈو میں کون دیکھتا تھا کہ کون کس کام میں جتا ہوا ہے کیونکہ اُن کے دیوی دیوتاؤں کا بھی تو یہی مشغلہ تھا.. وہ بھی جُتے رہتے تھے...

لیکن دم مارنے کا وہ عہد گذر چکا تھا...

آج کے عہد میں جو نشے اور نروان رائج تھے اُن کے مقابلے میں ہپی بہت معصوم لوگ تھے۔ "ہپی ٹمپل" کے برابر میں ایک منقش اور سُنہری چبوترے پر موم بتیوں اور دِیوں کی جھلمل میں ایک صحن میں دو بہت بڑے اور نہ سمجھ میں آنے والی وسعت اور پھیلاؤ کے ڈھول یا ڈرم رکھے ہوئے تھے...

میں نے بچپن میں ایک فلم "چندر لیکھا" دیکھی تھی جس کے اختتام پر ایک رقاصہ بڑے بڑے ڈھولوں پر ناچتی تھی.. یہ اُن کی نسبت بہت بڑے تھے...

یہ وہ جہازی سائز کے طبلے تھے جنہیں کوئی استاد شوکت حسین یا ذاکر حسین نہیں بجا سکتا تھا البتہ ان پر کنول آسن میں بیٹھ کر دھونی رما سکتا تھا.. یا پھر پنگ پانگ کی گیم کھیل سکتا تھا.. ڈھولوں کا محافظ ایک پجاری یہ قیاس کرتے ہوئے کہ کوئی اُسے نہ دیکھتا تھا بار بار اپنی دھوتی کے اَندر ہاتھ ڈال کر بدن سے چپکے ہوئے اور لٹکتے ہوئے حصّوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا تھا...

اِن دو عظیم الشان ڈھولوں کو سال میں صرف ایک بار نہایت مشکل اور دشوار تلفظ والے دیوتا' دیگوتالادیجو' کے اعزاز میں پیٹا جاتا تھا. اگر صرف مشکل نام والا ہی ان ڈھولوں کے پیٹے جانے کا مستحق ٹھہرتا ہے تو پھر انہیں میرے اعزاز میں سال میں متعدد بار پیٹا جانا چاہئے تھا... ان ڈھولوں کے سامنے دربار چوک میں ایک بلند مینار پر ایک فوت شدہ شاہِ نیپال پرتاپ مَلّا.. (اور اسے اب بھی مُلّا نہ پڑھا جائے) کا مجسمہ اپنے تاج پر ایک کلغی نُما اعزاز سجائے براجمان ہے.. اور اس نوعیت کی کلغی.. سفید پروں والی آج بھی شاہانِ نیپال کے سروں میں سے بلند ہوتی ہے یا ہمارے ہاں کے اصیل مُرغ یہی خصوصیت رکھتے ہیں... اور اس مینار پر وادئ کھٹمنڈو پر شاہانہ نظریں بچھائے ہوئے اس مجسّمے کی خاصیت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے پہلو میں اُن کے چار بیٹے اور دو عدد بیگمات سرنگوں بیٹھی ہیں...

یہاں بھی وہی اصول کار فرما تھا جو مغل مختصر تصاویر میں مدنظر رکھا جاتا تھا۔ یعنی.. بادشاہ وقت کا قد سب سے اُونچا ہوتا تھا پھر وزیر کبیر اور درباری سر جھکائے اُن سے قد

میں چھوٹے ہوتے تھے.. درباری اہلکار مزید مختصر ہوتے تھے اور جب عوام الناس کی باری آتی تھی تو وہ ٹھگنے بنا دیئے جاتے تھے...

آج بھی عوام الناس ٹھگنے اور بے توقیر بنائے جاتے ہیں۔

چُنانچہ شاہ کے بیٹے اور بیگمات شاہ کی نسبت قدرے مختصر اور منظر سے ذرا پرے ہٹے ہوئے تھے تاکہ شاہ کی کلغی کو حرکت کرنے میں دقت نہ ہو۔

شاہ صاحب کے مینار کے سائے میں' ایک اور عمارت ہے اور یقیناً ایک اور مندر ہے.. یہاں لوہے کی جالیوں کے اَندر ایک نہایت ڈراؤنا. سُنہری نقاب ہے.. جو ایک اور مشکل نام والے خدا کا ہے.. یعنی سوتیا بھیراب کا ہے.. اور یہ سخت شرابی قسم کا نقاب ہے...

نہایت وحشی اور ڈرا دینے والی شکل کا نقاب.. ایک چہرہ.. جو لوہے کی جالیوں کے پیچھے قید اور ہر آنے جانے والے کی جانب پھنکارتا ہے اور قہر کی نگاہیں ڈالتا ہے۔

اس کی قسمت بھی مقدس ڈھولوں کی طرح سال میں ایک مرتبہ بیدار ہوتی ہے۔

ستمبر کے مہینے میں...

اندر جاترا کے دن...

اُس روز اس کے کھلے اور ہولناک مُنہ سے مقامی بیئر کی آبشاریں اُبلتی ہیں اور یاتری ایک دوسرے کو دھکیلتے اپنے مُنہ کھولے اس سوم رَس کے چند قطروں کے لئے ترستے ہیں اور اُنہیں اپنے حلق سے اُتارتے ہوئے نروان پاتے ہیں... صرف اس لئے کہ اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ گھر لوٹتے ہوئے اُن کا سائیکل رکشا روک کر پولیس اُن کے مُنہ نہیں سُونگھے گی...

یہ شرابی آبشار کسی معجزے کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوتی بلکہ نقاب کے عقب میں پوشیدہ پجاری حضرات بیئر کی بالٹیاں بھر بھر کے سوتیا بھیراب کو سیراب کرتے ہیں۔

ہم اگرچہ شراب یعنی ام الخبائث کو صدق دل سے حرام گردانتے ہیں لیکن جتنی توصیف ہمارے ادب اور شاعری میں اس مشروب کی ہوئی ہے وہ محبوب کی بھی نہیں

ہوئی۔ نہایت پاکیزہ منش صوفی بھی یہی کہتے ہیں کہ بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر۔ اور اُمت مسلمہ کی یگانگت کے لئے بھی کسی نہ کسی ساقی کو ہی طلب کرتے ہیں۔ بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے۔ تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟ جتنے بھی استعارے ہیں وہ سب کے سب مخمور حالت میں ہیں.. شراب کو منفی کر دیا جائے تو ہمارا شعری سرمایہ.. بے شک وہ فارسی کا ہو یا اردو کا... رُوکھا' بے رنگ اور بے جان سا ہو جاتا ہے۔

میں نے ایک بار فراز سے یہی سوال کیا...

اُس نے اپنے خزاب زدہ گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا "تارڑ جو کچھ ممنوع ہے.. وہی شاعری ہے۔"

اک دِن رہیں خمار میں...

اور میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا...

میں نے سوچا اُس روز جب سوتیا بھیراب کے نقاب میں سے اس آبِ ممنوعہ کی آبشاریں اُبلتی ہیں اور پجاریوں کے سوکھے ہوئے حلق تر کرتی ہیں.. تب.. ادھر دربار چوک میں شاہ نیپال کی کلغی کے نیچے بیٹھے.. بڑے ڈھولوں کے سائے میں.. عزیز میاں قوال پارٹی کو "میں شرابی.. میں شرابی" کی وجد آفریں قوالی کرنی چاہیے۔ یا مُنّی بیگم کو ادھر ہونا چاہیے اپنی عجیب سی ناک اور ہارمونیم کے ساتھ.. کہ..... اور اگر نصرت زندہ ہوتے اور وہ اس دربار چوک میں اپنی بدھا جسامت کے ساتھ "یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے۔ یہ تری نظر کا قصور ہے.." الاپتے.. تو سوتیا بھیراب اپنا نقاب اُلٹ دیتے...

اگر ہنومان ڈھوکا دربار کے علاقے کو مندروں اور دیوتاؤں کی افراتفری اور ابتری کا مجموعہ کہتے ہیں تو اس میں جھوٹ کا شائبہ بہت کم کم ہے...

اور اس کے آخر میں سائیکل رکشوں سے اٹا ہوا.. مکی کے بھٹوں کو بھونتی ہوئی نادار نیپالی خواتین کی نیم برہنگی سے بھرا ہوا وہ چوک ہے جسے "مُردوں کو جلانے کا صحن" کہا جاتا ہے.. ماسان چوک کہا جاتا ہے۔

یہاں کتنے لاکھوں اِنسانوں کی راکھ ہو گی' جس پر ہم چلتے تھے...

اور اس راکھ کا ہر ذرّہ اپنے عقیدے پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے راکھ ہوا ہو گا۔

جیسے قبرستان میانی صاحب لاہور میں مدفون لاکھوں لوگ اس خیال میں راکھ ہوئے کہ وہ

لالۂ و گُل میں نُمایاں ہوں گے.. لیکن سب کہاں...

اور یہیں.. ماسان چوک کی گہما گہمی میں.. مکی کے بھٹوں کو بھونتی ہوئی نادار نیپالی خواتین کے نیم برہنگی سے بھرے ہوئے چوک میں وہ چپک جانے والا.. بالوں میں پھنسی چیونگم کی طرح لاچار کر دینے والا.. جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو.. اپنے آپ کو ہمارے ساتھ نتھی کر دینے والا.. پرکاش کہتا ہے "دیوی دیکھو گے؟"

"کس قسم کی دیوی؟"

"لِونگ گاڈیس... زندہ دیوی"

شام ڈھلتی تھی.. یا شاید ڈھل چکی تھی "ایک اور دیوی؟"

ہر شخص کی ایک اپنی زندہ دیوی ہوتی ہے جس کو وہ آخری سچ گردانتا ہے۔

اُس کی پرستش کرتا ہے۔

کسی کی دیوی بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کرتے ہوئے جادوئی ہندسوں میں براجمان ہوتی ہے...کوئی اپنے عقیدے پر اتنا پختہ اور سنگلاخ ہوتا ہے کہ اُس کے خیال میں جنّت کا جو دروازہ کھلے گا صرف اُس کے لئے کھُلے گا...

کوئی تصویر کی دیوی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور کوئی تحریر کی دیوی میں قید ہوتا ہے.. تو یہ دیوی کونسی ہے؟...

"اُس کا نام.. کماری ہے" پرکاش نے ڈھل چکی شام میں ہم سب کی جانب شطرنج کے ایک ایسے کھلاڑی کی مانند دیکھا جو شہہ چال چل کر ہمیں مات دینے کو تھا۔ کیا یہ سیّاح میرے دام میں پھنس چکے ہیں.. اور ہم اُس کی چرب زُبانی کے فریب میں دھیرے دھیرے پھنستے چلے جاتے تھے.. اُس کی باتوں کی دلدل میں آدھے آدھے دھنستے چلے جاتے تھے۔

"صاحب وہ لونگ گاڈیس ہے۔ یہاں تک کہ شاہ نیپال بھی اُس کے سامنے جھکتا ہے... درشن کرتا ہے"۔

سُنہری بابا اس طویل تفصیل سے تنگ آ چکے تھے چُنانچہ اُنہوں نے ایک نہایت بنیاد پرست مسلمان کی طرح اپنی سُنہری داڑھی پر ایک دھمکی آمیز جھاڑو پھیرا "اوئے مشرک... نیپالی راہبر... کہاں ہے وہ دیوی..."

"صاحب... اُس کا نام... کماری ہے"۔

"ہیں.." گرل گائیڈ ہمشیرہ فوراً چوکنّی ہو گئیں اور جب وہ چوکنّی ہوتی تھیں تو اُن کی عینک کا فریم بھی چوکنا ہو جاتا تھا "ہیں.. یہ جو کماری ہیں تو کیا مینا کماری ہیں.. ہم نے اُن کی فلم "پاکیزہ" دیکھی تھی.. اور کیا مُجرا کرتی تھیں یہ پاکیزہ مینا کماری۔"

"مینا کماری" پرکاش نے ناک چڑھا کر ہمشیرہ کی ثقافتی پس ماندگی پر ماتم کیا "میڈم یہ کوئی ایکٹرس نہیں' زندہ دیوی ہے۔"

"سوری پرکاش بھائی..." ہمشیرہ فوراً بیک آؤٹ کر گئیں۔ "تو یہ کماری کیسے کماری ہو جاتی ہے؟"

"ادھر شاکیہ قبیلے میں ایسا جنم ہوتا ہے کہ شیوا اور ہنومان جی کا زور اور آسمانی پاکیزگی اس میں داخل ہو جاتا ہے تو سب لوگ جان جاتا ہے اس بچّی میں جو بولتا ہے دیوی دیوتا بولتا ہے۔ اور پجاری لوگ بھی جان جاتا ہے۔ اُسے پہچان جاتا ہے تو پھر اُس کا امتحان لینے کے لئے بھینس اور بھینسا کا بلی کرتے ہیں.."

"بلی یا بلّی.." فاروق کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا تھا حالانکہ یہاں دیوی دیوتاؤں کا مستقبل زیرِ بحث تھا۔

"بلی..."

"یہ بلی کیا ہوتا ہے..؟" خالدہ نے چپکے سے ایک ایسی سرگوشی کی جو اعلیٰ ترین سنگھاسن پر براجمان بھگوان بھی نہ سن سکتا۔

"جانور کا سر کاٹتا ہے.. دیوتا کے لئے"

"اچھا اچھا" سُنہری بابا نے فوراً اپنی دانشمندی کا مظاہرہ کیا "یعنی ادھر یہ قربان ہوتا ہے.. قربانی ہوتا ہے.. تو پھر؟"

"تو پھر صاحب.. جو بلیدان کا بھینس اور بھینسا ہوتا ہے اُس کو کاٹتا ہے تو اُس میں سے اتنا خُون نکلتا ہے اتنا خُون نکلتا ہے کہ دریائے بھاگ متی میں اتنا پانی نہیں ہو گا اور وہ تڑپتا ہے..."

"یعنی آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ..." سُنہری بابا نے مزید دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور ہم اُن سے تنگ آ چکے تھے۔

پرکاش نے مُنہ کھول کر اُن کی جانب دیکھا "سوری سر.. آپ نے کیا کہا؟"

"آپ ذرا چپ کر جائیں ناں.." خالدہ نے ایک مدھم دوہائی دی "اتنی انٹرسٹنگ سٹوری سنا رہا ہے.. تو پھر کیا ہوتا ہے پرکاش جی؟"

"تو پھر میڈم اُس بچّی کو لاتے ہیں اور وہ اُس خُون پر چلتی ہے۔ بلیدان کے اُوپر پاؤں رکھتی ہے اور اس کے اِردگرد بھینس اور بھینسے کا گوشت تڑپتا ہے اور میڈم یہ اتنا ہوریبل سین ہوتا ہے کہ بہت بہادر آدمی بھی دیکھ نہیں سکتا.. اور اگر وہ بچّی اس خُون پر چلتے ہوئے بالکل نہ ڈرے.. اُس کی آنکھوں میں کوئی خوف نہ ہو تو پھر.. اُس کو کماری بنا دیتا ہے.. اور اب جو کماری ہے وہ اِس مندر میں رہتا ہے.."

شام ڈھل چکی تھی..

اُس میں ایسی سیاہی تھی کہ رنگوں کی شناخت نہ ہوتی تھی...

ہم ایک دوسرے کے چہرے آسانی سے پہچان نہ سکتے تھے...

دربار چوک میں کہیں کہیں جو لیمپ پوسٹ تھے اُن کی روشنی اس سیاہی میں دور تک جانے سے قاصر تھی اور ایک مغموم کیفیت میں بجھتی جاتی تھی...

اور اس گھلتی سیاہی میں ہمارے سامنے ایک مختصر اور بوسیدہ اور قدیم ساخت کا مندر تھا.. کماری بہار یا کماری گھر تھا..

شاکیہ نسل کی کنواری کماری کا گھر تھا... زندہ دیوی جو دیوتا تالیجو کا دوبارہ ظہور تھا.. تین منزلہ عمارت جس کا ماتھا نیپالی ثقافت کی دو خوبیوں سے نُمایاں ہوتا تھا.. اینٹوں کا خوشنما کام اور دیدہ زیب کڑھائی والی منقش کھڑکیاں...

شنید ہے کہ جے پرکاش مَلا نے اس مذہبی عقیدے کا آغاز کیا تھا اور آج سے دو سو برس پیشتر پہلی بار دریافت کیا تھا کہ ہر زمانے میں ایک زندہ دیوی ہوتی ہے.. اور اُسے بھگت لوگوں کے سامنے لانا چاہئے...

مندر کے باہر اُس عظیم رتھ کے سپیئر پارٹس ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اُس دن کا انتظار کر رہے تھے جب اُنہیں جوڑا جائے گا... ہماری بیل گاڑیوں ایسے لکڑی کے پہیے جو دوسری منزل تک پہنچتے تھے' شہتیر اور چوبی چھتریاں.. اور اندر جاترا کے جشن کے دن یہ رتھ تیار ہو گی... اور کماری اس پر سوار ہو کر کھٹمنڈو شہر کی گلیوں اور بازاروں میں درشن دے گی... اور سینکڑوں عقیدت مند اس رتھ کو کھینچ رہے ہوں گے اور

شاہِ نیپال اُس کے سامنے سربسجود ہو گا...

شام کی سیاہی ایسی تھی کہ ہم اس کماری گھر کے اندر جانے سے جھجکتے تھے.. ہم اپنی جھجک ظاہر تو نہ کرتے تھے لیکن ذرا سستی سے قدم اُٹھاتے تھے تاکہ کماری گھر کے دروازے میں پہلا قدم کسی اور کا ہو ہمارا نہ ہو۔

تب خالدہ نے ایک سیکسی سی سِسکی لی اور پلٹ کر کہا "تارڑ صاحب کھوپڑیاں.."

"ہائیں.." طاہرہ بی بی نے خالدہ کے کندھے پر ایک لرزتا ہوا ہاتھ رکھا "کس کی کھوپڑیاں؟"

"بھئی.. یہ.. یہ" سُنہری بابا تاریکی میں بھی ذرا زرد ہو گئے "اجنبی دیس ہے۔ یہاں پتہ نہیں کیا کیا کافر سحر اور جادو ٹونے ہیں تو.. اندر جانے کی کیا ضرورت ہے اگر ادھر کھوپڑیاں ہیں.."

"کدھر ہیں کھوپڑیاں؟" فاروق نے سینہ تان کر کہا...

"ادھر.. دروازے کی چوکھٹ کے گرد.." خالدہ نے خاموشی کی حد کو چھوتے سہم کے ساتھ ہٹ کر کہا۔

کماری کے مندر کے اُس چوکھٹ کے گرد جو ڈھل چکی شام میں تھا لکڑی کی کھوپڑیوں کے ہار تھے.. پرکاش حیرانی میں ہمیں دیکھتا تھا کہ یہ دیوی کے درشن کو جھجکتے کیوں ہیں...

"اللہ مالک ہے" گرل گائیڈ نے گویا آتش نمرود میں بے خطر کُود پڑنے کا تہیہ کر لیا اور دروازے میں داخل ہو گئیں...

ایک تاریک سُرنگ سی آئی...

پھر ایک صحن دکھائی دیا...

نیپال میں ہندو اور بدھ عقیدے آپس میں یُوں مدغم ہو چکے ہیں کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز.. ہندو دیوتا اپنے سنگھاسنوں سے ذرا کھسک کر بدھ کے لئے براجمان ہونے کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں اور مہاتما اپنے گیان دھیان میں اتنے گُم ہیں کہ اُنہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر شیوا یا ہنومان جی اُن کے عقب میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور گروپ فوٹو بنوا رہے ہیں...

"اندر جاترا" کا تہوار جب کماری رتھ میں سوار ہو کر نکلتی ہے تو یہ رقص اور خوشی کا تہوار ہوتا ہے.. آٹھ روز تک بدھ اور ہندو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ کون ہیں...

کی جاناں میں کون او بُلھیا.. کی جاناں میں کون...

اندر جاترا کے جشن کے پہلے دِن بارش کے دیوتا اِندر کی یاد میں ایک کھمبا ایستادہ کیا جاتا ہے اور اُس کے گرد نقاب پوش رقاص والہانہ رقص کرتے ہیں...

اس رقص کے انداز اور طور طریقے قدیم دیومالائی دُھند میں سے نمُودار ہوتے ہیں اور اِنسان کے ازلی خوف اور اُس خوف سے جنم لینے والے عقیدے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اور پھر اس تہوار کے تیسرے روز کماری اپنے گھر سے باہر آتی ہے۔ اُس عظیم رتھ پر سوار ہوتی ہے اور اُس کے جلو میں اُس کے ماتحت دیوی دیوتا ہوتے ہیں.. یہاں تک کہ گنیش اور بھیراب بھی اُس کے چرنوں میں بیٹھتے ہیں کہ وہ محض پتھر ہیں اور کماری زندہ ہے...

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ وہی تیسرا دِن ہے جب نیپال کے شاہوں کے اجداد نے اس سلطنت کو فتح کیا تھا.. اسی لئے وہ اپنے تشکر کا اظہار کماری کے قدموں میں سر رکھ کر کرتے ہیں۔

پھر ایک صحن دکھائی دیا...

اس چوکور صحن میں.. شام کی سیاہی میں اِردگرد جو مندر کے در و دیوار تھے وہ بھی ڈھلتی شام میں یُوں ڈھلتے تھے جیسے سیاہ سونا سانچے میں ڈھلتا ہے...

صحن میں اور تاریکی میں بمشکل دکھائی دیتے صحن میں ایک آہنی جنگلے میں مہاتما بدھ کی ایک مُورتی تھی.. اُن کی ایک زیارت تھی جو اپنے سائس کے ہمراہ کنتھکا گھوڑے پر سوار ایک شب عیش کی زندگی سے نکل گئے تھے اور پھر اُن کی فاقہ زدہ پسلیوں اور دھیان میں بندھے ہوئے ہاتھوں میں پرندوں نے گھونسلے بنائے تھے....

ایک درگاہ تھی...

بدھ کے چرنوں میں دو موم بتیاں پگھلتی تھیں... پھُول اور چاول تھے۔ چند سکے

تھے اور تلک لگانے کے لئے سُرخ رنگ تھا جو تاریکی میں خُون رنگ ہوتا تھا...

تاریکی میں فنا میں گُم ہوتا ایک صحن تھا جس کے گرد جھروکے اور کھڑکیاں جُ
ہوئی تھیں اور اُن میں ایک ناآسودگی اور خوف تھا...

ہمارے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا...

ہم اگر رسوم کی قیود میں نہ ہوتے تو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر اس خوف
کا ازالہ کرتے.. سفر آپ کو کیسے کیسے ذہنی دھچکوں سے آشنا کرتا ہے...

ایک شب آپ، جپسی کی شدت میں سانس بھی نہیں لے سکتے کہ "میں ایک
گائے کی طرح ہوں" اور دوسری شام آپ زیورخ کی جھیل کے کنارے اپنے خیمے میں
تنہا ہوتے ہیں اور آپ کے پاس اُس کیمپنگ سائٹ کا کرایہ تک نہیں ہوتا...

کبھی سٹاک ہوم کے نواح میں آپ شدید بارش کے دوران اپنے خیمے میں سر
اور بھوکے ہوتے ہیں اور پھر برگیتا اور گستاف کی سٹڈی میں گرم اور آسودہ ٹالسٹائی کی "ا
کارنینا" پڑھ رہے ہوتے ہیں اور دل پسند مشروب سے موڑھوں کو گرم کر رہے ہو
ہیں...

اور کبھی جھیل کرومبر کے پانیوں کی سیڑھیوں میں اُتر کر اُن کی نم مہک سے اسیر
ہوتے ہیں اور اگلے روز کنول جھیل کے کنارے تنہا اور پیاسے ہوتے ہیں۔

آج بھی سفر نے مجھے ایک کلچرل شاک سے آشنا کیا تھا... ایک اور دھچکا لگایا تھا...

میں آج صبح کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ میں سے سو
چاکلیٹ اور دوبئی کے چوبیس کیرٹ سونے کے زیور خریدتا تھا.. ایک مومن معاشرے م
تھا اور اب اُس صبح کی اِس ڈھل چکی شام میں ایک ایسے بت کدے میں کھڑا تھا جس
جھروکوں کے اندر ایک لونگ گاڈیس سانس لیتی تھی اور بدھ کے چرنوں میں چراغ ج
تھے...

"کماری..." پرکاش نے سرجھکا کر ایک یاتری سرگوشی میں پکارا...

اور اُس کی آواز سیاہی میں گھُلتی ہوئی اوپر تک گئی جہاں چوبی کھڑکیوں کے اند
کچھ کمرے تھے.. تنگ اور تاریک.. اور اُن میں صرف ایک لالٹین کی روشنی اُن کی تار
اور سیاہی کے سامنے عاجز آکر دم توڑتی تھی...

"کماری..." پرکاش نے پھر کہا اور ایسے کہا جیسے تسبیح کا ایک اور دانہ گراتے
ہیں۔

ہم اُس کھڑکی کی جانب تکتے تھے جس میں کماری کے درشن کا شک تاریک ہوتا
تھا۔

تاریک صحن میں بدھ کے سٹوپا کے گرد ایک آہنی جالی تھی.. اور اُس کے چرنوں
میں دو موم بتیاں اپنی ہی آگ سے گھٹتی ہوتی چلی جاتی تھیں.. دو چراغ تھے.. کیا یہاں ہمیشہ
دو چراغ جلتے ہیں...

اور تیسرا چراغ جلانے کون آئے گا...

وہاں.. ہمیشہ چار چراغ جلتے تھے اور سندھڑی اور سیہون کے شہباز قلندر کے
چرنوں میں پانچواں چراغ جلانے کے لئے وہی عقیدت مند آئے گا جو یہاں بدھ قلندر کی
درگاہ میں تیسرا چراغ جلانے کے لئے آئے گا...

لیکن ہم وہ نہ تھے جو تیسرا یا پانچواں چراغ جلاتے تھے...

ہم تو رسوم و قیود کے پابند وہ مسافر تھے جو اندھیروں میں بھٹکتے تھے اور پھر بھی
چراغ جلانے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں روشنی نہ ہو جائے... کہیں ہمارے چہرے نہ
دکھائی دے جائیں.. ہم تو شہرِ غم کے وہ باسی تھے جہاں چراغ جلتے ہی دل بجھ جاتے تھے.. ہم
میں تیسرا یا پانچواں چراغ روشن کرنے کی جرأت ہی نہ تھی...

بدھ کے مجسمے کے چرنوں میں روشن دوسرا چراغ اس اُمید میں کہ کبھی تیسرا
چراغ بھی جلے گا اپنی لَو کو تیز کرتا تھا۔ آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لَو...

"کماری..."

ایک مدت گذر گئی...

جیسے قیس نے لیلیٰ کو پکارا ہو "لیلیٰ..." اور صحرا سے کچھ جواب نہ آیا ہو۔

اس خاموشی نے ہمیں شک میں مبتلا کر دیا...

کیا کوئی زندہ دیوی ہے بھی یا نہیں؟

اس ڈھل گئی شام کے پردے کے پیچھے کوئی سچ ہے بھی یا نہیں.. ہم بے وجہ اس
کے درشن کے لئے اتنی طویل مسافتیں طے کر کے آئے ہیں۔

لیکن ہم سب کے سب چُپ تھے اور بولتے نہیں تھے...

... کہ کہیں ہمارے بولنے سے کوئی طلسم ٹوٹ نہ جائے.. ہمارے سانس سے کوئی چراغ بجھ نہ جائے...

سُنہری بابا اپنی سُنہری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے رُک چکے تھے.. ساکت ہو گئے تھے اور ذرا بُت بنے اوپر تکتے تھے۔

سندھی کڑھائی کے ایک دل فریب کُرتے میں خالدہ عرف سرگوشی خانم ایک دوہرے شیڈ کی لپ سٹک والے ہونٹوں کو بار بار اپنے دانتوں تلے دباتی تھیں اور اپنے مختصر قد میں مزید جھکتی ہوئی شام کی سیاہی میں اپنی پلکیں یُوں کھولتی تھیں جیسے ایک نیلے پھول پر براجمان ایک تتلی ہولے سے اپنے پَر کھولتی ہے...

گرل گائیڈ طاہرہ کے لب لرزش میں تھے' شاید وہ زیرِ لب کوئی تسبیح پھرول رہی تھیں کہ وہ عبادت گذاری اور نیکی کے مراحل میں ہم سب سے آگے تھیں' شاید اُنہیں اپنے ایمان کے متزلزل ہونے کا خدشہ تھا اور وہ اپنے عقیدے کے دفاع پر کمربستہ تھیں۔

فاروق جو شاید زندگی کے کسی بھی پہلو کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا سوائے زندگی کرنے کے.. اپنی مُونچھوں کو بل دیتے دیتے رُک گیا تھا اور وہ بھی خاموش تھا۔

ہنومان دھوکا کے مندروں کے اندر ایک مندر میں ڈھل چکی شام میں ہم سب گِھر چکے تھے.. قید ہو چکے تھے.. اس مندر کی آب و ہوا کُل دُنیا سے الگ تھی.. اس کے موسم میں بھید بھری تاریکی کا راج تھا جس میں سینکڑوں برسوں سے یہاں آنے والے یاتریوں اور بھگتوں کی تمنائیں اور آشائیں اب بھی سانس لیتی تھیں اور اُن سانسوں کی اجنبی جانچ تھیں جو ہمارے تھے کہ ان میں کوئی آشنا نہ تھی' عقیدت کی نابینائی نہیں تھی صرف جاننے کی تمنا تھی اور دو موم بتیوں کی روشنی تھی...

"کماری.." ایک اور سرگوشی ہوئی اور پھر پَرکاش نے اپنی زبان میں بہت مؤدب ہو کر حالِ دلِ زار بیان کیا جس میں درشن کا لفظ بار بار آتا تھا۔

"یہاں سے نکل چلیں تارڑ صاحب.." طاہرہ نے میرے کندھے کو چُھونا چاہا اور پھر نامحرم جان کر جھجک گئیں "ان لوگوں کے جادو ٹُونے ہوتے ہیں.. اور میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہی ہوں"

"آپ کو پتہ نہیں کیوں شوق ہے اس قسم کی... اس قسم کی.. جگہوں پر..." خالدہ رُک گئیں۔

پھر ایک اور خاموشی اُتری۔

"کماری.. کماری.. کماری.." پَرکاش کی تسبیح کے دانے گرتے گئے...

دوسری منزل پر جو پوشیدہ سی آماجگاہیں تھیں جن میں صرف ایک لالٹین جلتی تھی وہاں کچھ حرکت سی ہوئی۔ کچھ سائے اِدھر اُدھر ہوئے.. وہاں اور لوگ بھی تھے.. کچھ نامانوس آوازیں ہم تک آئیں اور ہمیں مزید خوفزدہ کر گئیں...

وہاں دوسری منزل پر تین کھڑکیاں تھیں جن کی درزوں میں سے لالٹین کی روشنی کی باریک کترنیں باہر آتی تھیں.. اور ہمیں واضح طور پر احساس ہوا کہ اُن کے پیچھے کوئی ہے جو نیچے لارڈ بدھا کے چرنوں میں جلتے چراغوں کی مدھم لَو میں ہمارے چہرے پہچان رہا ہے' جاننے کی کوشش میں ہے کہ درشن کو آنے والے کون ہیں.. انہیں درشن دینا جائز بھی ہے یا نہیں...

ہم دیکھتے رہے... جیسے بنی اسرائیل کوہ طور کو دیکھتے تھے...

اوپر ایک کھڑکی کُھلی۔ لالٹین کی روشنی قید میں سے نکل کر مندر کے چوکور صحن میں پھیل گئی۔ بدھ کے مجسمے کے خدوخال اور لبادے کی شکنیں نظر آنے لگیں.. ہم نظر آنے لگے اور پھر وہ روشنی یکدم واپس چلی گئی کہ اُسے کماری کے وجود نے روک لیا تھا اور وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کماری وہاں تھی...

بہت بنی ٹھنی اور پورے میک اَپ میں...

"یہی ہے.." طاہرہ نے مجھ سے پُوچھا...

"پتہ نہیں.. یہ میری پہلی کماری ہے.."

"پَرکاش.." خالدہ نیپالی بھائی کی جانب مڑیں "یہی کماری ہے؟"

لیکن پَرکاش کہاں سُنتا تھا وہ تو جُھکا چلا جاتا تھا...

اُس نے ہماری جانب نگاہ نہیں کی.. ایک دیوی کی طرح پجاریوں کے وجود سے غافل رہی اور اپنے سامنے دیکھتی رہی.. کھڑکی کے فریم میں وہ دیومالا کی ایک تصویر تھی.. اُس کے سر پر ایک جوڑا اور رُوپہلی تاج تھا جیسے ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں

الف لیلیٰ کے بادشاہ سر پر پہنتے ہیں... اُس میں جڑے پتھر لالٹین کی روشنی کو اپنے اَند
جذب کرتے تھے اور بجھتے ہوئے کوئلوں ایسی لَو دیتے تھے.. وہ زیادہ سے زیادہ دس برس کی
ہو گی...

اُس کے کھیلنے کے دِن تھے لیکن وہ دُنیا کی واحد لڑکی تھی جو "دیوی دیوی" کھیل
رہی تھی.. کماری کا پُورا ماتھا سُرخ پینٹ سے رنگا ہوا تھا اور اُس سُرخی کے درمیان میں
ایک بہت بڑا سُنہری تلک تھا...

آنکھوں میں سے سیاہ سُرمے کی دھاریاں نکل کر کانوں کی لَووں تک کھنچی چلی
جاتی تھیں....

اسی لئے اُس نے دیر لگائی تھی' وہ میک اَپ کر رہی تھی...

اگر وہ ایسا تھیٹریکل میک اَپ نہ کرتی تو کون یقین کرتا کہ وہ لونگ گاڈیس ہے...

وہ چپٹی ناک والی ایک کم سن دیوی تھی اور اُس کے گلے میں زرد پھولوں کے
ہار تھے.. ہمارے ہاں تو "دیدار" صرف پیغمبروں کے نصیب میں تھا اور یہاں دیدارِ عام تھا
اور ٹورسٹ لوگ بھی فیض یاب ہو رہے تھے...

اُس کے پوچے ہوئے پینٹ شدہ چہرے کے باوجود اُس کی آنکھوں میں ایک
گہری کشش تھی.. اُن میں کوئی نہ کوئی جادو ٹونا تھا جو اُس کی جانب دیکھنے والی آنکھ کو
مئودب کرتا تھا اور وہ آنکھ جھپکی نہ جاتی تھی...

"درشن..." پَرکاش کا سر جھکتا چلا جاتا تھا... معلوم نہیں یہ عقیدت تھی یا ایکٹنگ
تھی کہ وہ اُسے یقیناً پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا.. ویسے عقیدت اور ایکٹنگ میں بہت زیادہ
فرق بھی نہیں ہوتا... دونوں کو طاری کرنا پڑتا ہے....

ممتاز مفتی کو روحانیت کا لپکا تھا.. وہ لپک لپک کر اُس کے پاس جاتے تھے اور
اپنے شوق سے اُسے نڈھال کر دیتے تھے.. اپنی باکمال لفاظی سے اُسے بے بس کر دیتے
تھے۔ اسلام آباد کی ایک نجی محفل میں وہ اپنے خصوصی مفتیانہ انداز میں پُوچھتے ہیں اور
اس انداز میں اُن کا مُنہ ذرا ٹیڑھا ہوتا ہے اور مخاطب یہ نہیں جانتا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا
من کی موج میں آپ کو احمق بنا رہے ہیں وہ پُوچھتے ہیں "تارڑ تجھ پر ٹیلی ویژن کی شہرت
کا جادو نہیں چلا... میں آج سے دس برس پیشتر تجھ سے ناراض تھا کہ تُو لکھنے والا ہے شہرت

کے بازار میں طوائف کیوں ہو گیا ہے.. لیکن اب مُجھے معلوم ہوا ہے کہ تُو بہت چالاک
ہے.. تُو نے شہرت کی راکھ کو اپنے لبادے سے جھٹک دیا ہے اور اپنے اَندر کے لکھنے والے
کو دفن نہیں کیا۔ تو یہ بتا کہ ان دنوں تیری تحریر میں جو پانچویں سمت آئی ہے تو یہ کس کی
دین ہے؟"

"سَر میں سمت کا تعین کر کے تو نہیں لکھتا.."

"نہیں.." وہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی موجودگی میں اپنی بوڑھی اور ناتواں
اُنگلی سیدھی کر کے کہتے ہیں "نانگا پربت" اور "بہاؤ" میں تو لکھتے لکھتے کہیں اور نکل جاتا
ہے.. سیدھے راستے پر نہیں چلتا.. کسی اور راستے پر نکل جاتا ہے.. یہ تم نے کہاں سے
حاصل کیا ہے؟"

"مفتی جی.. اتنے برس ہو گئے ہیں کاغذ سیاہ کرتے ہوئے تو.. بندے کو جاچ آ جاتی
ہے' ڈھنگ آ جاتا ہے.." مُجھے کچُھ پتہ نہ تھا کہ مفتی صاحب مُجھ سے کیا کہلوانا چاہ رہے
ہیں اور یُوں بھی پچاس ساٹھ لوگ اُن کی جانب اور پھر میری جانب تکتے تھے کہ یہ کیا
معرفت کی باتیں ہو رہی ہیں...

"نہیں..." مفتی جی نے ایک نہایت گھچری عیّار مسکراہٹ میں سرہلایا اور پھر
اپنی انگلی سیدھی کر کے پروفیسر رفیق اختر کی جانب اشارہ کیا "یہ تم نے ان سے حاصل
نہیں کیا؟"

"نہیں...."

"تُو ان کو نہیں مانتا..؟" مفتی صاحب اُن دنوں پروفیسر صاحب کی تقریباً بیعت کر
چکے تھے.. گوجر خان کے پروفیسر رفیق اختر کو میں تب سے جانتا تھا جب وہ اپنے آپ کو
جوگی کہلاتے تھے اور میرے بال بچوں کے لئے وہ اب بھی جوگی انکل تھے... پروفیسر
صاحب کلین شیوڈ' گولڈ لیف سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ایک ایسے عبادت گذار شخص
تھے جنہوں نے مُجھے قرآن اور خدا کے بارے میں وہاں تک قائل کیا جہاں تک میں قائل
ہو سکتا تھا.... کسی بھی بڑے سے بڑے جید عالم دین نے میرے شکوک کو اُس طرح زائل
نہیں کیا تھا جس طرح جوگی صاحب نے منطق اور استدلال سے.. اور اُس رنگِ زُبان سے..
چاہے وہ انگریزی ہو یا پنجابی اور میری خواہش ہے کہ مُجھے اُن جیسا ایکسپریشن نصیب ہو کہ

اُن کا پیرایۂ اظہار بڑے سے بڑے ادیب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے... مجھے متاثر کیا تھا.. ا
میں آسانی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہوں... تو انہی پروفیسر صاحب کی جا
ممتاز مفتی کی اُنگلی اُٹھتی تھی اور وہ نہایت رعب سے پُوچھتے "تو ان کو نہیں مانتا؟"

"نہیں.."

"تو اِن کو پیر نہیں مانتا؟" ممتاز مفتی اپنے تئیں مجھے کارنر کر چکے تھے...

"نہیں مفتی صاحب... میں اپنا سب کچھ کسی ایک فرد کے حوالے نہیں کر سکا
میں کسی کو مُرشد نہیں مان سکتا.. میں نابینائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا.. مجھے کچھ فیصلے
کرنے ہیں چاہے وہ غلط ہوں.. چاہے میں صراطِ مستقیم سے بھٹک جاؤں.. میں اگر پاکستا
میں کسی بھی شخص کی علمیت' اظہار بیاں اور تفسیر قرآن کا معترف ہوں تو پروفیسر صاحب
ہوں.. لیکن میں اُن کو پیر نہیں مانتا.."

"یہ آپ کو پیر نہیں مانتا..." ممتاز مفتی نے فاتحانہ انداز میں پروفیسر صاحب کو ا
"اِسے آپ سے عقیدت نہیں ہے"

پروفیسر صاحب نے گولڈ لیف کا ایک سُوٹا لگایا اور کہا "یہ تو بہت احسن بات
کہ تارڑ صاحب مجھ سے عقیدت نہیں رکھتے کیونکہ.. جہاں سے عقیدت کا آغاز ہوتا
وہیں سے جہالت شروع ہو جاتی ہے.."

"درشن..." پرَکاش کا سر جھکتا چلا جاتا تھا.. معلوم نہیں یہ عقیدت تھی یا ایکٹنگ
تھی.. عقیدت اور ایکٹنگ میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا.. دونوں کو طاری کرنا پڑتا ہے.. ا
جہاں سے عقیدت کا آغاز ہوتا ہے وہیں سے جہالت اس لئے شروع ہوتی ہے کہ اُس
بعد آپ سوال نہیں پُوچھ سکتے..

لونگ گاڈیس.. کماری کھڑکی میں کھڑی تھی..
کوئی نہ کوئی کھڑکی.. کہیں نہ کہیں کھلتی تھی...
کبھی دمشق کے بازاروں میں.. کبھی ہنزہ میں.. اور کبھی لاہور کے کُوچوں میں
کوئی نہ کوئی کھڑکی دیدار کے آوارہ گرد مشتاق کے لئے ضرور کھلتی تھی..
تو ایک اور کھڑکی کُھلی تھی..
کھٹمنڈو کے ہنومان دھوکا دربار میں..

ایک ڈھل چکی شام میں..
بدھ کے چرنوں میں بھینٹ کئے گئے سفید چاولوں' تیل اور سکّوں پر اُترتی تاریکی
میں...
دو موم بتیوں پر..
ہم پانچوں پر...

اور اُس شام میں تین کھڑکیوں میں سے درمیان والی کھڑکی کُھلی تھی اور اُس میں جو شکل نظر آتی تھی وہ ایک دیوی کی تھی... جو زندہ تھی.. اور اُس کی رنگین تصویر.. سُنہری فریموں میں جڑی ہوئی کھٹمنڈو کے ہر سپُر سٹور میں.. غیر ملکی اشیاء سے ٹھسے ہوئے سٹورز میں.. ہوٹلوں اور قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں اور گھروں میں سجی تھی اور اُس کے گرد چراغ جلتے تھے' زرد پھولوں کے انبار اُسے ڈھکتے تھے اور میرے سامنے تصویر نہ تھی.. وہ خود تھی.. اپنے سُرخ سنگھار اور سیاہ سُرمے میں...

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم جھکنے والوں کے قبیلے میں سے نہیں ہیں.. اس لئے مُنہ کھولے' جھکے ہوئے پرَکاش کی موجودگی میں' مُنہ کھولے اُس نیم تاریکی میں سر اُٹھائے اُسے تکتے رہے...

اور شاید اُس نے کن اکھیوں سے ہم پر نگاہ کی.. اور ہمیں جھُکا ہوا نہ دیکھ کر اُس کے سُرخ پینٹ کئے ہوئے ماتھے پر ایک شکن اُبھری کہ یہ کونسے قبیلے کے یاتری ہیں جو مجھے دیکھ کر سجدے میں نہیں چلے گئے.. آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تکتے جاتے ہیں جیسے میں کوئی عام اِنسان ہوں.. دیوی نہیں ہوں..

ہم کیا کرتے.. ہماری ٹریننگ میں جھکنا شامل نہیں تھا..

اور اُس شام کی سیاہی میں مندر کے صحن پر.. ہم پر جھکی چوبی اور بوسیدہ کھڑکیاں بھی شکایت آمیز انداز میں ہم پر جھکتی تھیں کہ ہم کیوں نہیں جھکتے...

"کماری.." پرَکاش بار بار پکارتا تھا جیسے اُس کے بار بار پکارنے سے ہی کھڑکی کُھلی رہ سکتی ہے۔

بدھ کا سٹوپا تاریکی میں تاریک تو ہوتا تھا لیکن اُس کے قدموں میں بکھرے نارنجی سُرخ رنگ اندھیرے میں بھی ناتواں جگنوؤں کی طرح دمکتے تھے...

وہی دو موم بتیاں روشن تھیں۔

وہی دو چراغ جلتے تھے.. اس آس میں کہ کوئی تو تیسرا چراغ جلانے آئے گا..

ہم سب ایک کلچرل شاک میں سے گذر رہے تھے..

ہم جو وحدانیت کے پجاری تھے اور شرک سے توبہ توبہ کرتے تھے' ہمارے سامنے شرک ہی شرک تھا.... مجھے اکثر انٹرویوز میں پُوچھا جاتا ہے کہ سفر میں تمہیں کیا حاصل ہوا؟ کیا کھویا' کیا پایا.. کیا سیکھا؟ اور میں جواب دیتا ہوں کہ بس یہی کہ جب آپ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کا سچ ہی واحد سچ نہیں... دُنیا میں اور بھی سچ ہیں.. آپ کی سوچ ہی حرفِ آخر نہیں.. حرفِ آخر سے بہت پرے اور بھی حرف ہیں..

تو کیا یہ ایک اور سچ تھا؟

ایک اور حرف تھا.. جس سے میں آگاہ نہیں تھا۔

کھڑکی میں درشن دیتی کماری.. جو مشکل سے نظر آتی تھی.. اُس کے عقب میں جو لالٹین روشن تھی وہ اُس کے خدوخال کو نُمایاں نہیں کرتی تھی.. تو یہ دیوی.. کہیں ایک اور سچ تو نہیں.. میرے سچ سے جُدا.. اور میں اس سے آگاہ نہیں تھا..

یا شاید یہ صرف "ماحول" تھا جو مجھ پر اثر انداز ہوتا تھا..

ڈرامہ چاہے سٹیج کا ہو یا ٹیلی ویژن کا.. اُس میں "ماحول" ہی رُوح پھونکتا ہے..

ایک کردار کے چہرے پر کتنی روشنی ہے.. پس منظر میں کیسی موسیقی اُبھرتی ہے.. سٹیج کے کس حصے کو تاریک رکھا گیا ہے اور کونسا حصہ روشن ہے.... کہاں روشنی کی صرف ایک کرن ہے.. اوتھیلو جب انٹری دیتا ہے تو اُس کے لبادے کے پیچ و خم کس انداز میں اُس کے بدن سے الگ ہو کر ایک شاہانہ وقار سے اُٹھتے ہیں اور گرتے ہیں۔

پرنس آف ڈنمارک ہیملٹ جب کھوپڑی کو آنکھوں کے برابر لا کر "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی" کا مکالمہ ادا کرتا ہے تو کھوپڑی کے کس حصے کو تاریک رکھ کر اُس پر وائلنوں کی مترنم اور اداس پکار اُٹھتی ہے..

ایڈی پس اپنی سوتیلی ماں کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے تو پس منظر میں کن آوازوں کا کورس بلند ہوتا ہے۔

"مائی فیئر لیڈی" کی ہیروئن اپنے ان پڑھ کاکنی انداز میں پھول بیچ رہی ہے تو ریکس ہیری سن کس سمت سے سٹیج میں داخل ہوتا ہے۔

صرف سٹیج ڈرامے میں ہی نہیں.. محبّت کے ڈرامے میں بھی "ماحول" بہت کارگر ثابت ہوتا ہے... ہیر کا رانگلا پلنگ اور اُس کے پس منظر میں چناب کا ہریاول جنگل بیلا... سوہنی کمہارن کے ہاتھوں کے اُلیکے ہوئے گُل بُوٹے اور کچا گھڑا.. اور شاہ حسین کا الاؤ بھی تو ماحول ہیں.. شاہ گوری کے کورے بدن پر سورج کی پہلی کرن جو ایک گرم بوسے کی طرح ثبت ہوتی ہے اور اُس کی برفوں پر نیل ڈالتی ہے.. اور شاہ گوری اُس نیل کو دُھند کے لبادے میں روپوش کرتی ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے.. جانے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا.. تو یہ وہی آن ہے جو محبّت کے ڈرامے میں بھی بہت کارگر ثابت ہوتی ہے..

چُنانچہ کسی بھی یاد کو' کسی بھی فریاد کو' کسی بھی اُلفت کی کسک کو اور کسی بھی ڈرامے اور کسی بھی عقیدے کو جو دراصل ایک بڑا ڈرامہ ہوتا ہے "ماحول" بناتا ہے.... نہیں تو وہ کورا سفید ہو جائے.. اُس میں کوئی چاشنی کوئی کشش کی لذت نہ رہے۔

اُس شامِ بُت پرستاں و بُت گراں و صنم آشنا میں... انجانے کے خوف میں گھرے ہوئے.. جب ہم پانچوں اوپر دیکھتے تھے تو لونگ گاڈیس کو اُس کے "ماحول" میں دیکھتے تھے۔

وہ اگر دن کی روشنی میں ٹریفک کے شور میں پسینہ پونچھتی کسی ٹیکسی کی منتظر کسی چوک میں کھڑی ہوتی۔ کسی ریستوران میں فرنچ فرائز کھانے کے بعد اور کوک کی بوتل حلق میں اُتارنے کے بعد اُسی حلق میں سے اُبلتے ڈکار کو مُنہ پر ہاتھ رکھ کر روکتی ہوتی.. یا کسی دفتر میں سٹینو ٹائپسٹ ہوتی تو ہم اُس کی جانب ایک نظر بھی نہ دیکھتے.. نہ اُس کے سر پر قیمتی پتھروں سے مزین سُنہری تاج ہوتا اور نہ کجلے سے بھری آنکھیں' سُرخ پینٹ کیا ہوا چہرہ اور نہ گلے میں زرد پھولوں کا ہار ہوتا تو ہم ایک دس برس کی بچّی کے تیل سے چپڑے ہوئے بال اور چپٹی ناک کو کاہے کے لئے دیکھتے.. اُس سے کیوں مرعوب ہوتے..

تو ہم یہاں اُس کے مندر کی سیاہی میں ماحول کے مارے ہوئے مرعوب ہو رہے تھے...

ہم فی الحال اپنے سچ پر قائم تھے اور وہ کھڑکی میں کھڑی درشن دکھلاتی تھی اور

ہمیں شُبہے میں ڈالتی تھی کیا صرف ہمارا سچ ہی آخری سچ ہے..

اُس کی سیاہ آنکھیں کُھلی تھیں..

وہ اُنہیں جھپکتی نہ تھی.. جیسے ایک ناگن پھن پھیلائے کھڑی ہو۔

وہ اپنے جھروکے میں درشن دیتی ہوئی وہ دیوی تھی جس کے سامنے شاید اُس کی خدائی میں پہلی بار نیچے سٹوپا کے پاس جو پجاری کھڑے تھے وہ جھکتے نہ تھے اور اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے چلے جاتے تھے..

خالدہ کے خوش نظر سندھی کڑھائی والے لباس میں سے ایک مہک اُٹھتی تھی جو یقیناً کھٹمنڈو ایئرپورٹ کی ڈیوٹی فری شاپ سے خرید کردہ کسی فرنچ پرفیوم کی تھی۔ اور یہ پرفیوم گیندے کے پھولوں اور بدھ کے چرنوں میں پگھلتی موم اور باسی ہوتے سفید چاولوں اور شام کی ٹھنڈک میں گھلتی جاتی تھی..

"تارڑ صاحب یہ تو سراسر توہم پرستی ہے... یہ عام سی لڑکی ہے محلے کے فٹ پاتھ پر کیڑی کاڑا کھیلنے والی.. مجھے تو بہت ڈری ڈری اور معصوم سی لگتی ہے.. اس کے پیچھے اس کے ماں باپ یا رشتے دار کھڑے ہیں جن کے ڈر سے یہ یہاں درشن دے رہی ہے اس کا بس چلتا تو یہ اس وقت اپنی گڑیوں سے کھیل رہی ہوتی.. ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ... یہ سچ مچ دیوی ہو سکتی ہے؟" اُس نے مزید سرگوشیانہ سرگوشی میں پُوچھا۔

"پتہ نہیں..."

خالدہ نے سر اُٹھا کر حیرت سے آنکھیں متعدد بار جھپکائیں' اُس کے دانت تاریکی میں ظاہر ہوئے "یعنی یہ.. ہو بھی سکتی ہے"

"میں نے ایک عرصے سے حتمی فیصلے دینا چھوڑ دیئے ہیں.."

"سچ کے بارے میں بھی؟"

"سچ ہی کے بارے میں... کیا پتہ یہ سچ ہے یا یہ.. سچ ہے.. کیا پتہ"

گرل گائیڈ نے اس خواہ مخواہ پُراسراریت کو توڑ دیا "ویسے اگر ہم اُن سیڑھیوں سے اوپر جا کر دیوی جی سے ذرا دست پنجہ لیں اور گپ شپ لگائیں تو کیا حرج ہے.. ذرا جھانک لیں گے.."

"جھانک لیں؟" میں نے سُنہری بابا کے ساتھ مشورہ کیا۔

"سر سارا مسئلہ تو جھانک لینے سے ہوتا ہے.." وہ اپنی عادت کے برخلاف دھیمے لہجے میں کہنے لگے "اگر آپ جھانک لیں اور جو کچھ آپ کو نظر آئے وہ آپ کے عقیدے اور آپ کے سچ کے بالکل مخالف سمت میں ہو تو پھر آپ کیا کریں گے؟ مان لیں گے؟.. سر جھانکنا نہیں چاہیے۔ اپنی دُنیا میں گُم رہنا چاہیے.. میر نے بھی تو کہا تھا کہ تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا اِس لئے وہ خوار ہوئے اور کوئی پُوچھتا نہ تھا.. اس لئے جھانکنے سے گریز کرنا چاہیے"

"تو آپ تو پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے ہو کچھ شعر و شاعری کے بارے میں.." گرل گائیڈ نے ذرا غصیلے پن کا مظاہرہ کیا "میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اوپر جا کر ملاقات کر آتے ہیں ذرا ہاؤ ڈُو یُو ڈُو کہہ آتے ہیں.. کیوں پرکاش بھائی؟"

پرکاش بھائی نے جھکا ہوا سر نہیں اُٹھایا وہیں سے زمین کو گھورتے ہوئے کچھ بڑبڑائے جس کا مطلب لاحول ولا بھی ہو سکتا تھا.. "نہیں.. کماری صرف درشن کے لئے ہے"

یہ صرف "ماحول" تھا جس نے ہیملٹ اور ایڈی پس پر اثر کیا تھا.. اور کچھ نہ تھا۔

کماری نے اگرچہ صرف چند لمحے.. شاید دس بیس سیکنڈ جھروکے میں براجمان ہو کر درشن دیا تھا... لیکن ہم پر تو زمانے گزرے۔

اور پھر شاید.. وہ اُن پجاریوں سے مایوس ہو گئی جو جھکتے نہ تھے.. اُس کے مقدس بُت کدے میں کفار آ گئے تھے وہ اُس کے رُتبے اور پوترتا سے ناواقف تھے اور اپنی بخشش کا سامان نہیں چاہتے تھے.. اس لئے وہ ذرا پیچھے ہوئی' کھڑکی سے ہٹی۔

اور کھڑکی بند ہو گئی..

مندر کا صحن پھر سے تاریک ہوا اور دونوں چراغوں کی روشنی پھر سے تیز ہوئی۔

کھڑکی اگرچہ بند ہو چکی تھی مگر ہم اُسے تکتے جا رہے تھے..

اُس زندہ دیوی کے سُنہری تلک اور کجلے کی دھاروں کے شائبے اب بھی بند کواڑوں پر نقش نظر آتے تھے..

"کماری..." پرکاش یہ نہ دیکھتا تھا کہ وہ درشنی کھڑکی خالی ہو کر بند ہو چکی تھی اور پکارتا تھا "کماری.. کماری"۔

”پرندے پرواز کرتے ہیں... اور ان میں بابل کی چڑیا“

اِنسان کے اُن دماغی خلیوں میں جن میں فتور کا سودا سمایا ہوتا ہے اور جن میں آوارہ گردی کی دُھول تہ در تہ جم کر اُنہیں ابنارمل کرتی ہے.. ان خلیوں میں فریم شدہ کچھ نقش ہوتے ہیں جو بہت دُھندلے ہوتے ہیں لیکن اُن کی پہچان مشکل نہیں ہوتی.. جیسے نفسیات دان لفظ اور اُس لفظ کی ادائیگی کے بعد ذہن میں فوری طور پر اُبھرنے والی تصویر سے سامنے بیٹھے شخص کی ذات کو جان جاتے ہیں.. اگر ”ماں“ کا لفظ بولا گیا ہے تو اِدھر سے ”محبت“ یا ”چھاؤں“ کا جواب آیا ہے.. ”بادل“ کہا گیا تو فوری طور پر ”مور“ ”بارش“ ”سیلاب“ کی تصویر سامنے آتی ہے.. ایسے ہی ان خلیوں میں بھی کچھُ نقش کچھُ جواب ہوتے ہیں.. اوڈ یاد رہے کہ یہ وہ خلیے ہیں جن میں تجارت‘ بینک بیلنس اور کامیابی نہیں فتور کا سودا سمایا ہوتا ہے تو انہیں جب کسی ایک سرزمین کا نام سُنائی دیتا ہے تو وہ فوری طور پر کسی ایک تصویر سے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں..

عراق... کوئی کہتا ہے.. اور اُدھر شہر بابل کے دروازوں کی تصویر کھٹاک سے سامنے آتی ہے۔ فرانس تو آئفل ٹاور کے سوا اپنے وجود کا ثبوت نہیں دے سکتا..

برطانیہ.. بگ بین یا پکاڈلی سرکس..

اطالیہ.. روم سویٹ روم..

ہسپانیہ.. بل فائٹ.. قصرِ الحمرا...

کینیا... ماؤنٹ کلی منجاروز.. زرافے..

ہندوستان.. تاج محل.. ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق..

ایران.. آتش کدے اور... حافظ اور سعدی..

البتہ پاکستان تک پہنچتے پہنچتے سوئی اٹک جاتی ہے.. یہ کہاں ٹھہرے؟ مُوہنجو ڈارو۔ ہڑپہ.. یا دیبل.. شالیمار باغ یا درہ خیبر. گندھارا کا عہد یا دینی مدرسے.. سوئی اٹک جاتی ہے آگے نہیں جاتی... آگے جائے گی تو اُس پر فتوے صادر ہو جائیں گے.. تو اس صورت حال میں اگر کے ٹُو کو پاکستان کی تصویر مان لیا جائے تو کیا حرج ہے... کیونکہ کے ٹُو کا فی الحال کوئی مذہب نہیں ہے..

تو جب ہم نیپال تک پہنچتے ہیں تو ہمارے دماغ کے خلیے کس ایک تصویر کو اُس کی شناخت کے طور پر سامنے لاتے ہیں؟ یقیناً.. ایورسٹ.. اس فانی دُنیا کا بلند ترین مقام.. ایورسٹ..

میں قطعی طور پر نیپال کو نہیں جانتا تھا..

سوائے اس کے.. کہ دُنیا میں بہت سے ملک ہیں جو ”لینڈ لاکڈ“ ہیں.. وہ کسی سمندر تک نہیں پہنچتے.. لیکن نیپال ”انڈیا لاکڈ“ ہے.. اُس پہاڑی سلطنت کے تمام تر دروازوں کی کنجیاں ہندوستان کی گرفت میں ہیں۔

سوائے اس کے کہ.. کہ... وہاں سے تبت اور بھوٹان کو رستے نکلتے ہیں... وہاں گورکھے ہوتے ہیں جو برطانوی راج کے ڈائی ہارڈ سپاہی تھے.. وہ جب 1947ء میں گوالمنڈی اور شاہ عالمی میں اور میرے لاہور میں گھومتے تھے تو نہ میری زُبان سے آشنا تھے ورنہ میری آریائی شکل سے.. اس لئے بے دریغ فائر کرتے تھے.. اور کلوز کوارٹرز میں اپنی ل کھاتی ککری کو آپ کے پیٹ میں بھونک کر گھما دیتے تھے۔

گورکھا پلٹن پورے برصغیر میں ایک سامراجی دہشت کی علامت تھی.. چپٹی کوں والے ٹھگنے قد کے گورے سپاہی اپنے گورکھا ہیٹوں میں.. برطانوی راج کے ستون تھے..

میں نیپال کو صرف اتنا جانتا تھا۔

یا.. ایورسٹ کو جانتا تھا.. جو دُنیا کی بلند ترین چوٹی تھی.. اور اُس کے سائے میں رباز رہتے تھے جو انگریز کوہ نوردوں کے ہمراہ پورٹرز کے طور پر سنو لیک تک آئے تھے

اور برفانی اِنسان "یے ٹی" سے خوفزدہ ہوئے تھے..

شاید اب بھی میری فائلوں میں اور کاغذوں کے انبار میں.. کہیں ایک بھورے ہوتے کاغذ والے.. "پاکستان ٹائمز" کی ایک ایسی کلپنگ موجود ہو گی جس میں کوئی شخص عجیب و غریب خلائی مخلوق والے لباس میں.. اُس کے منہ سے ایک ربڑ کی سونڈھ نکلتی تھی اور اُس کی پشت سے بندھے آکسیجن سلنڈرز تک جاتی تھی... برف کے ایک تودے پر کھڑا ہے اور اُس کی سفیدی میں ایک آئس ایکس گاڑھے دوسرے ہاتھ کو فضا میں بلند کئے ہوئے ہے۔ اور اُس ہاتھ میں کچھ پرچم ہیں اور اس بھوری تصویر کے نیچے اب بھی درج ہو گا "شرپا تن زنگ.. اِنسانی تاریخ میں پہلا شخص جو دُنیا کے بلند ترین مقام پر پہنچا۔"

اُس کے پیچھے ایڈمنڈ ہلیری تھا جو یہ تصویر اُتارتا تھا۔ نیوزی لینڈ کا کوہ پیما ہلیری! اس برطانوی مہم کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی چہیتی ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کے موقع پر اُسے دُنیا کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے کی خوش خبری سُنائیں۔

اور یہاں گھپلا یہ ہو گیا کہ ایورسٹ پر پہلا قدم شرپا تن زنگ کا پڑا... جیسے نیل آرمسٹرانگ کا پہلا قدم.. اگرچہ اُس نے اسے اِنسانیت کا بڑا قدم قرار دیا... چاند پر پڑا.. اور ایڈمنڈ ہلیری نے اس تاریخی وقوعہ کی تصویر اُتاری۔

ہلیری کی کوئی ایک تصویر تاریخ کے اوراق پر ثبت نہیں ہے.. جس میں اُس کا ایورسٹ پر پہلے پہنچنے کا ثبوت ہو..

تو یہیں پر حالات دگرگوں ہو گئے..

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ایشیائی چپٹی ناک والا ایک سفید فام سے پہلے دُنیا کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ جائے۔

یہ نہیں ہو سکتا تھا..

اور جب یارانِ نکتہ داں نے بس یہی نکتہ اُٹھایا کہ.. وہ رُتبۂ بلند کسے ملا؟.. وہ کون تھا جس کے قدم ایورسٹ کی صدیوں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں کی کنواری برفوں پر پہلے پڑے تو.. ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایڈمنڈ ہلیری نے اور شرپا تن زنگ نے جو محض ایک پورٹر تھا اور وہی کہتا تھا جو اُس کے ماسٹرز کہتے تھے کہ یہ کہو.. تو اُن دونوں نے کہا۔ ہم ایک ہی رسے سے بندھے آگے پیچھے بلند ہوتے تھے.. تو اس سے

کیا فرق پڑتا تھا کہ آگے کون ہے اور پیچھے کون ہے اور پہلا قدم کس کا تھا..

اور اس کے باوجود نائٹ ہڈ یعنی "سر" کا خطاب.. جو سید احمد خان کے لئے بھی باعث افتخار تھا اور علامہ اقبال کے لئے بھی صرف گورے ایڈمنڈ ہلیری کے حصے میں آیا۔ اگرچہ شرپا تن زنگ پر بے شمار اعزاز نچھاور کئے گئے لیکن وہ کبھی بھی.. سَر تن زنگ نہ کہلا سکے اور نہ اُس کی کسی شرپا گاؤں میں ان پڑھ اور چپٹی ناک والی بیوی لیڈی تن زنگ کہلا سکی.. اس لئے کہ گورے اور کالے میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے...

صرف ہلیری نے احتجاج کیا کہ مجھے اور ٹیم کے لیڈر کو... ہنٹ کو جو آخری کیمپ میں صرف دوربین آنکھوں سے لگائے ایورسٹ کی چوٹی کو تکتا رہا نائٹ ہڈ سے نوازا گیا ہے تو میرے ساتھی شرپا تن زنگ کا کیا قصور ہے.. اس لئے کہ ہلیری انگریز نہ تھا' نیوزی لینڈ کا باشندہ تھا اور برطانوی سامراج کے تعصب سے آزاد ہو چکا تھا اور اس لئے بھی کہ وہ ایک شاندار کوہ پیما تھا اور ایک کوہ پیما کا کوئی ملک نہیں ہوتا اور کوئی مذہب نہیں ہوتا.. سوائے پہاڑوں کے... پہاڑ اُن کے معبد ہوتے ہیں جن کی پرستش اور زیارت کے لئے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں... اُن کے داتا صاحب' نظام الدین اولیاء۔ سینٹ فرانسس۔ امام رضا۔ گورو گوبند سنگھ۔ دیوارِ گریہ اور کپل وستو... ایورسٹ۔ کے ٹو۔ اناپورنا۔ نانگا پربت۔ راکاپوشی۔ ماؤنٹ بلانک اور ماؤنٹ کلی منجاروز ہوتے ہیں اور یہ واحد مذہب ہے جس میں فرقے اور فتوے نہیں ہوتے۔

آج وہی ایڈمنڈ ہلیری بوڑھا اور بے بس ہو چکا ہے..

اُس کا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کی کوشش میں اُس سے بچھڑ چکا ہے۔

اور اُس کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سَر ایڈمنڈ آپ کی عُمر اور پھیپھڑے اب اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ آپ بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے ایک فٹ بھی اوپر جائیں' ایک اور قدم اُٹھائیں.. اور وہ بوڑھا کوہ پیما بارہ ہزار فٹ کی اُس سرحد پر کھڑا ہو کر اکثر اُنتیس ہزار فٹ بلند اُس چوٹی کو حسرت سے تکتا ہے جس پر وہ صدیوں پہلے پہنچا تھا۔ وہ پہنچا تھا یا تن زنگ.. اس سے کیا فرق پڑتا تھا..

تن زنگ اب مر چکا ہے۔

ایورسٹ سینکڑوں برسوں سے ایک خواب تھی.. دُنیا کا بلند ترین معبد تھی ا
برف کی اس دیوی کے چرنوں تک پہنچنے کا اِنسان تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اگرچہ اپنی شاہ گوری.. کے ٹو کا احرامِ برف اُس سے کہیں شاندار پُرشکوہ تھا لیکن
وہ حساب کتاب میں مار کھا جاتا تھا.. اور اُسے دوسری پوزیشن پر قناعت کرنی پڑتی تھی..

حساب کتاب میں ہر جینئس مار کھا جاتا ہے..

لیکن اب.. ان دنوں.. ایورسٹ نہ خواب ہے اور نہ کوئی برف کی دیوی..
صرف ایک طوائف ہے۔ جیسے پسندیدہ ٹورسٹک جھیلیں رکھیل ہو جاتی ہیں کہ ہر وہ شخص
جس کے پاس ایک پجیرو.. کچھ بلیک لیبل وہسکی، بہت ساری بلیک منی اور کوئی دل پذیر
خاتون ہوتی ہے وہ ان تینوں کے ہمراہ بڑی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاتا ہے..

تو ایورسٹ ان دنوں.. فار سیل ہو چکی ہے..

دُنیا بھر میں یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ آپ ہماری ایڈونچر ٹریول ایجنسی سے رابطہ
کریں، ہم چند ہزار ڈالرز کے عوض آپ کو دُنیا کی بلند ترین چوٹی پر لے جائیں گے۔ آپ
بے شک بوڑھے اور محتاج ہوں، بے شک کچن میں عمر گزارنے والی ایک ہاؤس وائف
ہوں جیسا کہ ایک جاپانی خاتون تھی جو ایورسٹ تک پہنچائی گئی... آپ فیس ادا کریں
ہمارے تجربہ کار گائیڈ اور کوہ پیما آپ کا ہاتھ پکڑ کر یا گود میں اُٹھا کر وہاں لے جائیں گے
جہاں پہلی بار ہلیری اور تن زنگ پہنچے تھے۔

لیکن ایورسٹ کے بیوپاریوں سے ایک غلطی ہو جاتی ہے۔

وہ بھول جاتے ہیں کہ پہاڑ اپنی خصلت نہیں بدلتے.. نہیں بدل سکتے.. بے شک
ایورسٹ کی طرح آپ اُن کے قدموں تک ایئرپورٹ اور سڑکیں لے جائیں، ہوٹل تعمیر
کر لیں اور وہاں برگر اور کوکا کولا سپلائی کر دیں.. گنّے کی شراب پیش کر دیں.. وہ اپنی
خصلت نہیں بدلتے وہی رہتے ہیں جیسا اُنہیں رب نے بنایا ہوتا ہے..

وہ اپنا ردِعمل ظاہر کرتے رہتے ہیں..

ابھی پچھلے دنوں ایورسٹ کو خریدنے والے درجنوں "کوہ پیما" اور اُن کے گائیڈ
ایک ایسے برفانی طوفان کی اور ہواؤں کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے جو اُن کے طے شدہ
شیڈول میں شامل نہ تھا..

کہا جاتا ہے کہ ایورسٹ دُنیا کی بلند ترین چوٹی ہے..
کے ٹو مشکل ترین چوٹی ہے..
نانگا پربت سب سے خطرناک پہاڑ ہے جو اِنسانی خُون کو پسند کرتا ہے..
اناپورنا اور راکاپوشی سب سے خوبصورت ہیں..
شاید اسی لئے کے ٹو کو سر کرنے والے چند درجن لوگ ہوں گے.. جب کہ
ایورسٹ پر قدم رکھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے..

دُنیا بھر کے آشفتہ سروں اور کوہ نوردوں کے لئے نیپال صرف ایورسٹ تھا..

میرے لئے بھی تھا.. صرف اُس میں گورکھا پلٹن کا خوف بھی شامل تھا.. کیونکہ
میں نے آزادی کے سُنہری دنوں میں اُن کی تیز خم دار کھکریوں کو اپنی شہ رگ کے قریب
ہوتے محسوس کیا تھا.. لیکن میں نیپال جا کیوں رہا تھا؟

تیئیس برس کے "بن باس" کے بعد اپنے ملک کے جنگل سے کیوں نکل رہا تھا۔
اگر پاکستان سے باہر قدم رکھنا تھا تو نیپال میں ہی جا کیوں رکھنا تھا.. اگر میں نے یورپ میں
منعقدہ سیمینارز میں شرکت کے لئے صرف اس لئے معذرت کر لی تھی کہ یہ اُن دنوں
میں آتے تھے جب... میں جسمانی طور پر نہ سہی ذہنی طور پر کمربستہ ہو چکا ہوتا تھا... شمال
کے لئے.. وہ اُن دنوں میں آتے تھے جب پاکستانی شمال میں برفیں پگھلنے لگتی ہیں، چشمے
رواں دواں ہوتے ہیں اور فیری میڈو کا جنگل اپنے برف لبادے کو پگھلا کر اپنے روپوش
گُل بوٹے ظاہر کرتا ہے.. اس جنگل کے سالخوردہ درختوں تلے ایک پہلا پھول برف میں
سے ایک خوابیدہ حیرت کے جاگنے کا جادو اپنی پنکھڑیوں پر لئے سفید مکھن کی طرح چھب
دکھلاتا ہے اور پھر بے حساب اور بے انت پھول اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ اُسے امام مان
کر ظاہر ہوتے ہیں... یہ وہی دن ہوتے ہیں جب وادیٔ سوخترآباد پر بلند کوہ پامیر کی
آبشاروں کی پھوار جنم لیتی ہے اور اُن کے کناروں پر گھاس اُگتی ہے اور زرد، سفید سنو
لیپرڈز.. سنو سے تنگ آئے ہوئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیچے کینجابائی ایسے شکاری اپنی
رُوسی بندوقوں کی نالیوں کا زنگ صاف کرتے ہیں اس پھوار بھری گھاس پر لوٹنیاں لگانے
کے لئے نیچے آ جاتے ہیں... ٹرانگو ٹاورز اور نیم لیس ٹاور کے نیچے ایسے گُل کھلتے ہیں
جنہیں صرف وہ دیکھتے ہیں جو اُن کے قدموں تک پہنچتے ہیں.. اردوکس کی گھاس پتھروں

کے سینے میں سے نکلتی ہے...

پائیو کے درخت سرسبز ہونے لگتے ہیں..

ٹاپ میدان میں.. نانگاپربت کے رُوپہلی چہرے کے سائے میں.. گھوڑے سردیو
کے فاقوں سے تنگ آئے ہوئے ہوا میں بدلتے موسم کی مہک نتھنوں میں اُتارتے ہیں ا
ہنہناتے ہیں..

سنو لیک پر سے دُھند اُٹھتی ہے اور وہاں خواہشوں کی کشتیوں کے بادبان کھُ
جاتے ہیں...

تو پھر ان موسموں میں ایک آوارہ گرد.. کیسے یورپ چلا جائے اور ایک فائیو سٹا
ہوٹل کی آسائش میں قید ہو کر بے جواز اور بے وجہ تقریریں سنے..

بس اسی لئے میں ان سیمینارز میں شرکت کرنے سے معذرت کر لیتا تھا.. کہ می
شمال کے لئے کمربستہ ہو چکا ہوتا تھا..

تو اگر میں مے خانۂ شمال کا اتنا رسیا تھا تو اب نیپال کیوں جا رہا تھا؟

صرف اس لئے کہ جن دنوں مجھے وہاں ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت
دعوت موصول ہوئی یہ وہ دِن تھے کہ اسکولے' فیری میڈو اور سنو لیک کے انگور ابھی
تھے' زرد اور رس بھرے نہ ہوئے تھے.. اور ابھی کچھ وقت تھا کہ اُنہیں اُتارا جاتا ا
اُن سے وہ شراب کشید کی جاتی جو شمال کے مے خانے میں مستی بکھیرتی تھی۔

یہ مارچ کا مہینہ تھا..

اگرچہ ایلیٹ اپریل کو.. سال کے سب مہینوں میں سے ظالم ترین گردانتا ہے
لیکن میرے لئے یہ مارچ تھا.. کہ میں اس مہینے کی پہلی تاریخ کو پیدا ہوا تھا..

پیدائش سے زیادہ ظالم اور کونسا وقوعہ ہو سکتا ہے..

اور جب اِنسان یکدم اُنسٹھ برس پورے کر کے ساٹھویں کی دہلیز پر آ کھڑا ہو
اس سے بڑی ٹریجڈی اور کیا ہو سکتی ہے..

میرے ساتھ ایک عجب سانحہ ہو گیا ہے..

تحریروں' حسیات اور بدن کی کیفیتوں کے حوالے سے اگر پرکھ کی جائے تو زندگی
کی ایک سٹیج درمیان میں سے یکسر غائب ہو گئی ہے.. لوگ جوان ہوتے ہیں.. مڈل ایج تک

پہنچتے ہیں اور پھر بوڑھے ہو جاتے ہیں..

میرے ساتھ جو عجب سانحہ ہوا ہے وہ یوں ہوا ہے کہ مجھ میں ایک عرصے تک..
اور میری تحریروں میں.. ایک مدت تک جوانی کی نوخیزی اور بخار تھا.. نکلے تری تلاش میں
تھا.. پیار کا پہلا شہر تھا.. جپسی تھی.. اگرچہ ان دنوں میں ایک فاختہ اور ایک پکھیرو بھی تھا
لیکن میری تحریروں پر اُداسی کی ایک دُھند چھائی ہوتی تھی.... میں اُندلس میں اجنبی تھا۔
خانہ بدوش تھا.. اور پھر کوئی غارت گر ہوش آیا..

آیا مری محفل میں وہ غارت گر ہوش آیا..

بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا..

تو ناحق مجھے ہوش آیا..

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں جوانی کی نوخیزی اور تحریر کے رومان پرور بخار سے
یکدم.. ایک سنڈریلا کی طرح جو اپنے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ رقص کرتی ہوئی
رات کے بارہ بجنے پر اپنے جھونپڑے میں پہنچ کر ایک عام سی لڑکی ہو جاتی ہے.. میں بھی
عام سا ہو گیا.. گمشدہ کڑی.. مڈل ایج تھی.. جو مجھ پر نہیں گذری.... میں بزرگ اور بوڑھا
ہو گیا اور وقت کے بہاؤ پر راکھ تک پہنچ گیا....

میری ریل گاڑی.. جوانی کی نوخیزی کے سٹیشن پر بہت دیر ٹھہری' سگنل ڈاؤن
نہیں ہوا تھا اور جب چلی تو فراٹے بھرتی ہوئی.. بیچ کے بے شمار سٹیشن چھوڑ گئی اور
ساٹھویں برس کی دہلیز کے سٹیشن پر آ رکی۔

تو یہ مارچ کا مہینہ تھا۔

سال کا ظالم ترین مہینہ....

ابھی شمال کے مے خانۂ فطرت کے دروازوں کے آگے ڈھیروں برف تھی اور وہ
کھل نہ سکتے تھے۔

صرف اس لئے میں نیپال جا رہا تھا۔

پی آئی اے کی ایئر بس کراچی سے کھٹمنڈو جا رہی تھی..
مجھے وادیٔ کھٹمنڈو سے کوئی الفت نہ تھی..

لیکن یہ وہ پڑاؤ تھا.. وہ کاروان سرائے تھی جس میں شب بسر کرنے والے قافلے جب آگے چلتے تھے تو وہاں اُن کے سامنے.. کہیں بہت آگے.. اناپورنا تھی.. ایورسٹ تھی.. دُنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے انبار تھے..

پاکستان کے سوا یہ دُنیا کا واحد ملک تھا جہاں پہاڑوں کے خداؤں کے تخت بچھے تھے..

اور مجھ میں.. یکم مارچ کو 59 برس کے بوڑھے ہونے کے باوجود وہ ہوس قائم و دائم تھی جو کسی بیس برس کے بخار زدہ جنس کی نم آلودگی سے بھرے ہوئے نوجوان میں بھی کیا ہو گی.. اگرچہ میں نے اپنے بین الاقوامی میزبانوں کے مزاج کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا نیلا رُک سیک اُٹھانے سے صرف اس لئے اجتناب کیا تھا کہ کہیں اُس کی بوسیدگی.. جس میں شاہ گوری کی اُلفت اور دیوسائی کی بلندی اور سنولیک کے بادبان رچے بسے تھے اُن کے مزاج پر گراں نہ گذرے.. میں نے اپنے جدید اور نویں نکور.. کسی ہسپانوی فرم کے تخلیق کردہ نہایت قابل احترام نیلے سوٹ کیس کو پیک کرتے ہوئے کانفرنس میں شرکت کے لئے انتہائی معزز سوٹوں اور سلک کی ٹائیوں اور کُول واٹرز کے کولون.. اور پیئر کارڈن کی شرٹوں کے نیچے اپنی آرزوؤں کو پوشیدہ کیا۔

جیسے گاؤں کا میراثی یکدم قریشی ہو جاتا ہے اور اپنے پس منظر کو پوشیدہ کر لیتا ہے۔

جیسے ترکھان اور کمہار.. تاج محل کے معمار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مغل اور مرزا ہو جاتے ہیں..

اگرچہ اُن کے دعوؤں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا.. یہ سب کے سب.. میراثی' ترکھان یا کمہار صرف پیشے تھے ذات نہیں تھے..

بہرطور یہی پوشیدگی میرے ہسپانوی سوٹ کیس کی تہوں میں تھی..

جہاں استری شدہ سُوٹوں اور کُول واٹرز کے نیچے میری اصلی ذات پوشیدہ تھی.. باریک پروں والی نیلی جیکٹ جسے میں نے ایک سربستہ راز کی طرح چھپا رکھا تھا۔ سنولیک کی آزمودہ شرٹس اور ٹریکنگ ٹراؤزرز..

میں نے گرم جرابوں اور اُونی بنیانوں کو اِدھر اُدھر گھسیڑا..

اپنے جوگرز کے جوڑے کو... ایک چوری شدہ مال کی مانند چھپایا..

یہ سب کچھ پہلی محبت کے خطوط کی مانند تھا جسے میں ایک چور کی طرح چھپا کر اپنے ہسپانوی سوٹ کیس میں نیپال لے گیا۔

میں بابل کی اُس چڑیا کی طرح تھا.. جس نے کھٹمنڈو میں اُس بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے بعد اناپورنا کی سفیدی اور ایورسٹ کی بلندی کی جانب اُڑ جانا تھا..

میں پَر سمیٹے ایئربس میں بیٹھا تھا..

اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں وہ پرندہ ہوں جو اُن کے قبیلے میں سے نہیں ہوں..

جو سینکڑوں ہم سفر ہیں میں اُن سے جُدا ہوں..

وہ سب لاعلم تھے کہ میں کیا ہوں..

میں اپنی چونچ بند رکھے ہوئے تھا..

اگر میں یہ چونچ کھولتا.. تو اُس میں سے.. ایورسٹ اور اناپورنا کی چہچہاہٹ بلند ہوتی اور ایئربس کے مسافر جان جاتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اسی لئے میں اپنی چونچ بند رکھے ہوئے تھا!

میں اپنے پَر سمیٹے نہایت پرندہ معصومیت سے ایئربس کے نیچے.. پینتیس ہزار فٹ نیچے.. ہندوستان کی سرزمین پر سے گذرتا جاتا تھا۔

نیچے لکھنؤ اور ایک دریا گذر رہا تھا..

اور میرے ہمراہی کون کون سے پرندے تھے..

سلمان ملک.. اگرچہ نہایت تباہ کن حد تک ہینڈ سَم... لیکن ذرا ذرا سی بات پر رُوٹھ جانے والا... مُنہ بسورنے والا سویٹ سا بے بی... سلمان.. جس کے بال شاید عمر کی وجہ سے نہیں بار بار روٹھنے کی وجہ سے سفید ہو رہے تھے اور وہ اُنہیں ایسے رنگتا تھا کہ کہیں کہیں اُس کے روٹھ جانے کا شائبہ سفید ہوتا تھا.. سلمان.. یونیسیف پاکستان کا نمائندہ تھا اور نیپال جاتی ہوئی ہم کونجوں کی مختصر ڈار کے آگے آگے پرواز کرتا تھا تاکہ ہمیں راستہ دکھا سکے.. انگریزی اطالوی لہجے میں بولتا تھا اور بیوٹی فل کو بیوتی فل کہتا تھا۔

ایک بڑے اردو اخبار کی اگرچہ مُختصر مگر معتبر خاتون خالدہ یوسف.. جو بولتی تھیں تو اتنا دھیما بولتی تھیں کہ کسی اپنی ساس کو بھی نہ سُنائی دے سکتی تھیں جو کان لگا کر برابر

والے کمرے میں سرگوشیاں کرتی اپنی بہو کو سنتی ہے۔۔

طاہرہ دی گرل گائیڈ ایک تنک اور بادی النظر میں نہایت درشت اور اُستانی ٹا
کی خاتون جو بڑی آپا کے رول کے لئے نہایت موزوں تھیں۔۔ بولتی تھیں تو بولتی چلی جا
تھیں۔ چُپ ہوتی تھیں تو چُپ شاہ ہو جاتی تھیں۔ خوش ہوتی تھیں تو زیادہ ہی خوش ہو
جاتی تھیں اور خفا ہوتی تھیں تو کُل کائنات منانے آ جائے مانتی نہ تھیں۔۔

اسلام آباد کے ایک نوجوان بیورو چیف۔۔ ایک پسندیدہ روزنامے کے بیورو چیف
فاروق۔۔ جو اپنے تن و توش سے ایسے لگتے تھے۔۔۔ جیسے ابھی کھٹمنڈو میں منعقد ہونے والے
اُس عظیم الشان دنگل کی اناؤنسمنٹ کریں گے جس میں بنگلہ دیش' بھارت' نیپال'
افغانستان' پاکستان اور امریکہ کے پہلوان اور پہلوانیاں شریک ہو رہے ہیں۔ مُونچھوں کو
تاؤ دیتے ہوئے یا تو وہ نزدیک ترین ایئرہوسٹس پر نظر رکھتے تھے اور یا ہم پر نظر رکھتے
تھے۔۔ البتہ ایئرہوسٹس پر تادیر نظر رکھتے تھے۔۔ وہ ایک دھوکا باز صحافی تھے۔۔ جو اپنی لاپرواہ
شخصیت سے شبہ نہ ہونے دیتا تھا کہ یہ شخص رپورٹ بھی کر سکتا ہے۔۔ اور بہترین۔۔ اندر
میں۔۔ وہ ایک پروفیشنل جرنلسٹ تھا جو نظر رکھتا تھا اور جو وہ خود نظر آتا تھا اصل میں وہ
تھا۔۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی نمائندگی ضیاء الرحمٰن کر رہے تھے۔۔۔ میں نے ضیاء کا نام
اگرچہ میں اس نام سے ازحد الرجک تھا ٹیلی ویژن کی سکرین پر ایک منجھے ہوئے پروڈیوسر
کی حیثیت سے متعدد بار دیکھا تھا۔۔ لیکن اُن کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔۔

ضیاء اپنی سُنہری داڑھی پر نہایت عقیدت سے ہاتھ پھیرتے تھے جیسے وہ داڑھی
اُن کی نہ ہو۔۔ اُن کے پیر و مُرشد کی ہو۔۔ اور وہ شکل سے کوئی سوس کوہ پیما لگتے تھے اگرچہ
کوہ پیما اتنے خوش لباس نہیں ہوتے۔۔

"تارڑ صاحب کیا آپ پی آئی اے سے مطمئن ہیں؟" ایک ایئرہوسٹس نے مجھے
پہچان کر انگریزی میں پُوچھا۔

"مَیں آپ سے مطمئن ہوں۔۔" مَیں اُس خاتون کا شکر گزار ہوا جس نے شہر
لکھنؤ کے اُوپر پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر مجھے پہچان لیا تھا اگرچہ میں اُس سے بھی کوئی
اتنا زیادہ مطمئن نہ تھا لیکن عمدہ اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

"تھینک یُو۔۔" وہ اس قسم کے کامپلی منٹس کی عادی تھی۔۔۔ یہ وہ پروفیشنل ہیزرڈ
تھے جن میں سے وہ ہر فلائٹ کے دوران درجنوں مرتبہ گذرتی تھی۔۔ ہر وہ شخص جسے بیشک
ناک پونچھنے کی تمیز نہ ہو جب ایئر ٹکٹ خریدتا ہے تو وہ ایئرہوسٹس کے ساتھ فلرٹ کرنے
کا اپنے تئیں حق بھی خرید لیتا ہے۔۔ وہ بے شک بھدا بد شکل اور بوڑھا ہو۔۔ لوہے کا
بیوپاری ہو یا سٹوڈنٹ ٹکٹ پر سفر کرنے والا ایک بچہ ہو وہ بار بار اپنی نشست کے اُوپر
سروس کال کا بٹن دبا کر اُسے روشن کرے گا اور ایئرہوسٹس کے آنے پر ایک گلاس پانی
مانگنے سے پیشتر تھوڑا سا فلرٹ کرے گا۔ چُنانچہ ایک ایئرہوسٹس پر کسی فقرے۔۔ کسی
فلرٹیشن کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان سے محفوظ ہو چکی ہوتی ہے۔۔ بے خوف اور
آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔۔ اُس کے لئے مسافر وہ بچے ہوتے ہیں جو اُوٹ پٹانگ حرکتیں کر
کے اپنے آپ کو اہم اور عقلمند ثابت کرنا چاہتے ہیں۔۔ لیکن جب اس قسم کا فلرٹیشیس فقرہ
میرے جیسے شخص کی جانب سے آتا ہے تو وہ اسے انجائے کرتی ہے اس لئے کہ وہ خوب
جانتی ہے کہ یہ فقروں کے بیوپاری ہیں۔ لفظوں کے سوداگر ہیں۔۔ ان کی پروفیشنل مجبوری
ہے کہ اس قسم کے فقرے کہیں۔ جیسے ایک زرد چہرے والی بلّی نُما خاتون نے مجھ سے کہا
تھا' تارڑ نہ تمہاری شکل ہے نہ عُمر ہے۔ لیکن۔ تیریاں گلاں نیں مینوں پٹیا اے۔۔ یعنی تیری
باتوں نے مجھے اُکھاڑ دیا ہے۔۔

"تھینک یُو۔۔" اُس نے کہا "لیکن کیا آپ پی آئی اے کی سروس سے مطمئن
ہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"لیکن کیوں؟۔" ایئرہوسٹس ہمہ تن گوش ہوئی۔۔ اور اُس کا تن ایسا نہ تھا کہ وہ
اُس کے ساتھ سُن سکتی۔۔

"اور یہ جان لیں کہ۔۔ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔۔"

ایئرہوسٹس ذرا بلش کر گئی۔۔ یا شاید اُس کے چہرے پر جو بلش آن تھا وہ مزید بلش
کر گیا "جانے دیں سَر۔۔ آپ اس عُمر میں بھی باز نہیں آتے۔۔ ویسے مجھے اُمید ہے کہ آپ
نیپال سے واپسی پر ہمارے لئے ایک اور سفرنامہ لکھیں گے۔۔"

"پتہ نہیں۔۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔۔ میں بے شمار ایسے مقامات پر گیا ہوں جہاں سے

واپسی پر میرے پاس لکھنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا.. اگر نیپال میں میرے ساتھ کچھ ہوا، تو
شاید میں اس کا حال لکھوں لیکن اس سفرنامے میں آپ نہیں ہوں گی.."

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں آپ سے مطمئن نہیں ہوں.."

میں ذرا گھر سے باہر قدم رکھوں.. ذرا کالا شاہ کاکو تک جاؤں تو ہمیشہ مُجھ سے پُوچھا
جاتا ہے کہ تارڑ صاحب واپسی پر سفرنامہ تو لکھیں گے ناں..

"اور آپ ہم سے کیوں مطمئن نہیں ہیں.." ایئرہوسٹس جس کے بال سُرخ
تھے۔ چہرہ توانا فراخ اور تجربہ کار تھا اور وہ ہزاروں مسافروں کے ذومعنی جملوں میں پلی
بڑھی تھی بلکہ پلی زیادہ اور بڑھی کم تھی' قدرے اتھلا کر بولی..

ایئربس کے دیگر مسافر مجھے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے تھے کہ یہ
ایئرہوسٹس اتنی دیر سے اس شخص پر کیوں جھکی ہوئی ہے۔ ہم نے بھی تو ٹکٹ پر رقمیں
لگائی ہوئی ہیں...

"میں آپ سے اس لئے مطمئن نہیں ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے میرے ایک
ایسے محبوب سے جُدا کر دیا ہے جو پچھلے ستائیس برس سے میرے پہلو میں تھا.. بلکہ میرے
کاندھے پر تھا. یہ محبوب میرا جاپانی کیمرہ اشائی پینٹیکس تھا جس کے سیاہ بدن میں نصب
ایک بٹن کو میں نے پہلی بار ستائیس برس پیشتر دبایا تھا اور اُس کے دبانے سے منظر اور
چہرے ساکت ہو کر میری یادوں کو دوام بخشتے تھے۔"

میں نے لاہور سے کراچی تک "گریٹ پیپل ٹو فلائی وِد" یعنی پی آئی اے کے
ایک جمبوجیٹ میں سفر کیا تھا۔ اگرچہ ایک زمانے میں.. اور ان دنوں قطعی طور پر نہیں.. کہ
اُس زمانے میں اس ایئرلائن کی ایئرہوسٹسوں کی کوالٹی نہایت معیاری اور پُرکشش ہوتی
تھی اور ان دنوں کوالٹی ذرا کم ہو چکی تھی اور کوانٹٹی بہت زیادہ ہو چکی تھی.. اُس
زمانے میں نظر ہٹتی نہ تھی ان دنوں نظر ڈالنے کو جی نہ چاہتا تھا.. تو اُس زمانے میں.. جو
زندہ دل تھے اور مزاج عاشقانہ رکھتے تھے.. یہی کہتے تھے کہ یہ موٹو اور ایئرہوسٹسوں کے
بدنی تناسب اور حرکت کو مدنظر رکھتے ہوئے "گریٹ پیپل ٹو فلائی وِد" نہیں "گریٹ پیپل
ٹو لائی وِد" ہونا چاہئے.... شاید "لائی وِد" جھوٹ بولنے کے حوالے سے کہا گیا ہے یا کسی

اور حوالے سے.. میری انگریزی نہایت ناقص ہے.. میری عقل کی طرح..

میں جب لاہور سے کراچی پہنچا اور گئی رات قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے
وسیع ویرانے میں پہنچا تو کھٹمنڈو کی فلائٹ پر سوار ہونے سے پیشتر میں نے اپنے ہسپانوی
سُوٹ کیس کی زِپ کھول کر اُس کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹول کر. یہ اطمینان کرنا چاہا کہ کیا
میرے انڈرویئر اور بنیانیں اور اُن کے نیچے پوشیدہ میرے کوہ نوردی کے ساتھی موجود
ہیں... تو وہ سب موجود تھے.. لیکن میرا اشائی پینٹیکس کیمرہ موجود نہ تھا..

میرا ہاتھ اُس کے بھاری آہنی وجود کو تلاش کرتا رہا.. اس لئے کہ میں یقین نہ کر
سکتا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا.. جیسے ایک شخص پارکنگ لاٹ میں واپس آتا ہے تو اُس کی
کار وہاں موجود نہیں ہوتی جہاں وہ اُسے پارک کر کے گیا تھا اور وہ اُس خالی جگہ کو ایک
عرصے تک بے یقینی سے تکتا رہتا ہے۔

وہ صرف ایک کیمرہ نہ تھا.. ایک ہم راز اور ساتھی تھا.. اور اُس کے ٹاکومار لینز
میں میرے کیسے کیسے راز اُترے تھے اور اُس نے اُنہیں افشا نہ کیا تھا..

میں نے اُس کے لینز میں سے اپنے بچوں کو انگوٹھا چُوستے اور فیڈر سے دُودھ پی
کر اُسے ہضم کرنے کی کوشش میں ننھے ننھے.. گُلابی اور سفید گڑیا بازوؤں کو فضا میں بلند
کرتے دیکھا تھا۔

اور پھر برسوں بعد اُنہی بچوں کو اسی کیمرے کی آنکھ سے پروفیشنل ڈگریز تھامے
ہوئے آنرز اور گولڈ میڈل وصول کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اپنی بیگم کے آزردہ حُسن کو ہنی مُون کے زمانوں سے... یہاں تک آتے ہوئے
اُس حُسن کو ماند پڑتے اور خزاں رسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔

یہ کیمرہ کہاں کہاں نہیں گیا تھا..

جب کوئی عزیز از جان دوست اپنی جان سے جاتا ہے تو اُس کی پوری زندگی
سامنے آ جاتی ہے۔

یہ دوست کہاں کہاں نہیں گیا تھا..

دُنیا کی دُوسری بلند ترین چوٹی شاہ گوری کے دامن میں' کنکورڈیا تک' نانگا پربت
کے روپہلی چہرے اور فیری میڈو چہرے کے سائے میں۔ دُنیا کے طویل ترین گلیشئر راستے

میں وہ میرا ساتھی تھا جب ہم سنو لیک پر شکرانے کے نفل ادا کرتے تھے تو وہ تھا جو ا
لمحوں کو محفوظ کرتا تھا... قرطبہ' غرناطہ' فلارنس' روم' ہرات' پیرس' بیروت... یونانی دیو
کے جزیرے' دشت مرگ' دشت لوط.. کوہ ارارات... اسرائیلی سرحد اور گولان.. قبر
اور شہزادوں کے جزیرے.. ایک طویل فہرست ہے.. وہ کہاں کہاں نہیں گیا تھا.

اور کبھی یہ صحراؤں میں گم ہوا.. اور کبھی میں برف ویرانوں میں اُسے چھوڑ آ
اور کبھی سنو لیک پر میں نے اُسے فراموش کر دیا اور ایسا بھی ہوا کہ وہ میرے کندھ
سے آزاد ہو کر ایک بلند گھاٹی سے لڑھکا اور دُنیا کے وحشی ترین دریا برالڈو کی قربت
لڑھکتا ہوا رُک گیا اور پھر سے مُجھے مل گیا۔

جو کیمرہ دُنیا بھر کی مسافت اور کوہ نوردیوں کے دوران مجھ سے جُدا نہ ہوا وہ
سہولت سے پی آئی اے کی لاہور سے کراچی جانے والی فلائٹ نمبر 396 میں مجھ سے
گیا... اب کے بچھڑے تو شاید.

میں جانتا ہوں کہ پی آئی اے کے جس اہلکار.. جس لوڈر نے اُسے چوری ک
اُس کی یونین کا ایک سرگرم رُکن ہو گا.. لیکن وہ میرے کیمرے کے پرانے ماڈل کی
سے اُسے فروخت کرتے ہوئے زیادہ رقم حاصل نہ کر سکے گا.. کسی کباڑئیے کے ہاتھ
اونے پونے داموں میں فروخت کر دے گا.. کاش یہ دام وہ مجھ سے لے لیتا۔

اور جو رقم اُسے ملی ہو گی اُس سے زیادہ سے زیادہ میکلوڈ روڈ لاہور یا برنس ر
کراچی میں چند روز کڑھائی گوشت کھائے گا..

چند روزہ کڑھائی گوشت میں کتنی یادیں دفن ہو جائیں گی۔

روم۔ قرطبہ۔ پیرس۔ ارضِ روم۔ بلیک فارسٹ اور دشت مرگ دفن ہو جا
گے..

ہاں ویسے تو اُسے رقم بہت کم ملے گی لیکن.. اگر وہ کباڑیا یہ جان جائے کہ ا
کیمرے کی آنکھ نے ستائیس برس میں کیا کیا دیکھا ہے.. کن شکلوں کی تصویر گری کی۔
کن کن مقاماتِ آہ و فغاں کا شاہد ہے.. تو وہ کباڑیا پی آئی اے کے اُس بدکردار چور اہلکا
کو مالا مال کر دے گا۔

کہ یہ ایسی یادیں ہیں جو کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔

جیسے آج سے پندرہ برس پیشتر سوزوکی کار نصیب میں آئی تو میں نے اپنے سُرخ ہونڈا 175 کو فراموش کر دیا۔ اُسے اپنے بیک یارڈ میں ڈمپ کر دیا کہ اُس کا بدن زنگ آلود ہو چکا تھا اور انجن ناکارہ ہو گیا تھا اور مڈگارڈز میں اتنے چھید تھے کہ بارش کے دوران میرے چہرے پر کیچڑ کے چھینٹے برستے تھے اور لیپ کرتے تھے۔ بیک یارڈ میں اُس کا ڈھانچہ مزید خستہ اور زنگ آلود ہوا.. کچھ بیلوں نے اُس کے بدن میں آشیانے بنائے' آئیوی اُس کی ٹینکی کے ساتھ چمٹ گئی اور وہ اُس حالت میں بھی فریاد کرتا سنائی دیتا تھا کہ یاد کرو.. میں نے کن کن زمانوں میں تمہارا ساتھ دیا تھا۔ تمہارے بچوں کے بوجھ کو ایک ڈھور ڈنگر کی طرح سکول سے گھر تک ڈھوتا تھا۔ میری پچھلی نشست پر کیا کیا صورتیں تھیں جو تمہارے شانے پر ٹھوڑی رکھ کر سفر کرتی تھیں.. اور اب تم مجھے فراموش کرتے ہو..

میں نے اُس کی آہ و فغاں سے تنگ آکر اور مجرم محسوس کرتے ہوئے اُسے اونے پونے داموں میں ایک کباڑئیے کے ہاتھوں فروخت کر دیا..

ایک عرصے تک بیک یارڈ کی وہ گھاس جس پر وہ کھڑا تھا.. سفید رہی.. آس پاس وہ سبز رنگت کی تھی۔

اور جب تک وہ سفید ٹکڑا جس پر ہونڈا 175 زنگ آلود ہوتا رہا تھا.. سرسبز نہ ہوا میرا احساسِ جرم موجود رہا۔

کچھ یادیں میں نے خود فروخت کر دیں.. ایک کباڑئیے کے ہاتھوں..

اور بقیہ یادیں.. پی آئی اے نے فروخت کر دیں..

تو... جانے والی چیز کا غم کیا کریں۔

"تارڑ صاحب.. وہ محبوب کونسا ہے جسے ہم نے آپ سے ستائیس برس کی رفاقت کے بعد جُدا کر دیا ہے؟" ایئرہوسٹس' کے چہرے پر.. جو فراخ اور سپید تھا.. بوریت اُتر چکی تھی۔

"ایک لوہے کا صنم۔ جس کے بوجھ کے.. میرے کاندھے عادی ہو چکے تھے.."

نیچے.. وادئ نیپال تھی..

اُس پر پی آئی اے کی ایئربس ایک ایسے بندر دیوتا ہنومان کی طرح پرواز کرتی

جاتی تھی جو اپنی ہتھیلی پر ایک پہاڑ کی بجائے ہمیں اٹھائے اڑان کرتا تھا۔

نیچے کچھ وادیاں تھیں... کچھ گھر اور بستیاں تھیں اور کچی سڑکیں تھیں۔

میں موازنہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اسلام آباد سے سکردو یا گلگت کی فلائ
یاد آتی تھی۔

نیچے منظر ذرا پھیکے تھے۔ اُن کی ہریاول ذرا مدھم تھی..

نہ اس ایئربس کے نیچے انجانے اور سکوت میں گنگ برف زار تھے.. اور نہ
ایسی جھیل جس کے نیلے طلسم میں آج تک کوئی نہ اُترا ہو.. درجنوں بار اسلام آباد
شمال کی جانب اُڑتے ہوئے میں نے یہی محسوس کیا جیسے میرے نیچے سرکتی سرزمین
برفانی بلندیوں کے لامتناہی سلسلوں کا سکوت اور اُن پر ایک سفید سانس لیتے آسیب
طرح اُترتی دُھند... یہ میری پہلی پرواز ہے.. میں آج سے پیشتر ادھر کبھی نہیں آیا..
برف معبدوں کی سفیدی اگرچہ متعدد بار میری نظروں سے آلودہ ہو چکی تھی لیکن ہر
وہ کنواری اور ان چھوئی لگتی تھیں.. میں ہمیشہ وہ اجنبی مسافر تھا جو سرِشام کوہ آرارات
دامن میں واقع اُس تنہا جھونپڑے کی جانب تھکے ہوئے قدموں سے، رات بسر کر
آس میں چلتا تھا جس میں سے دھواں اُٹھتا تھا.. اور اُس دھوئیں میں رات کے کھانے
مہک اُٹھتی تھی۔

بادل بہت گھنے نہ تھے اور دھند ہلکی اور بے نام سی تھی..

کیمرے کی گمشدگی کے بعد میں ذرا چوکنا ہو گیا تھا۔

میں نے کراچی کھٹمنڈو فلائٹ پر حفاظتی پیٹی کسنے سے پیشتر ہسپانوی سوٹ کیس
میں سے اور کچھ نہ نکالا صرف اپنی بنیانیں، ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان نکالا اور اُنہیں
اپنے دستی بیگ میں رکھ لیا کہ اگر یہ بھی چوری ہو گئے تو ان کے بغیر میں وہاں کیا سے کیا
جاؤں گا۔

میرا خیال تھا..

... اور زندگی کے اکثر خیالوں کی طرح یہ بھی ایک خام خیال تھا کہ یہ.. ای
بین الاقوامی پرواز ہے... اس لئے اس میں سوار ہوتے ہی.. دُنیا بدل جائے گی، قسمت بد
جائے گی... دھیمی خوابناک موسیقی ایک جنتی جل ترنگ کی طرح میرے کانوں میں اُتر

گی اور میں اُس کے لطف میں خوابِ خرگوش کے مزے لوں گا.. میرے اردگرد اَپسرائیں
رقص کریں گی اور اپنے کومل بدن مجھ سے ایک مناسب فاصلے پر رکھیں گی تاکہ مجھ میں
حرص بیدار نہ ہو حالانکہ حرص بیدار بھی ہو جائے تو میں اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا تھا.. اور
دُنیا بھر کے کھانے اور خاص طور پر پینے میرے سامنے سجا دیئے جائیں گے.. ایئرہوسٹس مجھ
پر قربان ہو جائے گی اور اس انٹرنیشنل فلائٹ میں بلاشبہ میرے پہلو بہ پہلو ہر قسم کی، ہر
بدن اور ہر ہوس کی گوریاں گنے دِیاں پوریاں سفر کریں گی اور تب مجھ پر بابر بھی رشک
کرے گا.. وہ بے شک فرغانہ سے اُترا تھا اور اب کابل میں بے آرام سوتا تھا اور اُس کے
روضے کی جالیاں نوادرات کے طور پر پاکستان میں سمگل کی جا چکی تھیں اس لئے کہ
طالبان اُسے اپنی سرزمین کا فرزند نہیں گردانتے تھے۔ یہ بابر کی خوش قسمتی ہے کہ طالبان
زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں اگر ہوتے تو "تزکِ بابری" کا مطالعہ کر کے اُس کی ہڈیوں کو قبر
میں سے نکال کر کابل سٹیڈیم میں دُرّے لگاتے۔ اور گردن کا منکا مل جاتا تو اُس کے گرد
پھندا کس کے اُسے پھانسی پر لٹکاتے.. کہ بابر نے تزک کے ہر دوسرے صفحے پر شراب اور
معجون کا ذکر کیا ہے کہ جنگ کے بعد ہم نے دشمنوں کی کھوپڑیوں کا مینار تعمیر کروایا، رات کو
جشن منایا اور پہلے معجون کھائی اور پھر شراب پی.... اگرچہ اُس نے ابراہیم لودھی کے
خلاف میدان میں اُترنے سے پیشتر شنید ہے کہ جام اور مٹکے توڑ ڈالے تھے اور توبہ تائب
ہو گیا تھا لیکن.. اگر ایک قاتل قتل کے بعد توبہ کر لے تو بھی سزا سے تو نہیں بچ سکتا.. اور
یُوں بھی بابر بہ عیش کوش ہی اُسے دُرّے لگانے کے لئے کافی اقبالِ جرم تھا۔ چنانچہ مجھے
یقین تھا کہ توبہ تائب ہونے سے پہلے کا بابر مجھے اس انٹرنیشنل فلائٹ میں اپسراؤں اور جام
سبو کے درمیان دیکھ لیتا تو یقیناً رشک کرتا اگرچہ ادھر معجون یعنی افیم کا بندوبست نہیں
تھا..

لیکن یہ محض ایک خوابِ خرگوش تھا.. کہ ایسا ہو گا.. بھلا کبھی خرگوشوں کے
خواب بھی پورے ہوئے ہیں.. پی آئی اے کی اس فلائٹ پر.. انٹرنیشنل فلائٹ پر.. نہ دُنیا
بدلی، نہ قسمت بدلی.. صرف مسافر بدلے.. اور وہ مسافر کیا تھے؟

اس ایئربس میں لاہور سے کانا کاچھا جانے والی ویگن میں جس قسم کا کراوڈ ہوتا
ہے بس اُسی قسم کا کراوڈ تھا.. فرق صرف ناکوں کا تھا..

بیشتر مسافر مشرق وسطیٰ میں مزدوری کرنے والے وطن لوٹتے نیپالی حضرات
جن کی مشکِ بدن خبر کرتی تھی اور بار بار کرتی تھی اور ناک پر رومال رکھ لینے کے باوجو
کرتی تھی کہ وہ سب چند برس پیشتر نیپال سے نہا کر نکلے تھے اور اب بشرطِ زندگی وا
اپنے گھروں میں پہنچ کر ہی دوبارہ اس امتحان میں سے گذریں گے.... کیسی کیسی دل
مہک تھی جو اس کیبن میں پرواز کرتی تھی۔

"سر آپ ہم سے مطمئن تو نہیں ہیں لیکن.." فراخ چہرے والی کٹے ہوئے
بالوں والی جہاں دیدہ.. اور اُس نے کیا کیا نہ دیدہ کیا ہو گا ایئر ہوسٹس ایک مرتبہ پھر جھ
جھکی "اگر آپ پسند کریں... ہمارے پائلٹ آپ کو مدعو کر رہے ہیں کہ آپ کاک پٹ
آجائیں اور اُن پہاڑیوں کو دیکھ لیں جنہیں ہمارے ایک پائلٹ نے نہیں دیکھا تھا او
قسم کی ایئر بس جس میں آپ سوار ہیں کریش ہو گئی تھی.. چند سو مسافران راہیٔ ملک
ہوئے تھے.... اَن فورچونیٹلی.."

جب سے میں نے اس کھٹمنڈو فلائٹ پر قدم رکھا تھا..

ایئر بس جو ایک خشکی پر رہ جانے والی وہیل کی طرح ایئر پورٹ پر پڑی تھی
کی سیڑھیاں چڑھنے سے پیشتر سیکیورٹی کے عملے کو سامان کے ساتھ لٹکے ٹیگز پر ثبت
پڑھی جانے والی مہریں چیک کروانے کے بعد پی آئی اے کے سٹاف کو بورڈنگ کارڈ کا
حصہ پیش کرنے کے بعد جب ہم سفر بخیر کی دعائیں مانگتے اور اپنے بال بچوں کو دوبارہ د
کی آرزو کرتے اُن سیڑھیوں پر بوجھل قدم رکھتے اوپر گئے اور ایئر بس کے دہانے
داخل ہوئے' مفت کے لالچ میں متعدد اخبار اٹھائے اور وہیل کے بدن میں اپنی
نشستیں تلاش کرنے لگے تو ہم سب کے بدن میں وہ ایئر کریش 'کریش ہو رہا تھا..

نیپالی مسافروں کی "دل آویز" مہک کے باوجود.. صبح کے اُس ناشتے کے باو
اگرچہ گرم تھا اور چائے میں خشک دودھ حلق کو خشک کر دینے والا تھا اور زندگی سے
کر دینے والا تھا... اس کے باوجود ہمارے دلوں میں... ایک ایئر کریش تھا... قاہرہ کا
بہت دور تھا.. مجھے ابھی تک یاد ہے کہ دو چار مسافروں کے علاوہ اُس کریش میں چند
بچ گئے تھے اور تصویروں میں وہ اپنے سوختہ پنجروں کے اُوپر حیران بیٹھے تھے.. کہا جا
کہ قاہرہ ایئر پورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے مسافر اپنی سیٹ بیلٹس باندھ چکے تھے اور

قریب آتی چلی جاتی تھیں جب بیشتر مسافروں کے لئے فنا کا بلاوا آگیا...
روشنیاں تیزی سے پنکھوں والے جہاز میں.. ایک سپر کانسٹلیشن جہاز میں
میں آج سے چالیس برس پیشتر ایک
جب قاہرہ ایئر پورٹ پر ایک شب اُترتا تھا تو منظر وہی تھا.. ہم نے بھی سیٹ بیلٹس باندھ لی
تھیں۔ شہر کی روشنیاں تیزی سے قریب آتی چلی جاتی تھیں.. مجھے اب تک یاد ہے کہ
قاہرہ کی نائٹ لائف کی ایک جھلک دکھانے کے لئے تمام مسافروں کو بسوں میں پیک کر کے
ویران سڑکوں اور اونگھتے ہوئے شہر میں سے.. ایک ایسے نائٹ کلب میں لے جایا گیا تھا
جس کے ویٹر پھندنوں والی سُرخ ترکی ٹوپیاں پہنے سفید سوٹ اور بو ٹائیاں باندھے ہمیں
کھانا سَرو کرتے تھے اور سٹیج پر ایک بیلے ڈانسر "یا حبیبی.. یا حبیبی" کے نعرے لگاتی اپنی پتلی
کمر اور کولہوں کو لچکاتی دوہری ہوتی جاتی تھی.. نائٹ کلب میں جمال عبدالناصر کی تصویر
مسکراہٹ بکھیرتی تھی.. اور مصری ہماری سمجھ میں نہ آتے تھے کہ وہ جمال کو گمال کہتے تھے
اور ابھی کچھ عرصہ پہلے جنرل نجیب نے شاہ فاروق کو فارغ کیا تھا.. اور اُس کے بعد کرنل
جمال عبدالناصر نے جنرل نجیب کو فارغ کیا تھا.. لیکن اس سے پیشتر ان دونوں نے شاہ
فاروق کو مکمل ملٹری اعزاز کے ساتھ سیلوٹ کرتے ہوئے شاہ صاحب کے فربہ اور بیکار
تن و توش کو ایک رائل شپ پر سوار کر کے جلاوطن کیا تھا..

یہ وہی شاہ فاروق تھے جن کی ہمشیرہ ثریا.. شاہ ایران کی پہلی اور آخری محبت
تھیں.. فرح دیبا کی نوخیزی کے باوجود..

یہ وہی شاہ فاروق تھے جو اپنی گرل فرینڈز کو پہلو میں بٹھا کر قاہرہ کی راتوں میں
کسی پارک میں جب مقامی پولیس کی مداخلت پر پہلے تو اپنی جرمن گن سے فائر کرتے تھے
اور پھر کہتے تھے... باسٹرڈز.. تم نے کبھی مصر کے ڈاک کے ٹکٹ نہیں دیکھے.. ہر ٹکٹ پر
میری تصویر ہے.. اور یہی شاہ فاروق تھے جو انقلاب مصر کے بعد جنوبی فرانس کے ساحلوں
پر سیاہ چشمے میں اور ایک وسیع اور تربوزی توند کے ساتھ فرانسیسی دوشیزاؤں کے جھرمٹ
میں ٹہلتے تھے.. اور پھر کسی احسان نافراموش دوشیزہ نے اُن کے ساتھ معاشقے کی تفصیلات
میں یہ شرانگیز خبر بھی دی کہ شاہ صاحب کا تن و توش جتنا وسیع تھا اُن کے دیگر اعضاء
اتنے ہی مختصر تھے...

قاہرہ کریش... میں جو بندر اپنے پنجروں پر حیران بیٹھے تھے.. شہر سے باہر ایک صحرا

میں.. اور اُن کے آس پاس سینکڑوں سوختہ بدن تھے.. جن میں نامور پاکستانی صحا
دانشور بھی شامل تھے.. اُس شب کے بہت بعد میں جب پھندنوں والی سُرخ ٹوپیوں
ویٹرز اور "یا حبیبی" پکارتی بیلے ڈانسر لچکتی ہوئی دوہری ہوتی تھی.. اور میرا ٹین ا
سلگتا تھا اور اُس کی ہر لچک کے ساتھ دوہرا نہیں۔ تیرہ ہوا جاتا تھا.. اور ابھی
اعضاء شاہ فاروق کی نسبت اتنے مختصر نہیں ہوئے تھے..

قاہرہ کا حادثہ بہت دور تھا..

تقریباً چالیس برس کا فاصلہ..

لیکن کوئی بھی ایئر کریش.. چاہے وہ چالیس برس پہلے ہوا ہو یا آج کے اخ
ہیڈ لائن میں فلیش ہوا ہو.. ایک ایسے ترک وطن کرنے والے شخص کی طرح ہوتا
جس کے دل میں ایک خدشہ ہمہ وقت موجود رہتا ہے کہ مجھے شہربدر کر دیا جائے گا
ہی اس دیس میں سے نکال دیا جائے گا..

تو.. یہی وہ فلائٹ ہے جو کریش ہو جائے گی.. سب کے دلوں میں اور بدنو
یہی خدشہ تھا..

اور قاہرہ کا حادثہ تو بہت دور کی بات تھی..

لیکن کھٹمنڈو کریش تو ابھی نزدیک کا قصہ تھا۔

اُس کریش میں جلنے والے مسافروں کی کھوپڑیاں اور سوختہ ہڈیاں وہ ابھی
اتنے نزدیک تھے کہ ہم کسی بھی کھوپڑی کو ہاتھ لگا سکتے تھے... اُس سے سوال کر سک
کہ تم بہ قائمی ہوش و حواس اِس ایئر تابوت میں کیوں چلے آئے جس کے اندر تم
تھوڑی سی راکھ ہے... شاید ایک آدھ ہڈی بھی ہو جو تمہاری نہیں ہے... یہی
ضیاء الحق سے بھی پوچھا جا سکتا تھا... تم نہیں جانتے کہ کراچی سے کھٹمنڈو پرواز
ہوئے وادی میں داخل ہونے سے ذرا پہلے جو پہاڑیاں ہیں اُنہیں ایک بار پائلٹ نے
اوور شوٹ کیا.. ذرا احتیاط کرتے ہوئے بلندی پر سے ہو کر ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تو ایئر
مختصر ہو گئی اور ایئر بس کو ایمرجنسی بریکس کے ساتھ روکا گیا اور اس کوشش میں
برسٹ ہو گئے اور ایئر بس ڈولتی.. لڑکھڑاتی.. کسی ٹُن بابے کی طرح ڈرنک اور بے ا
اور بے قابو ہوتی ہوئی گھسٹتی گئی اور بمشکل تباہی سے ذرا ادھر پہنچ کر رُک گئی.. اد

فلائٹ پر پائلٹ نے یہ طے کر لیا کہ وہ اوور شوٹ نہیں کرے گا... پہاڑیوں کے نظر آنے
پر ذرا نیچے ہو کر لینڈ کرے گا.. اور جب وہ اُن پہاڑیوں کی قربت میں پہنچا اور ذرا نیچے ہوا
تو اُس نے دیکھا کہ وادی کی وہ پہاڑیاں جن سے پرے کھٹمنڈو ایئرپورٹ ہے وہ ایئربس کی
ناک کی سیدھ میں اتنی تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی ہیں جیسے کوئی شہاب ثاقب گر رہا ہو...
وہ براہ راست اُن کی آغوش میں کریش ہونے کو ہو۔ تب پائلٹ نے فل تھراٹل دے کر
ایئربس کو تقریباً نوے درجے کے زاویے پر اُوپر اُٹھایا..

سینکڑوں مسافر جو ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے کے لئے حفاظتی پٹیاں باندھ رہے تھے
اُن کو یک لخت جھٹکے لگے... وہ اپنی نشستوں سے یوں آزاد ہوئے جیسے خلا کے مسافر
بے اختیار ہوتے ہیں۔ اُن کا سامان اور وہ ایسے مدغم ہوئے جیسے برسات میں بھیگے ہوئے
نرم جامن ایک کُنجے میں ڈال کر جھٹکائے جاتے ہیں اور وہ بے اختیار اور بے بس ہوتے
ہیں....

ایئربس کا پورا وجود... خلا میں اُٹھتے ایک راکٹ کی طرح سیدھا ہوا....

اُن پہاڑیوں کے اُوپر اُٹھا..

لیکن ایئربس کی ایک دُم یا ٹیل بھی تھی۔ جس پر کاتب تقدیر نے رقم کر رکھا تھا
کہ سارا جہاز کلیئر ہو جائے گا لیکن تم نے اس پہاڑی کو ذرا چھونا ہے.. ایک لمسِ آخرت
تمہارے نصیب میں ہے..

ایئربس کی دُم.. اُس کا آخری حصہ وادیٔ کھٹمنڈو کے گرد بلند ہوتی ہوئی پہاڑیوں
سے ٹکرائی... ذرا ایک لمحے کا لمس ہوا.. ملاپ ہوا.. اور اُوپر اُٹھتی ہوئی ایئر بس ایک گیلی
تُرلی کی طرح نیچے آ گئی۔

اور اب اُس ویران وادی میں آبادی ہے..

... اگرچہ خاموش اور چپ ہے لیکن ایک بین الاقوامی آبادی ہے جس میں
رجنوں قومیتوں کے لوگ دفن ہیں.. یا اُن کی راکھ یا کچھ بھی دفن ہے.. اُن کی یاد میں
یک پارک تعمیر کیا گیا ہے.... جس میں صبح سویرے اُن کی رُوحیں جاگنگ کر سکتی ہیں کہ یہ
ہ زمانے ہیں کہ رُوحوں کو بھی اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے تردد کرنا پڑتا ہے ورنہ
نہیں بھی.. ہماری طرح بلڈ پریشر اور بلڈ شوگر وغیرہ کا عارضہ لاحق ہو سکتا ہے.. اگر آپ کو

یقین نہ ہو تو بے شک کسی رُوح سے پوچھ لیجئے... کسی ایسی رُوح سے جو پی آئی اے ایئربس کے کریش کے بعد وجود میں آئی ہو..

یہ کیا عجب پارک تھا جس میں روحیں جاگنگ کرتی تھیں...

کم از کم ہم اس پارک میں جاگنگ کرنے کے متمنی نہ تھے....

اگر ہمیں خصوصی طور پر دعوت بھی دی جاتی تو ہم یہ کہہ کر معذرت کر لیتے جی ہمارے پاس جاگنگ شوز نہیں ہیں.. اس اُمید کے ساتھ کہ میرے ہسپانوی سُوٹ کی تلاشی نہیں لی جائے گی کہ اُس میں تو جاگنگ شُوز تھے..

لاحول ولا... میں ذرا سراسیمہ ہو گیا تھا.. بھٹک کر جانے کہاں سے کہاں نکل گیا میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی کہ یہ تم کس اجل راستے پر جاگنگ کر رہے ہو.. واپس جاؤ۔

ویسے میں نہایت دانا اور سیانا شخص تھا.. میں خوب جانتا تھا کہ ایک شے لا ایورجز ہوتی ہے.. اور اس کے مطابق اگر آپ کسی بھی ایئر کریش کے فوراً بعد اُس پر اُسی فلائٹ پر سفر کریں تو اُس کے کریش ہونے کے امکانات ناممکن کی حد کو چھُو ہیں.. اور دو چار برس تک عافیت رہتی ہے..

"جی نہیں شکریہ.." میں نے نہایت کھسیائی ہوئی آواز میں ایئر ہوسٹس کی کش قبول کرنے سے معذرت کر لی "مجھے پائلٹ حضرات پر پورا اعتماد ہے کہ وہ محفوظ لینڈنگ کر لیں گے"

ایسا اکثر ہو جاتا ہے کہ مجھے مسافروں میں سپاٹ کر کے کاک پٹ میں مدعو جاتا ہے.. میں گلگت اور سکردو فلائٹ پر تو جان بوجھ کر اپنے آپ ایک ندیدے کی طرح نمایاں کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے مجھے پہچان لو اور کاک پٹ میں لے چلو تاکہ کے ٹو اور نانگا پربت کو ایک بلند خلاء سے.. کسی دوسرے سیارے سے اُترنے والی مخلوق کی طرح دیکھوں اور اپنے سیارے کو بھُول کر اس دُنیا کے حُسن کا اسیر ہو کر یہ فیصلہ کر لوں میں وطن واپس نہیں جاؤں گا.. لیکن عام فلائٹس کے دوران میں اپنے آپ کو کسی ا سیاہ چشمے کے پیچھے اس لئے پوشیدہ رکھتا ہوں کہ کاک پٹ میں بیٹھ کر لینڈنگ کا منظر ایک ہولناک تجربہ ہے.. جس طور آپ کی نظروں کے سامنے ایئر سٹرپ آپ پر اُمڈتی

آپ کو ہڑپ کرتی ہوئی سینکڑوں کلومیٹرز کی برق رفتاری سے بڑھتی آتی ہے اور جہاز کے ٹائر جب سٹرپ کو چھُوتے اور چنگاریاں نکالتے ہیں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ ٹھیک ہے آج سے پیشتر یہ جیٹ بہ حفاظت لینڈ کر جاتا ہو گا لیکن آج یہ کریش کر جائے گا.. اسی لئے میں نے یہ پیشکش مسترد کر دی تھی کہ میں بزدل اور جان کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا تھا...

اگرچہ میری مسکراہٹ سراسیمہ تھی لیکن سفید شلوار قمیض میں ملبوس اُس چھریرے بدن والی خاتون کی مسکراہٹ نہایت پُرکشش، تہذیب یافتہ اور دل پذیر تھی اور اُس کی آنکھیں بولتی تھیں.. آنکھیں بدن کا دروازہ ہوتی ہیں.. اگر وہ بولیں تو پورا بدن بولتا ہے... میں جب بھی اپنی نشست سے اُٹھ کر ایئربس کے سموکنگ ایریا میں سُوٹا لگانے جاتا وہ بہر صورت مجھے اِس مسکراہٹ سے نوازتی.. چنانچہ میں ایئر کریش کے ہول کو اپنے بدن سے بے وطن کرنے کے لئے جب ایک مرتبہ پھر سگرٹ نوشی کے لئے جہاز کے پچھلے حصے کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں وہی مسکراہٹ دیوار بن گئی..

کراچی ایئرپورٹ پر جب ہم کھٹمنڈو فلائٹ میں داخل ہونے کے لئے قطار بنائے رینگتے تھے تو میرے آگے یہی خاتون تھیں بلکہ اُن کی پُشت اور کٹے ہوئے بال اور گردن کا کچھ حصہ تھا.. اور اُس کے زاویہ ہائے بدن اتنے چھریرے اور لچکیلے تھے کہ وہ کچے بانس کی ایک ایسی سیڑھی لگ رہی تھی جس پر قدم رکھنے سے وہ لچک کر دوہری ہو جاتی ہے.... یعنی ایک پنجابی لوک بولی کی تصویر کہ.. میں پتلے بانس دی پوہڑی.. تے ہولی ہولی چڑھ بالما..

وہ متعدد ہینڈ بیگز، شولڈر بیگز اور پتہ نہیں کون کون سے بیگ اُٹھائے اور لٹکائے ہوئے تھی.. بائیں ہاتھ میں ایک بہت بڑا تھیلا سنبھالنے کی کوشش میں تھی اور دائیں ہاتھ سے دو سُوٹ کیسوں کے حجم کے برابر ایک بیگ قطار کے ذرا سے رینگنے پر اُٹھاتی تھی اور اُس کے بوجھ سے لچک کر دوہری ہوتی تھی اور اُس کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے دھڑام سے ٹرمیک پر گرا دیتی تھی.. وہ نہایت مشکل میں تھی... مجھے خدشہ تھا کہ اس خاتون نے اگر ایک اور مرتبہ اس بھاری پتھر کو اُٹھایا جو شکل سے بیگ لگ رہا تھا تو اس کا ہاتھ کلائی سے جدا ہو کر بیگ کے وجود کا ایک حصہ بن کر گر جائے گا.. اگرچہ میں ایک عمر رسیدہ نائٹ تھا لیکن ابھی تک شولری کے آداب کو بھولا نہ تھا اس لئے میں نے آگے

بڑھ کر اردو میں کہا "خاتون اگر اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تو کیا میں آپ کی مدد کر
ہوں؟"

خاتون شاید ایک عرصہ دراز سے میرے جیسے ہی کسی عمر رسیدہ اور فاتر ا
نائٹ کی آمد کی منتظر تھی اُس نے اپنی مسکراہٹ کو مزید دل آویز کیا اور کہنے لگی "اوہ
اور یہ "اوہ پلیز" بھی نہایت توبہ شکن تھی۔

چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر اُس بیگ کے سٹریپ کو گرفت میں لے لیا اور
اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ ملعون ٹرمیک کے فرش کے ساتھ جڑا ہوا معلوم ہوا کہ
سے انکاری ہو گیا اور میں نے ذرا اور زور لگایا تو میری کمرِ رفتہ میں خطرے کی گھنٹیاں
لگیں اور چُک پڑنے کا شدید خدشہ پیدا ہو گیا.. میر صاحب نے تو عشق کو اِک بھاری
کہا تھا اور اعتراف کر لیا تھا کہ کب مجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے.. اگرچہ ہم جب عمر رفتہ
ہوتے تھے تو ہر قسم کے پتھر آسانی سے اُٹھا لیتے تھے اور پتھروں کی کوئی کمی نہ تھی
اٹھائے جانا چاہتے تھے.. لیکن اب یہ زمانے جُدا تھے.. ان زوال وقتوں میں ایک کنکر اُٹھا
سے بھی ریڑھ کی ہڈی میں خلل پیدا ہو جاتا تھا.... لیکن میں نے بالآخر اُس بھاری بیگ
اُٹھا ہی لیا.. ہر سیڑھی کا ہفت خواں ہانپتے ہوئے طے کیا' ایئربس کے اندر پہنچ کر ا
بے ربط سانسوں پر قدغن لگا کر اُسے بیگیج کمپارٹمنٹ میں رکھا اور خاتون کی تشک
مسکراہٹ کے جواب میں "مائی پلیژر" کہہ کر اپنی نشست پر ڈھیر ہو کر تادیر بے جان
اور ہانپتا رہا.... اُس بوڑھے کاسانووا کی طرح جو ملاپ کے بعد قریب المرگ ہو جاتا ہے..

چنانچہ ایئر کریش کے ہول کو اپنے دل سے رخصت کرنے کے لئے سگر
ایک اور کش لگانے کے لئے جب میں جہاز کے پچھلے حصے میں جا رہا تھا تو وہی مسکرا
راستے کی دیوار بن گئی..

میں رُک گیا کہ آگے دیوار تھی۔

ذرا جُھکا "آپ کے اُس بیگ میں کیا اینٹیں بھری ہوئی ہیں جو اتنا وزنی ہے.."

"نہیں..." اور جب اُس خاتون نے "نہیں" کہا تو میری نظر اُس کے بالوں
گئی اور میں اپنے رنگریز تجربے کی بنا پر جان گیا کہ وہ کونسا ہیئر ڈائی اور کس نمبر کا ہیئر ڈ
استعمال کرتی ہے اور مجھے کچھ اطمینان سا ہوا کہ عمروں میں اتنا بھی فرق نہیں.. لیکن ا

کے باوجود وہ ایک دل کش صنف نازک تھی "نہیں.. اُس بیگ میں کتابیں ہیں"

"یہ آپ اتنی ڈھیر ساری اور بھاری کتابیں جن میں یقیناً کچھ ڈکشنریاں اور
سائیکلوپیڈیا کی پچاس ساٹھ جلدیں ہوں گی.. نیپال لے جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں.."

"اور پھر انہیں پڑھ کر واپس کراچی لے آئیں گی؟"

"نہیں.. کتابیں تو نیپال میں ہی رہیں گی..."

"یعنی آپ انہیں کسی سکول یا لائبریری میں دان کر کے واپس آ جائیں گی؟"

"نہیں.." اُس نے کہا.. اور جب اُس نے یہ "نہیں" کہا تو وہ مجھے نہیں دیکھتی
تھی بلکہ میرے پیچھے منتظر اور رُکی ہوئی ایئر ہوسٹس کو اور اُس کی خوراک کی ٹرالی کو
دیکھتی تھی جو مجھے راستے کی رکاوٹ پا کر قدرے بیزاری سے دیکھتی تھی کہ یہ شخص کیوں
راستہ روکے کھڑا ہے اور میرے فرائضِ خوراک کے راستے میں کیوں حائل ہو رہا ہے..

"سوری.." میں نے ایئرہوسٹس سے معذرت کی اور اپنے آپ کو خاتون کی
نشست سے چپکا کر اپنے موٹاپے کو سانس اندر کھینچ کر کم کرنے کی نہایت ناکام کوشش
کرتے ہوئے کہا.. فوڈ ٹرالی بمشکل میری توند کو بائی پاس کرتی ہوئی گذر گئی اور اُس فوڈ ٹرالی
میں اگرچہ گرم لیکن نہایت بوسیدہ اور بیہودہ خوراک تھی جسے مسافر من و سلویٰ کی طرح
رغبت سے کھاتے چلے جاتے تھے۔

"نہیں.." اُس نے سلسلۂ لچکیلی سیڑھی جاری رکھا "یہ میری لائبریری میں رہیں
گی.. میں ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لئے کراچی آئی ہوئی تھی اور اب اپنے وطن نیپال
جا رہی ہوں"

"آپ نیپالی ہیں؟" اگرچہ ایئربس مسلسل بادلوں کے سفید گھیرے توڑتی' جھٹکے
کھاتی گذرتی تھی لیکن مجھے اُس کی نسبت جو جھٹکا لگا تو ذرا شدید لگا۔

"یس آئی ایم.." اُس نے پہلی بار زبانِ انگریزی کا براہ راست سہارا لیا۔

ایئربس کو ایک اور سچ مچ کا دھچکا لگا.. حفاظتی بند باندھ لیجئے اور اپنی اپنی نشستوں
پر تشریف رکھئے کے اعلانات روشن ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے اور
سہارنے کے لئے اُس کی نشست کا سہارا لیا اور میرا ہاتھ اُس کے ناتواں کندھے پر پھسلتا

ہوا گیا اور پھر میں سیدھا ہو گیا "لیکن آپ تو اردو بول رہی تھیں.. میں آپ کو پاکستانی تھا.."

"کیا آپ نے میرا بھاری بیگ صرف پاکستانی سمجھ کر اُٹھایا تھا.."

"نہیں.. ایک ڈیمزل اِن ڈسٹریس.. یعنی کسی آفت میں مبتلا حسینہ سمجھ کر تھا.. لیکن آپ تو اردو بولتی ہیں۔"

"نیپال میں سب لوگ اردو بولتے ہیں اور ہم لوگ اسے ہندی یا ہندوستانی ہیں۔ میرا نام سری جانا شرما ہے.. کھٹمنڈو کے مہاراج گنج میں رہتی ہوں.. یہ میرا کارڈ" اُس نے اپنے بٹوے میں سے ایک کارڈ ترپ کی پتے کی طرح نکال کر مجھے تھما دیا "آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنے شہر میں گھما سکتی ہوں"

"ہم تو پہلے سے ہی گھومے ہوئے ہیں.. مزید گھوم سکتے ہیں" میں ایک ناگہانی کی طرح اُس کے سر سے ٹلنا تو نہیں چاہتا تھا.. بے شک اُس کے سر کے بال ہوئے تھے لیکن ایئرہوسٹس جس فوڈ ٹرالی کو ابھی دھکیلتی ہوئی آگے گئی تھی اب واپس لا رہی تھی اور ایک مرتبہ پھر میری فربہ کمر میں کچوکے دے رہی تھی..

میں جب اپنی نشست پر ڈولتا ہوا واپس آیا۔ کچھ ایئربس کے دھچکوں کے اور کچھ لچکیلی بانس کی سیڑھی کی شہر میں گھمانے کی پیشکش پر.. تو میرے ساتھیوں کی شکایت آمیز نظروں نے میرا سرد استقبال کیا..

وہ ابھی مجھے جانتے نہ تھے..

میں بابل کی وہ چڑیا تھی جس نے اُڑ جانا تھا..

اور اُسی لمحے نیپال میں قدم رکھنے یا لینڈنگ کرنے کی اناؤنسمنٹ ہو

"لیڈیز اینڈ جنٹل مین.. ووئی آر اباؤٹ ٹو لینڈ ایٹ کھٹمنڈو انٹرنیشنل تری بھون... ایئرپو براہ کرم اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیجئے اور سگرٹ بجھا دیجے وغیرہ وغیرہ.."

ایئربس کے ٹائرز جب شرپاز اور گورکھاز اور ایورسٹ کی سرزمین کو چھو میرا تیئس برس کا بن باس اختتام کو پہنچا۔

تری بھون انٹرنیشنل کھٹمنڈو ایئرپورٹ... بڑا سہما سا' گھریلو ایئرپورٹ لگا..

جب ہماری ایئربس لینڈ کرتی تھی تو رن وے پر ایسے طیارے کھڑے تھے جن کے بدنوں پر نامانوس زبان میں اُن کی ہوائی کمپنیوں کی شناخت لکھی تھی.. ان میں ایک جہاز پر "بدھا ایئرلائن" درج تھا..

یہ شاید لارڈ بدھا کی ذاتی ایئرلائن تھی.. اور وہ اپنے بدن کو بھوک سے مُکھا کر اور اسے پرندوں کی آماجگاہ بنا کر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ نروان صرف بگ بزنس میں ہے اور اب ایک ایئرلائن آپریٹ کرتا تھا..

کھٹمنڈو ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی ہم آریائی ناکوں والوں کو سب سے پہلے چپٹی ناکوں کا صدمہ پہنچا..

اور پھر ہم نے .. زرد۔ جامنی۔ سبز۔ نیلے ادر سُرخ رنگوں کے متحرک لبادے دیکھے اور اُن لبادوں میں جو نیپالنیں قدرے پوشیدہ تھیں' اُنہیں دیکھا۔ یہ ایئرپورٹ کا رنگین عملہ تھا جو دھیرے دھیرے حرکت کرتا تھا اور فاروق کی نظریں دھیرے دھیرے اُن پر اور جو اُن میں ملفوف تھا اُس پر حرکت کرتی تھیں...

آس پاس کہیں بھی مردانہ پولیس کا نام و نشان نہ تھا..

صرف زنانہ.. یعنی لیڈیز پولیس تھی جو ایسی پتلونوں میں تھی جو اُن کے چہروں کی مناسبت سے بے حد پھیلتے ہوئے ہپس میں حرکت کرتی تھی.... ہپس کا یہ ناگ پھیلاؤ.. جیسے ایک کوبرا ڈسنے سے پیشتر پھن پھیلاتا ہے شاید نیپال میں حُسن کی ایک قدرے چوڑی اور زہرناک ادا سمجھا جاتا ہے.... عورت کے سرین... "پرفیومڈ گارڈن" لکھنے والے ایرانیوں کے لئے اور "کاماسوترا" کے ہندوستانیوں کے لئے ایسے مقام تھے جہاں سے آئندہ نسلیں' لذت کے زمانے ادر کائناتیں جنم لیتی تھیں۔

اور جب میں نے نیپال کے مندروں میں براجمان دیویوں کے مجسّمے دیکھے تو وہ بھی اتنی براڈ ہپڈ تھیں کہ اپنے آسن سے اُٹھتے نہ اُٹھتی تھیں... لیکن نیپالی پولیس کی اِن دیویوں میں کوئی شہوت نہ تھی' کوئی کج ادائی نہ تھی.. یہ اگرچہ کاماسوترا کی تصویریں تھیں لیکن ہیجان ان کے پاس نہ پھٹکتا تھا.. یہ کم از کم میرے "پرفیومڈ گارڈن" میں رہائش پذیر نہیں ہو سکتی تھیں۔

ویزا کاؤنٹر پر ہم ایک قطار میں کھڑے آہستہ آہستہ سرکتے تھے.. پھر باری آنے پر

فارم بھرتے تھے' پاسپورٹ نمبر لکھتے تھے اور نیپال یاترا کا جواز درج کرتے تھے۔۔

اب ہم یعنی مرد حضرات نیپال میں آمد کا مقصد براڈ ہیڈ دیویوں کی زیارت اُن کے ہِپس کی پیمائش تو نہ لکھ سکتے تھے اس لئے "کانفرنس" کے خانے پر ٹِک مارک اور ویزا بارہ امریکی ڈالر کے عوض اپنے پاسپورٹ پر ٹھپہ لگوا کر وصول کیا۔۔ ویزا کاؤنٹر کوئی بدنظمی نہ تھی کوئی ہنگامہ نہ تھا ہر کام ایک خاص سستی اور دھیرج سے ہو گیا۔

اِسی ویزا کاؤنٹر پر۔۔ دو پٹھان برادر شلوار قمیض اور نسوار میں ملبوس ہمارے منتظر تھے۔

"تم پاکستانی ہو؟" اُنہوں نے نہایت تحکمانہ اگرچہ برادرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔۔"

"تو پھر ادھر ہمارا فارم لکھ دو۔۔"

"آپ خود لکھ لو۔۔"

"ہم خود لکھ سکتا تو تم کو بولتا۔ لکھو۔۔"

"جی تو خان صاحب کھٹمنڈو میں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے۔۔" میں نے فارم شروع کر دیا۔

"ہم سیر کرے گا۔۔۔"

"کدھر سیر کرے گا؟"

"اوئے یارا تمہیں اس سے کیا تم لکھو۔۔۔"

"ایورسٹ پر جائے گا؟"

"کدھر؟"

"ایورسٹ۔۔۔"

"یہ کون ہے؟۔۔۔ یارا تم لکھو ہم ٹورسٹ کرے گا۔ لکھو۔۔"

چنانچہ میں نے اپنے پیارے خان باباز کے لئے فارم فِل کئے اور میں جانتا تھا کہ وہ ادھر کسی کونیکشن کے سلسلے میں آئے ہیں۔۔ اور یہ کونیکشن گولڈن ٹرائی اینگل کے ملکوں سے جڑا ہوا ہے جو جنوبی امریکہ کے بعد ڈرگ ٹریڈ کا سب سے بدنام ترین راستہ ہے۔۔ وہ ایورسٹ کے بیس کیمپ تک ٹریکنگ کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔۔ اور نہ ہی وہ نیپال

کی ثقافت اور دیومالا کے بارے میں پی ایچ ڈی کرنے آئے تھے بلکہ۔۔ اُس سفید سفوف کے رابطوں کے لئے آئے تھے جس کے استعمال سے انسان ایورسٹ سے بھی بلند چوٹیوں پر پہنچ جاتا ہے۔۔ ویسے کسی کی نیت پر شبہ کرنا بُری بات ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تبلیغی جماعت کے ممبر ہوں۔۔ اور یہ میرے ذہن کی کجی ہو جو اُنہیں گولڈن ٹرائی اینگل سے منسلک کرتی ہو۔۔

ایک نظر ناگہانی ڈیوٹی فری شاپ تک گئی۔۔

ہر بین الاقوامی ایئرپورٹ کی طرح یہاں بھی ایک ڈیوٹی فری شاپ تھی جس میں شیشے کا سامان بہت تھا۔۔ اور اُن شیشوں میں رنگین پانی چھلکنے کو آتا تھا۔۔

"تارڑ صاحب اس ڈیوٹی فری شاپ میں کیا کیا ملتا ہے؟" ضیاء صاحب اُس شاپ کے شیشوں میں گُم تھے اور ایک حسرت کی نظر کرتے تھے۔

"سگرٹ۔ چاکلیٹس۔۔ سوئٹس وغیرہ۔۔"

"اور کچھ نہیں ملتا؟"

"کوکوکولا کے ٹن۔۔ مزید سگرٹ۔۔ مزید چاکلیٹ۔۔"

"ان کے سوا اور کچھ نہیں ملتا؟"

"آپ کو اور کچھ کیا چاہئے۔۔"

"مجھے تو اور کچھ نہیں چاہئے۔۔" وہ آناً فاناً سیدھے ہو کر ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا افسر ہو گئے۔۔

"ضیا صاحب اس ڈیوٹی فری شاپ میں سانس بھی لے آہستہ کا بورڈ آویزاں ہے۔۔"

"مطلب؟"

"وہاں شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے۔۔ ساغرو مینا اتنے نازک ہیں کہ سانس لینے سے بھی ٹوٹتے ہیں۔۔ اگر حکم کریں تو بندہ۔۔۔ ان شیشوں میں قید بادۂ رنگیں کو چھڑا لائے؟"

"تارڑ صاحب کیا بات کرتے ہیں۔۔" ضیا صاحب نروس ہو گئے "دُنیا بھر کے جرنلسٹ ہمارے ساتھ ہیں۔۔ واپسی پر رپورٹ کر دیں گے۔۔ اور یوں بھی ہم یہ شغل نہیں کرتے۔۔ آپ کرتے ہیں؟"

"اگر آپ نہیں کرتے تو ہم بھی نہیں کرتے.."

اور تب وہ بیگ کے بھاری پتھر والی پتلے بانس کی لچکیلی سیڑھی اپنی مسکراہ
فل تھراٹل دیتے ہوئے ہمارے پاس سے گذر گئی "سی یُو اِن کھٹمنڈو.."

"یہ اس نے آپ سے کہا ہے؟" ضیاء صاحب تو جیسے خفا ہو گئے۔

"ہاں..."

"اور یہ اُس نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟"

"ہاں" ضیاء صاحب چمک کر بولے "اُس نے آپ کے سفید بال' بے ڈ
جسم اور عُمر نہیں دیکھی... اندھی ہے کیا؟"

"سَر میں ایک سینئر سٹیزن ہوں.. کھٹمنڈو کی آئندہ شاموں پر میرا بھی کچھ
ہے.. اور اگر وہ اندھی ہے تو آپ جانتے ہیں کہ اندھے کو بعد میں گھر بھی چھوڑنا پڑتا
آفٹر آل ہم نے اس اندھی کا بھاری پتھر بیگ اُٹھا کر اپنی کمر رفتہ کے ٹوٹنے کا رِسک
تھا.."

خالدہ بی بی جو اپنے تئیں مجھ ایسے "دانشور" کی رفاقت میں انجائے کرنے
میری حکمت کے موتی چننے آئی تھیں مجھے اتنا دَلگر اور معمولی پا کر نہایت دِل گرفتہ
تھیں.. اُنھوں نے دھیمے لہجے میں کچھ کہا جو مجھ تک نہیں پہنچا۔

طاہرہ بی بی نے فلائٹ کے دوران مجھ پر ایک کڑی نظر رکھی تھی اور
سیڑھی پر جھکے ہوئے بہ نظرِ غائر میرا مسلسل معائنہ کیا تھا اُنھوں نے اپنی عینک درست
اور مجھ پر ایک قاہرانہ نظر ڈالی..

فاروق البتہ کُھل کر مسکرایا... اگرچہ زیرِ مُونچھ مسکرایا...

ہم اپنا سامان.. اُس ہسپانوی نویں نکور سُوٹ کیس سمیت.. جس میں اب
اشائی پینٹکس کیمرہ نہ تھا.. ٹرالیوں پر لادے.. اُنہیں دھکیلتے ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔

"بھاگ متی اور بھاگ بھری.... بڑھتی جاتی دھند ہے اور اُس کے پیچھے شہر ہے"

"یہ تو ایبٹ آباد ہے.."

"نہیں بھائی.. وہ سبزہ و گُل یہاں کہاں.. ایبٹ آباد کی تو کیا بات ہے.. ذرا جھانک
کے دیکھیں.. وہ بات نہیں ہے۔"

"یہ مری کا نچلا بازار ہے.. اگرچہ بہت بڑا ہے.."

"بھئی ہم نے ٹورسٹ بروشرز میں پڑھا ہے کہ ادھر برف ہی نہیں گرتی.... اور
یہاں وہ سہانے چرچ اور چیڑ کے درخت بھی نہیں ہیں جو برفباری کے بعد دیوانوں کے
خواب ہوئے جاتے ہیں۔ اگرچہ وادئ کھٹمنڈو سوا چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے.. تو یہ مری
نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر یہ کیا ہے؟"

"یہ کھٹمنڈو ہے..."

کھٹمنڈو کی وسعت اور وسیع شہریت مجھے پریشان کرتی تھی... جیسے میں پہلی بار
سیدو شریف گیا تھا تو وادئ سوات کے اس قصبے یا شہر میں رکشوں اور ٹیکسیوں کو دوڑتے
اور پرائم دہی' پی آئس کریم' شیزان کے جُوسوں اور برگرز اور شیکر میں شیک کی گئی لسی
اور برگر کلچر کی موجودگی سے پریشان ہوا تھا..

سیّاح ہمیشہ قصبوں اور وادیوں کو پس ماندہ اور اور جنگل دیکھنا چاہتا ہے.... کیونکہ وہ

بہت مشکل سے وہاں پہنچتا ہے.. اور جب وہ وہاں اُسی تہذیب کے مظاہر دیکھتا ہے
سے وہ فرار ہو کر وہاں پہنچتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے.. وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی مشق
رائیگاں گئی.. اگر یہی کچھ دیکھنا تھا تو وہ اپنے لاہور یا کراچی سے کیوں فرار ہوتا.. بہت
میں.. جب سیدو شریف کے بازار میں بجلی کی تاروں پر براجمان ہزاروں ابابیلوں کو
اپنے ذہن سے فراموش کرتا تھا.. میں سحری اور احمد داؤد کے ہمراہ سوات گیا.. ہم
شریف سے باہر فضا گھٹ کے پارک سے پرے دریائے سوات کے کناروں پر بلند
ہوئی ایک چٹان پر ایستادہ ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے.. ریسٹ ہاؤس کے اندر
آسائشیں تھیں کہ ہم بقیہ عُمر وہیں بسر کرنا چاہتے تھے لیکن یہ احمد داؤد کی بھیڑ
بے چینی اور وحشت تھی جو ہر صبح میرے دروازے پر دستک دیتی تھی.. "تارڑ.. باہر ہو
کی دیومالائی صبح ہو رہی ہے یار.. جاگ جاؤ"

اور پھر ہم دونوں ریسٹ ہاؤس سے اُتر کر سیدو شریف سے بحرین اور
جانے والی سڑک پر آ جاتے.. اُس سمے وہاں کوئی ٹریفک نہ ہوتی.. گہرائی میں دریائے سو
ایک مطیع اور صبر شکر کرتی گونج کے ساتھ بیدار ہو رہا ہوتا.. ابھی اُس کے کنارو
پنجاب کے میدانوں سے گرمی کے ستائے ہوئے لوگ اپنے تربوز اور آموں کی پیٹیاں
کر نہ پہنچے ہوتے.. جب ہم دونوں بحرین اور کالام جانے والی سنسان سڑک پر
دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے چلتے جاتے..

اگر ہمیں اُس لمحے جنس کا کوئی مغربی محقق دیکھ لیتا تو یقیناً ہمیں "گے" قرار
دیتا.. جو کہ ہم نہ تھے..

ہم دونوں پر صنفِ موافق کی بجائے صنفِ مخالف گہرا اثر کرتی تھی..

اور اگر ہم "گے" ہوتے تو ہرگز نہ جھجکتے اور فی الفور اقرار کر لیتے.. کہ
دونوں.. معاشرتی دباؤ کی وجہ سے جھجکنے والے نہ تھے.. اقرار کرنے والے تھے..

وہ کہتا "تارڑ... دریائے سوات جو اس سویر میں ابھی دھیما اور خاموش ہے
اُن زمانوں میں بھی تو یہیں تھا.. اور ایسا ہی تھا.. جب اس کے کناروں پر بدھ بھکشو گو
آسن میں دھونی رمائے گیان دھیان میں گُم ہوتے تھے.. اس نے سکندر یونانی کو بھی د
تھا اور محمود غزنوی کو.. اور اب ہمیں دیکھ رہا ہے.. تارڑ ہم اُن زمانوں میں کیوں

ہوئے.."

"ہم اُن زمانوں میں بھی ہوئے.. لیکن ہمیں اُن کی خبر نہیں ہے.. ہم جیسے لوگ
ہر زمانے میں ہوتے ہیں جو صرف موجود کو نہیں مانتے.. اور ہم اُن زمانوں میں بھی ہوں
گے جو آئیں گے.. اور ہمیں اُن کی بھی خبر نہیں"

وہ ہنستا.. قہقہے لگاتا.. اُس کا غیر تہذیب یافتہ چہرہ.. کبھی کسی بدھ بھکشو کی شانتی کی
جھلک دکھلاتا اور کبھی اُس میں وہ خون آشامی آ جاتی جو سکندر اور محمود کی سپاہ میں تھی۔

ہم دونوں کا مزاج ملتا تھا.. اِس میں آوارگی بہت تھی۔ ہم کسی ایک عہد' کسی
ایک زمانے پر یقین نہ رکھتے تھے..

چونکہ وہ اِس ایک عہد' اِس ایک زمانے پر یقین نہ رکھتا تھا اس لئے وہ مجھ سے
کم عُمر ہونے کے باوجود مجھ سے پہلے کسی آئندہ عہد اور آنے والے زمانے میں نکل گیا.
مومن پورہ کے قبرستان میں اُس کی قبر پر جھکے بے رُوح درختوں پر جو پرندے ہیں اور سیاہ
کوے ہیں اُن کی بیٹ اُس کی قبر کو سیاہ کرتی ہے...

ہم واپس اُس چٹانی ریسٹ ہاؤس کی آسائش میں آتے تو سحری بریک فاسٹ
ٹیبل سجائے ہمارا انتظار کر رہا ہوتا "تارڑ صاحب.. انڈہ فل فرائی پسند کریں گے یا ہاف
فرائی؟"

کھٹمنڈو سے سیدو شریف.. وہاں سے بحرین روڈ پر دریائے سوات پر ابھی تک نیم
سیاہی میں ایک سویر میں احمد داؤد تک.. اور پھر کھٹمنڈو واپس.. جہاں ہماری ٹیکسی دریائے
وشنومتی پر سے گذر رہی تھی..

"یہ وشنومتی ہے.." ڈرائیور نے کہا جو نیپال کی کسی نہایت گھریلو اور ارزاں
شراب کے مناسب نشے میں خوش ہوتا تھا۔

وشنومتی ایک نہایت اداس اور پژمردہ سانپ کی طرح آبادیوں میں گھرا بل کھاتا..
ہمارے گندے نالوں سے کہیں گندا دریا.. بمشکل بہتا تھا..

ٹیکسیاں۔ رکشے۔ کاریں۔ شاہراہیں۔ فٹ پاتھوں پر کھڑے بسوں کے منتظر نیپالی۔
ہوٹل جن کے نام ہم پڑھ نہیں سکتے تھے اور چپٹی ناکوں والی مخلوقِ خدا..

میرا خیال تھا.. اور یہ ایک اور خیالِ خام تھا.. کہ شہر کھٹمنڈو میں چند پگوڈے ہوں

گے، کچھ مندر ہوں گے، زرد لبادوں میں گنجے بھکشو ہوں گے اور اُفق پر ماؤنٹ ایورسٹ کی سفید برفیں ہوں گی اور یقیناً وہاں کچھ ہپی ہوں گے اور ہم سرِشام ذرا ٹہلنے کے لئے نکلیں گے اور ماؤنٹ ایورسٹ کے دامن تک ہو آئیں گے۔

یہ ایک ایسے سیاح کا خیالِ خام تھا جو اُن آبادیوں کو جہاں وہ بمشکل پہنچتا ہے پس ماندہ اور جنگل دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے بہت پردیس دیکھا...

دور کے دیس دیکھے...

اُن کے بارے میں اُن تک جانے سے پہلے جو کچھ تحریر میں اور تصویر میں تھا، پڑھا اور دیکھا... اُن تک جب پہنچا تو وہ، وہ نہ تھے جو میرے علم اور خواب کے خیال میں تھے، وہ ہمیشہ کچھ اور تھے..

کچھ ایسے تھے جو صرف تحریر میں اور تصویر میں ہی خوش نظر تھے..

اور بیشتر ایسے تھے جنہیں دیکھنا ہی یقین کرنا تھا۔

کوئی بھی نئی سرزمین ایک بلائنڈ ڈیٹ کی طرح ہوتی ہے..

ایک اندھی ملاقات.....

انگلستان میں.. میرے زمانوں میں اگر آپ کے کسی عزیز دوست کی گرل فرینڈ آپ کی تنہائی اور اکلاپے پر ترس کھا کر یہ آفر کرتی تھی کہ میری ایک سہیلی ہے.. اینڈ شی اِز لَولی.. تو میں اُس کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں گی تمہارے دوست کے لئے.. اور یقیناً سہیلی بھی تنہا اور اکیلی ہوتی تھی اور اتنی لَولی بھی نہ ہوتی تھی ورنہ تنہا اور اکیلی نہ ہوتی تو یہ ان دیکھی ڈیٹ بلائنڈ ڈیٹ کہلاتی تھی.. ایک اندھی ملاقات..

وہ سہیلی نہایت بھدی اور بھورے رنگ کے بالوں والی ایک صرف شراب خانوں میں خوش رہنے والی، گدلی آنکھوں والی اور ایسی موٹی ٹانگوں والی جن پر نیلی رگیں اُبھر رہی ہوتی ہیں.. بھی ہو سکتی تھی اور اکثر ہوتی تھی..

اور کبھی کبھار لاٹری بھی نکل آتی تھی.. اور وہ ایک کانچ کے بدن کی ایسی گڑیا ہو سکتی تھی جو مسکراتی تھی تو اُس کا بدن کرچیوں میں ٹوٹتا تھا اور پھر جڑتا تھا۔

اندھی ملاقات کچھ بھی ہو سکتی تھی..

نیپال بھی ایک اندھی ملاقات تھی..

میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی آنکھیں گدلی اور بے نُور سی ہیں یا اُن میں ایورسٹ کی برفوں کے کوہ نور دمکتے ہیں۔

"یہ بھاگ متی ہے.." خوش باش شراب سے پُر ڈرائیور نے کہا۔

"بھاگ متی ہے یا بھاگ بھری ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"نہیں.. بھاگ.. متی.. ہے"

بھاگ متی اور بھاگ بھری اصل میں دونوں ایک ہیں..

بھاگ متی، کھٹمنڈو کے بیچ میں بہتی ہے..

اور بھاگ بھری.. وارث شاہ کے دل میں بہتی ہے اور وارث میرے دل کے اندر ایک چناب کی طرح بہتا ہے.. جس میں سوہنی کے گھل جانے والے کچے گھڑے کی مہک بھی ہے اور میری یہ ذات بھی ہے جو کہیں بھی اپنی مٹی اور اپنے چناب سے جُدا نہیں ہوتی.. چناب میں جب سیلاب آتا تھا تو اُس کے پانی میرے دادا چوہدری امیر بخش کی کچی قبر کو چُھو کر واپس جاتے تھے اور اپنے ساتھ اُس کی کچھ کچی مٹی بھی لے جاتے تھے.. جس دریا کے پانیوں میں سوہنی کے گھڑے اور میرے دادا کی قبر کی مٹی گھلی ہو اُسے میں اپنے آپ سے کیسے جُدا کر سکتا ہوں.. قلق صرف یہ ہے کہ جس روز اجل آئے گی تو شاید اسی شہر لاہور میں آئے گی اور میری قبر کی مٹی تک چناب کے پانی نہ آ سکیں گے.. قلق صرف یہی ہے..

وارث شاہ نے اگر قصہ ہیر رانجھا بھاگ بھری کے عشق میں ڈوب کر قلمبند کیا تو اُس میں وہ وحشت عشق تھی جو اُس بھاری پتھر کو اُٹھا لیتی ہے جو اُس ناتواں سے یُوں کب اُٹھتا..

اور ہم جیسوں کی بھاگ بھریاں منتظر رہتی ہیں کہ ہم وارث شاہ ہوں اور اُن کا قصہ بیان کریں.. بے شک ملکہ ہانس کے حجرے میں گوشہ نشیں ہو کر نہ کریں.. شہرت، نام وری اور دولت کے سستے اور عارضی بازار کے بیچ بیان کریں.. لیکن کریں تو سہی..

اور ہم بیان نہیں کر سکتے..

اور ہماری بھاگ بھریاں دم توڑ دیتی ہیں..

بے شک وہ ہیر جو پیکنگ کی تتلی تھی اور سوہنی جس کا نام ہی حُسن کا آخر
اُن کی نسبت کہیں حسین اور ڈسٹ جانے والی ہوں لیکن اُن کا تذکرہ نہیں ہوتا اور
ہو جاتی ہیں.. وہ بھاگ بھریاں دم توڑ دیتی ہیں..

دریائے بھاگ متی کا پل ہم نے شتابی سے عبور کیا کہ ڈرائیور اِک دن
خمار میں تھا اور گذر گئے..

عمارتوں کی بجلی کی تاروں کے اُوپر وادی کھٹمنڈو جب کبھی دکھائی دیتی اُس پر
اور بے رُوح سی دُھند دکھائی دیتی.. اُس کے پہاڑ اس کی سفیدی میں روپوش تھے۔
میں اُن پرندوں کا ہم سفر تھا جو میری ڈار کے نہ تھے..

وہ تو نہیں جانتے تھے کہ چونچ بند کئے پَر سمیٹے یہ جو عمر رسیدہ پرندہ ہے
کے پَر جھڑنے کو ہیں اور چونچ بوسیدہ ہو چکی ہے اس کے اندر ابھی تک اُڑان کی
ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے' اس کا گھونسلا جانے کس جھیل کینجھر کے سرکنڈوں
ہے... یہ جانے رُوس کی کسی جھیل بیکال سے آیا ہے اور قطعی طور پر ایک معزز اور
پرندہ نہیں ہے.. وہ تو نہیں جانتے تھے..

ایک اور دھچکا لگا.. جیسے ایئر بس بادلوں میں جگہ بناتی ہو... اور ٹیکسی رُک گئی

ہوٹل سولتی ہالیڈے اِن..

ہماری ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ اس کے پورچ میں رُک گئی..

کھٹمنڈو کا سب سے مہنگا' نک چڑھا اور پوش ہوٹل.. ایسی قیام گاہ کہ ہم اگر ا
خرچ پانی پر انحصار کر کے ادھر آ نکلتے تو اس کا کرایہ سُن کر پتہ پانی ہو جاتا اور ہم
ہمشیرہ طاہرہ کے بس جھانک لیتے اور رُخصت ہو جاتے..

اس کے اندر وہی بے رُوح اور بے آرام کرنے والی صفائی ستھرائی تھی جو
بھر میں ایسے ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور اُس میں کام کرنے والی خواتین۔ میزبان۔ ریپشن
پر اکڑے کھڑے کلرک اور دیگر اہلکار دراصل انسان نہیں ہوتے جو آپ کو دیکھتے
بلکہ اپنے اندر فیڈ کیا ہوا ڈیٹا... فرفر۔ پٹاخ پٹاخ بولتے چلے جاتے ہیں.. سَر ہم اُمید کر
ہیں کہ آپ کا قیام خوشگوار ہو گا. سَر ہمیں اُمید ہے کہ یہاں آپ خوب انجائے کر

گے.. سَر کیا میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں.. جناب یہ رہی آپ کے کمرے کی چابی..
بیسٹ روم اِن ہوٹل سَر.. صرف آپ کے لئے.. سَر ہمارے ہاں سومنگ پُول۔ بارز..
کیسینو اور سُونا باتھ کی بھی سہولت ہے.. اور باتھ کے لئے ہوٹل کی انتظامیہ کی جانب
سے خصوصی طور پر آپ کے لئے ایک کمپلی مینٹری ٹکٹ ہے.. نو چارج.. تھینک یُو سر..
اور اس دوران آپ کے سامنے وہ ایک مرد ہو یا عورت اُس کے چہرے پر
ایورسٹ کی برفوں سے زیادہ منجمد اور مرگ صفت ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور اُس میں
اگر آپ کو اُن کے ساڑھے تیرہ دانت نمایاں نظر آ رہے ہیں تو مجال ہے کہ دس منٹ بعد
بھی اُن دانتوں کی نمائش میں آدھے دانت کی نمائش بھی کم ہو جائے..

ہوٹل سولتی کسی پاکستانی یا جنوبی امریکی ڈرگ بیرن کی سٹیٹ کی طرح بے پایاں
وسعت کا اور اس کی چار دیواری سے باہر گذرنے والے غریب دہقان کو اُس کی غربت
کے کچوکے دینے والا تھا. ہم اگرچہ دہقان تھے لیکن غیر ملکی ڈرگ بیرن نے کمال شفقت
سے ہمیں اس کے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی..

ہوٹل کا طرز تعمیر نیپال کے کوہستانی گھروں سے مستعار لیا گیا تھا جو کم از کم مجھے
اور میرے دل کو سرما کی برفوں کے اندوہناک تسلسل اور تاریکی سے بھرتا تھا' خوشی نہ دیتا
تھا..

جیسے کوئٹہ کا سرینا ہوٹل بلوچستان کی خشک اور لامتناہی کشادگی میں موسموں کی
سختیاں جھیلنے والے کچے گھروں کی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا.. اور اُن گھروں میں رہنے والا کوئی
بھول بلوچ اِس ہوٹل کے اندر جھانکنا بھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا.... کہ اُس کے ایک برس
کی کمائی اگر وہ خوشحال ہے تو یہاں ایک شب کے کرائے کے لئے بھی کافی نہ تھی.. یہاں
بھی ہوٹل سولتی کے آس پاس کوئی ایسا کوہستانی نیپالی پھڑک بھی نہیں سکتا تھا جس کے گھر
کے طرز تعمیر کو چوری کر لیا گیا تھا اور وہ صرف یہی کہہ سکتا تھا کہ.. کبھی اُن کو کبھی اپنے گھر
کو دیکھتے ہیں..

ہوٹل سولتی کے لان اتنے وسیع و عریض علاقے پر پھیلے ہوئے تھے کہ وہاں
آسانی سے ایک اولمپک کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ پھولوں کی الپائنی اور نیپالی قسموں کی بہتات
تھی.. متعدد ریستوران.. ایسے وی آئی پی سوئیٹس جن کا کرایہ اور ایک شب کا کرایہ لاکھوں

تک پہنچتا تھا اور باغوں میں جگہ جگہ جاپانی اور نیپالی طرز کے گوشوں میں مہاتما بدھ کے مجسموں کی سجاوٹ.. جو آلتی پالتی مارے اس ہوٹل کے عیش کو تکتے تھے کہ اُنہوں نے اپنے راج محل کے عیش کو اپنے گھوڑے کن تھکا پر سوار ہو کر خیرباد کہا تھا لیکن وہ مرتبہ پھر واپس لا کر ایک جدید راج محل کے باغوں میں نصب کر دیئے گئے تھے۔

ہوٹل سولتی کے باغوں میں اور نیپال کے تمام فائیوسٹار ہوٹلوں کے برآمدوں نائٹ کلبوں میں لارڈ بدھا جیسے صرف نمائش کے لئے اور ڈالروں کے حصول کے لئے کمرشل آب جیکٹ بنا دیئے گئے تھے اُس نے مُجھے دیگر سیاحوں کی نسبت زیادہ دُکھ دیا اس لئے کہ میری اور مہاتما بدھ کی ایک تاریخی رشتے داری تھی۔

میں مہاتما بدھ کے سب سے دلکش رُوپ رکھنے والے وطن' گندھارا سے تھا..

اگرچہ میرا عقیدہ.. اس عہد میں الگ تھا لیکن میں نے ایک یاتری کی طرح مقامات کی زیارت کی تھی جو مہاتما کے نام سے منسوب ہیں.. ٹیکسلا... شہباز گڑھی بائی۔ نوگرام۔ چلاس۔ گلگت' چارسدہ۔ پشاور.. جہان آباد.. غالیگے.. طوطاکان.. سری بہ نل اور کافرکوٹ... میرے پاس شگردر ستوپے کا ایک حصہ ہے جس میں مہاتما بدھ کی دفن کی گئی تھی.. میرے پاس تو مہاتما بدھ کے ایسے راز دفن ہیں جنہیں اُن کے پیروکار بھی نہیں جانتے..

میری کپل وستو کے اُس شہزادے سے بہت گُوڑھی دوستی اور شناسائی ہے جسے لارڈ بدھا کہا جاتا ہے..

یُوں بھی یہ ایک عجیب و غریب' نہ سمجھ میں آنے والا وقوعہ تھا کہ جُوں جُوں گذرتی ہے انسان مہاتما بدھ کی قربت میں آتا چلا جاتا ہے۔

نیپال اگرچہ ایک اندھی ملاقات تھی۔

لیکن اس کے اندھیاروں میں صرف دو جگنو تھے جو لَو دیتے تھے.. ایک ایورسٹ کی سفیدی اور دُوسری مہاتما کی جنم بھومی کپل وستو.. اگرچہ بہت بعد میں کُھلا کہ ہمارے ہاں پہلا بچہ ننھیال میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح ملکہ مایا مہاتما کو جنم دینے کے کپل وستو سے دُور لومبینی... گئی تھیں۔

ویسے ہم نے.. گندھارا کے باسیوں نے بدھ کو زیادہ تعظیم دی ہے..

ہم نے اُنہیں کبھی کمرشل نہیں کیا..

اگرچہ ہم اُن کے مجسموں کو سمگل کر کے اپنی قسمت بناتے تھے لیکن اُنہیں کبھی اتنے ارزاں اور بازاری نہیں کیا۔ جتنا.. ہوٹل سولتی یا نیپال نے کیا..

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے.. یا شاید میں اِسے ایک تاریخی حقیقت سمجھتا ہوں کہ.. جو کشش اور کمال بدھ کے گندھارا مجسموں میں ہے اُس کی ایک رَمق بھی نیپال۔ تبت چین اور جاپان میں دکھائی نہیں دیتی... ان کے مجسمے عقیدے کی دیومالائی فینٹسی... اِسے آپ مقامی بنیاد پرستی کہہ لیں.. کے مظہر ہیں.. اور ہمارے گندھارا کے بُت اور صنم.. انسانی حُسن کے ایسے شاہکار ہیں.. ایسے متناسب اور ستواں بدن کے.. اتنے انسانی کہ اُن کے عشق میں مبتلا نہ ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔

یہاں.. نیپال.. تبت یا چین جاپان میں.. جو بدھ کے مجسمے ہیں اُن میں خوف اور ہندومت کی دیومالائی دُوری تو ہو گی لیکن اُن میں وہ محبت اور بدن کے یونانی آثار کا طلسم کا کوئی نشان نہ ہو گا.. انسان ان کے آگے مجبور اور نہ سمجھتے ہوئے تو جُھک سکتا ہے کہ یہ خدا جانے کونسا عذاب نازل کر دے لیکن گندھارا کا بودھی ستوا ایک ایسا محبوب صنم ہے جس کے ساتھ دوستی کرنے اور اُس کے یونانی خدوخال کی محبت میں گرفتار ہونے کو جی بے اختیار چاہتا ہے..

ہوٹل سولتی میں داخل ہوتے ہوئے البتہ تین درخت ایسے تھے جو اس ظلمت کدہ میں نقش فریادی تھے..

چیری کے درخت..

شگوفے ایسے شوخ اور سلگتے دہکتے رنگوں والے کہ اُن سے نظر نہ ہٹتی تھی... جیسے آتش کدۂ ایران پھر سے روشن ہو گیا ہو اور رنگوں کے الاؤ آنکھیں چندھیاتے ہوں.. میں اگر قدیم بلخ کا کوئی آتش پرست ہوتا تو اُن کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا.. شگوفوں سے بوجھل یہ تین درخت اُن روبالس اور کمپیوٹر کی "تھینک یُو سر۔ آئی ہوپ یُو وِل انجائے یور سٹے سَر۔ تھینک یُو ویری مچ سَر" دُنیا میں تین باغی تھے جنہوں نے میکانکی جدیدیت کی اِن آسائشوں میں مدغم ہونے سے انکار کر دیا تھا.. وہ آپ کو نہیں' آپ اُن کو

"تھینک یُو ویری مچ سَر" کہتے تھے.. انکار کے باعث شاید وہ کفر کے مرتکب ہو
اور کفر ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔
یہ وادئ کالاش میں ہو یا وادئ نیپال میں..
مجھے شک ہے کہ میرے سوا ان اُبلتے ہوئے رنگوں کے تین آتش کدو
کوئی نہیں دیکھتا تھا.. اگر کوئی دیکھتا تھا تو وہ ہوٹل سولتی کے شاندار سومنگ پُول می
اور کناروں پر ٹانگیں پھیلائے کہ یہ اُن کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی گوریوں کو د
اُس قمار خانے کو دیکھتا تھا جو چوبیس گھنٹے خمار اور قمار میں مبتلا رہتا تھا.. شیشہ گری
بندوبست کو دیکھتا تھا جس کا نام اطالوی شراب خانہ تھا اور جس کا ساقی ایک بدمار
تھا.. یا پھر اُن ہندوستانی دوشیزاؤں کو دیکھتا تھا جو نیلی جینوں اور کُھلی ٹی شرٹس می
دیہاتی بدن چھپائے ماڈرن ہونے کی کوشش میں ناکام ہوتی تھیں۔
کوئی بھی ان تین درختوں کو نہیں دیکھتا تھا..
آتش کدۂ ایران روشن تھا اور سیاح اُس کے برابر میں سے گذرتے جاتے
ڈرگ بیرن کے انتظامات پرفیکٹ تھے۔ ہمارے وفد کے لئے ایک فلور پر
بُک ہو چکے تھے۔

"میرے کمرے کی کھڑکی کس منظر پر کھلتی ہے؟" میں نے کاؤنٹر کی چکنی
اپنی جانب پھسلتی ہوئی کمرے کی چابی روک کر ڈیسک کلرک سے پُوچھا۔
"جی سَر؟"
میں نے چونکہ اُس کے روبوٹ فقروں اور جوابوں سے الگ ایک سوال کر دیا
اس لئے اُس نے چونک کر "جی سَر" کہا تھا۔
"آپ نے جو کمرہ مجھے تفویض کیا ہے اُس کی کھڑکی کھولنے سے سامنے کیا نظ
آتا ہے؟"

"ہوٹل سولتی کا پورا کامپلیکس سَر.. سومنگ پُول۔ لانز.. بہترین ویو ہے سَر"
"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ عنایت کر دیں جہاں سے کھٹمنڈو کا شہ
اور وادی کی پہاڑیاں وغیرہ نظر آئیں.. اگر یہ ممکن ہے تو.."
"یس سَر.." اُس نے سومنگ پُول اور لانز کی بجائے مکانوں اور پہاڑیوں ک

خواہش کی جہالت پر مسکرانا مناسب نہ جانا کہ یہ کسی بھی کمپیوٹر کی شان کے منافی ہے۔
میں بھی ایک کمپیوٹر کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی مسکراہٹ میں صرف
ساڑھے تیرہ دانت ہی نمایاں ہو سکتے تھے۔ "اگر آپ اسی قسم کا منظر چاہتے ہیں تو.. یس
سَر"

میں اُسی قسم کا منظر چاہتا تھا..
میں اُسے تو نہیں بتا سکتا تھا کہ سَر میں تو منظروں کا ڈسا ہوا ہوں۔
میرے سَر پر ایک کوبرا سانپ کا سایہ ہے..
یہ کوبرا اُس کوبرے سے کہیں زیادہ زہرناک اور بڑا ہے جو آپ کے بھگتاپور کے
ایک خشک تالاب میں پھن پھیلائے کھڑا ہے...
آپ بھگتاپور کے تالاب میں سے بلند ہوتے اُس عظیم کوبرے کے سنہری پھن
کے سامنے سر جھکاتے ہیں جس کے پس منظر میں دور دور تک ہمالیہ کی برفیں ہیں اور میں
اپنے اُس کوبرے کا پجاری ہوں جو کہ.. منظر ہے.. میں اُسی کا ڈسا ہوا ہوں۔
فیری میڈو سے پہلی ملاقات کی رات میں رائے کوٹ گلیشئر اور برف ملکہ
نانگا پربت کی جانب سے پھونکی گئی برفیلی ہواؤں میں اگرچہ میں بھی برف ہو گیا تھا اور سو
نہ سکا تھا لیکن میں نے جان بُوجھ کر مولوی رحمٰن کے مشوروں کے باوجود وہیں، فیری میڈو
کے بلند ترین مقام پر خیمہ اسی لئے نصب کیا تھا کہ اُس کے دروازے کا پردہ اُٹھتا تھا تو
مجھے نانگا پربت کبھی پہلی کرنوں کے سفید پگھلتے سونے میں اور کبھی آخری شعاعوں کے
تانبے میں ڈھلتی نظر آتی تھی..
مجھے منظر دکھائی دیتا تھا۔

اطالیہ میں دریائے آرنو کے کنارے جو پہاڑی خیمہ گاہ تھی اُس کی ڈھلوان
صرف اس لئے خالی تھی اور آس پاس بے شمار خیمے دُبکے ہوئے تھے کہ وہاں رات کو ہوا
بہت تیز ہو جاتی تھی اور خیمہ ملیریا بخار میں مبتلا مریض کی طرح بے تحاشا کپکپانے لگتا تھا
لیکن میں نے اپنا خیمہ وہیں نصب کیا.. وہاں سے مائیکل اینجلو کا شہر فلارنس۔ ڈومو اور
مونالیزا کی مسکراہٹ پردے کے پار دکھائی دیتی تھی.. میں وہاں بھی اگرچہ بہت بے آرام
ہوا.. اور بہت صدیاں پہلے.. لیک ڈسٹرکٹ میں جھیل ونڈر میر کے کنارے.. جھیل جنیوا کی

بلندی پر۔ روم اور سٹاک ہوم میں.. بلیک فارسٹ کے کنارے اور پیرس میں،
جب بھی خیمہ لگایا تو اُسے ایسے لگایا کہ اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹے ہوئے... ؤ
دکھائی دے.. اگرچہ رات بے آرامی میں کروٹیں بدلتے گذرے.. صرف منظر کے۔
منظر کا ہی یہ پھنیر سانپ ہے۔ کوبرا ہے.. جو مجھے اُن موسموں میں ڈستا۔
برفیں پگھلتی ہیں۔ یہی میرے بدن میں وہ زہر بھرتا ہے جو عمر اور وقت پر حاوی
ہے...

رائیڈر ہیگرڈ کے کردار عائشہ کو مقدس آگ میں بھسم ہو کر پھر سے جو
ہے، عمر اور وقت فنا ہو جاتے ہیں.. اور مجھے منظر کا ناگ ڈستا ہے تو میں ایک نئی ز
ہوں اور پھر سے نواں نکور ہو جاتا ہوں۔ وہ آگ میں جل کر نوخیز ہوتی تھی اور میر
کے زہر سے ڈسے جانے کے بعد.. عمر۔ خاندان۔ معاشرے اور آس پاس سے لاپروا
زمانے کی آوارگی میں مست اور جوان ہو جاتا تھا۔

میرے سر پر منظر کے کوبرا سانپ کا سایہ ہے..

میں اُن پرندوں کی ڈار میں سے نہ تھا جو سولتی ہالیڈے اِن ہوٹل میں گھو
کر. بلکہ ایک ریڈی میڈ گھونسلے میں اُتر کر چہچہانے لگتے ہیں.. بلکہ مجھے تو آوارگی
تنکے چن چن کر کسی منظر کے سامنے اپنا گھونسلا بنانا تھا.. شاید ماؤنٹ ایورسٹ کے سا
شاید اناپورنا کے دامن میں..

مجھے تو سمندری پرندے، لونگ سٹون سی گل کی مانند حدوں کو عبور کرتے
جانا تھا.. شاکیہ شہزادے، سدھارتھ گوتم کی جنم بھومی لومبینی تک پرواز کرنا تھا جہاں
بھی اشوک اعظم کا نصب کردہ... آج سے بائیس سو برس پیشتر کا نصب کردہ وہ سٹون م
ہے جو اشوک نے اُس مقام کی زیارت کرنے کے بعد وہاں ایستادہ کیا تھا جہاں گوتم بدھ
سے 1998ء سے چھبیس سو تیس برس پیشتر پیدا ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہاں اشوک
قدموں کے نشان آج تک موجود ہیں جیسے حسن ابدال میں گورونانک کے ہاتھ کا نشان "
صاحب" موجود ہے۔ وہ پسکارنی نام کا تالاب اب بھی موجود ہے جس میں آس پاس
برفوں کے سائے سفید عکس میں لرزتے ہیں جس میں ملکہ مایا نے مہاتما کی پیدائش
پہلے غسل کیا تھا۔

میں نے کلورکوٹ کے کھنڈروں میں کسی ایسے پتھر کو چھو کر دیکھنا تھا جو اُس
مشرقی دروازے کا ایک حصہ تھا جس میں سے مہاتما اپنی راجدھانی کو تیاگ کر اپنے
گھوڑے پر سوار باہر آیا تھا۔

اور مجھے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک پہنچنا تھا اور نیشنل پارک کی سویر میں سفید
گینڈوں کی نایاب نسل اور نیپالی ٹائیگرز کو دیکھنا تھا۔ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر.

پھورا جھیل کنارے ایک رات کرنی تھی..

نگر کوٹ میں طلوع آفتاب پر موجود ہونا تھا جب ماؤنٹ ایورسٹ اور اے ہمالہ
اے فصیل کشور ہندوستان پر پہلی کرن اُترتی ہے اور پھر وہ دھیرے دھیرے روشن ہوتی
چلی جاتی ہے۔

میں اُن پرندوں میں سے ہرگز نہیں تھا جو سولتی ہالیڈے اِن ہوٹل کے ریڈی
میڈ گھونسلے میں اُتر کر چہچہانے لگتے ہیں۔

لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میں اُنہی پرندوں میں سے ہوں...

کمرہ نمبر ۵۵۰ کی چوکور کھڑکی سے پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا...
بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اُس کے پیچھے شہر ہے۔
بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اُس کے پیچھے شام ہے۔
دُھندلے دُھندلے لوگ ہیں اور باغ ہیں اور شام ہے۔

اگرچہ ابھی دوپہر تھی لیکن بڑھتی جاتی دُھند، کھڑکی سے پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا،
وادی کھٹمنڈو پر تھی اور لگتا تھا کہ شام ہے۔

میں نے بہت دیر اس منظر کو اپنے اندر جذب کیا..

یہ دل کو سکھ دینے والا تھا..

اس میں اجنبیت کی رعنائی، پہلی نظر کی گرویدگی اور دل ربائی تو تھی لیکن... منظر
کے اس کوبرے میں وہ زہر ہرگز نہ تھا جو مجھے ڈس کر شانت کر سکے... جیسے بلونت سنگھ کے
کردار گاؤں سے باہر رُوڑھی کی دیسی شراب پی کر بدمست ہوتے تھے اور اُن پر کوئی اور
بڑھیا سے بڑھیا درآمد شدہ شراب اثر نہیں کرتی تھی اسی طور... میں نے پاکستان کے

ے خانۂ شمال کی جو تیز اور تیکھی شراب چکھی تھی اُس کے بعد مجھ پر اس تہذیب
نیپالی منظر کی مے اثر نہ کرتی تھی۔

شاید یہ اپنے محبوب کیمرے کی جدائی کا سوگ تھا کہ مجھے کوئی منظر بھی بھلا
تھا کہ میں اُسے صرف دیکھ سکتا تھا' محفوظ نہ کر سکتا تھا۔

شاید میں اُس عاشق کی مانند تھا جسے شاہ گوری کی گوری برفوں پر اُبھرتی
دھوپ' سنولیک پر رواں بادبانی کشتیوں اور جھیل کرومبر کے پانیوں میں اُترنے کی
ہو چکی تھی اور اب مجھے اُن کے سوا اور کچھ بھلا نہ لگتا تھا۔

اگرچہ یہ زیادتی تھی۔۔

گلگت کے منظر کو دیکھ کر۔۔ راکاپوشی کا خیال نہیں آتا تھا۔

سکردو موٹل میں براجمان ہو کر۔ شاہ گوری اور سنولیک کا گمان بھی نہ ہوتا تھا
تو کھٹمنڈو میں بیٹھ کر بھی۔۔ تو ایورسٹ اور اناپورنا کا خیال یا گمان نہیں ہو سکتا
اور اس کے باوجود۔۔

میرے سامنے بڑھتی ہوئی دُھند تھی۔۔ اور اُس کے پیچھے شہر تھا۔۔

میں نے اپنے ہسپانوی سُوٹ کیس کو کھولا۔۔۔ جیسے محمود غزنوی کا ایاز ہر شب
پُرانا صندوق کھول کر اُس میں پوشیدہ اپنی گڈریا پوشاک دیکھ کر اپنے حال کی شہنشاہی
اپنے ماضی کو فراموش نہیں کرتا تھا۔۔

میں نے بھی اپنی معزز پوشاکوں تلے پوشیدہ اپنی کوہ نوردیوں اور آوارگی
گڈریا لباس نکالے۔۔ سنو جیکٹ کی نیلاہٹ کو اپنے بدن سے آشنا کیا۔۔ اور پاؤں میں جو
پہن کر اُن کے تسمے باندھنے لگا۔

یہ مجھے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک لے جائیں گے۔

لارڈ بدھا کی جائے پیدائش تک لے جائیں گے۔۔۔

یہ مجھے اپنے آپ تک لے جائیں گے۔۔

"کھٹمنڈو کا دھوکا دربار... جھانک لینے میں کیا حرج ہے"

ایئربس کے جھٹکوں۔۔ نیپالی مزدوروں کی بُوئے بدنی اور میڈم شرما کی لچکیلی بانس
کی سیڑھی مسکراہٹوں کے درمیان ہم پانچوں نے یہ طے کر لیا تھا۔۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق
تھا۔ شاید حُسن اتفاق تھا کہ ہم پانچ تھے۔۔ یعنی پنجہ صاحب بھی تھے۔۔۔ عجیب اتفاق تھا۔۔ تو ہم
نے طے کر لیا کہ کل سے تو سیمینار کی قید شروع ہو جائے گی چنانچہ صرف آج کا دن ہے
جس میں ہم کھٹمنڈو یاترا کر سکتے تھے۔۔

چنانچہ ہم پانچوں لنچ کے بعد کمربستہ تھے۔۔ اگرچہ اُن میں صرف میں تھا جو کمر شکستہ
تھا۔۔

نئی نئی آشنائی تھی اس لئے ہر کوئی چوکنا اور احتیاط پسند تھا۔۔

البتہ لنچ کے دوران ایک سانحہ ہو گیا۔

میں کھانے سے فارغ ہو کر ایک نہایت بدذائقہ سویٹ ڈش نگل رہا تھا جب
طاہرہ ہمشیرہ۔ منظر پر طلوع ہوئیں۔۔ پہلے اُن کی عینک طلوع ہوئی اور پھر اُن کا ورود ہوا۔۔۔

"تارڑ صاحب۔۔ ہم بھی ذرا کھانے کی جانب جھانک لیتے ہیں لیکن آپ نے کیا کیا
کھایا ہے؟؟"

"جناب میں نے ایک بے رُوح اور بے سُرا چکن کھایا ہے۔۔ مٹن گوشت نوش
کیا ہے جو شاید ربڑ گوشت تھا۔۔ جلی ہوئی ایک چپاتی کھائی ہے۔۔"

"آپ نے۔۔" طاہرہ ہمشیرہ نے ایک دردناک ہچکی بھر کر کہا اور اس ہچکی کے زد

سے اُن کی عینک ناک پر سرک آئی "آپ نے گوشت کھایا ہے؟"

"ہاں.."

"حلال ہے؟"

"جی؟" میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ "وہ پتہ نہیں"

"حرام کھا گئے؟"

"نہیں جی.. قطعی طور پر نہیں جی.."

"تارڑ صاحب.. آپ نیپال میں ہیں۔ چیک تو کر لیتے... اِدھر جھٹکا ہوتا ہے۔"

"یعنی ادھر..."

"ہاں جی.. چکن کا ٹینٹوا دبا کر اُسے ہلاک کیا جاتا ہے اور بھیڑ بکری کی گردن کر اُنہیں جاں بحق کیا جاتا ہے.. آپ چیک تو کر لیتے.."

یہ حلال اور حرام کا قصہ بہت پُرانا تھا۔

یہ اُسی پنکھوں والے جہاز سپَر کانسٹلیشن کی اُسی پرواز کا قصہ ہے جو انگلستان راستے میں قاہرہ رکی تھی اور اُس کا اگلا سٹاپ روم تھا۔

اور روم میں ایک اطالوی دوپہر تھی.. گرم بھی سنسناتی ہوئی بھی۔

کراچی میں فلائٹ پر سوار کرتے ہوئے میری کم عُمری کی وجہ سے مجھے مولوی صاحب کے حوالے کر دیا گیا تھا حالانکہ کم عُمری اور مولوی صاحب کو یکجا کر دینا ہی ہے جیسے گیدڑ کو خربوزوں کی راکھی پر متعین کر دینا۔ والد صاحب نے کہا تھا "مو صاحب بچہ ہے۔ راستے میں خیال رکھئے گا" اور اُنہوں نے یہ خیال اس طرح رکھا کہ مختلف ایئرپورٹس پر اُن کے لینڈنگ فارم بھرتا رہا' اُنہیں راستے بتاتا رہا کیونکہ وہ انگر سے ناواقف تھے اگرچہ انگلستان میں گوروں کو تبلیغ کرنے جا رہے تھے اور جب میں دریافت کیا کہ آپ گوروں کو تبلیغ کیونکر اور کیسے کریں گے کہ وہ تو صرف انگریزی جا ہیں تو انہوں نے نہایت تیقن سے کہا تھا' اللہ تعالیٰ سبب پیدا کر دے گا۔

تو روم ایئرپورٹ پر اُترتے ہی ہمیں لنچ کوپن ایشو کئے گئے تاکہ ہم ایئرپو ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا تناول فرما لیں.. اب جو ویٹرس حصے میں آئی وہ انگریزی نہیں جانتی تھی چنانچہ مینو کارڈ پر جہاں "پُولے" کا لفظ دیکھا اُس پر اُنگلی رکھ دی کہ لا

میں ہوٹل بازی کے دوران میں جان چکا تھا کہ چکن کو فرانسیسی میں پُولے کہا جاتا ہے..

مولوی صاحب نے مینو پر سے جھانکتے ہوئے مجھے پوچھا "برخوردار کیا منگایا ہے؟"

"مُرغی کا آرڈر دیا ہے مولوی صاحب"

"حلال ہے؟"

میں گڑبڑا گیا کہ عُمر کی نوخیزی تھی' پاکستان سے باہر پہلا قدم تھا اور اُن دنوں باہر ابھی کم کم پاکستانی قدم رکھتے تھے "پتہ نہیں جی.."

"تم میرے لئے سبزی کا آرڈر دے دو لیکن تلی ہوئی نہ ہو۔ اُبلی ہوئی ہو"

میں نے بمشکل ویٹرس کو... تلی ہوئی نہ ہو' اُبلی ہوئی ہو.. کا فرق اشاروں کنایوں میں سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد ریسٹوران میں ایک ٹرالی داخل ہوئی جس پر ایک سلور ٹرے میں ایک پورا چکن ابھی تک سلگ رہا تھا اور اُس کے گرد رسیلی سبزیوں کے انبار تھے اور طرح طرح کے ساس اُس کی سنہری جلد کو پگھلاتے ہوئے ہمارے بھُوکے نتھنوں میں ایک ایسی پاگل مہک پہنچاتے تھے کہ ہمارا بس چلتا تو ہم ٹرے کے اپنے تک پہنچنے کا انتظار نہ کرتے بلکہ شُوٹ لگا کر اُسے راستے میں ہی جا لیتے اور سالم ہڑپ کر جاتے.. خدا خدا کر کے وہ گرم شُوں شُوں کرتی لذت ہماری ٹیبل تک آئی اور اُسے میرے سامنے سجا دیا گیا۔ پھر ویٹرس نے اُسی ٹرالی کے نچلے خانے میں سے ایک چھوٹی سی پرچ نکالی اور مولوی صاحب کے سامنے رکھ دی۔ اُس پرچ میں حسب آرڈر دو تین پژمردہ سے گاجروں اور آلوؤں کے قتلے اور چند مٹر.. مٹرگشت کرنے کو تھے..

میں نے چکن چکھا تو وہ میرے بھُوکے حلق میں ہر جانب زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا گھل گیا۔ مولوی صاحب نے مٹروں کے دو دانے مُنہ میں ڈالے.. انہیں بمشکل نگلا اور پھر کہنے لگے "برخوردار یہ چکن کیسا ہے؟"

میں نے شرمندہ ہو کر اقرار کیا کہ سَر نہایت سُریلا اور ذائقے دار ہے..

کہنے لگے "ویسے یہ شکل سے حلال لگتا ہے.. میرے لئے بھی یہی آرڈر کر دو"

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب یورپ میں تو بمشکل کوئی پاکستانی یا مسلمان ہوتا تھا اور انگلستان میں صرف میرپور کا گاؤں آباد تھا اور اہل کتاب کا گوشت حلال ہی سمجھا جاتا تھا.. کوشر میٹ اور اسلامی ذبیحہ کا کانسپٹ ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی نوخیزی اور

جہالت کے دن تھے لیکن اب تو میں جہاندیدہ گرگ اور بنیاد پرست ہو چکا تھا لیکن
خیال ہی نہ رہا تھا.. میں تیئس برس بعد گھر سے نکلا تھا اور میرے ذہن میں ہی نہیں
کہ گوشت کسی اور قسم کا بھی ہو سکتا ہے.. اس حرام وقوعے کے بعد میں نے اپنی تو
توجہ سبزیوں اور دالوں پر ہی مرکوز رکھی لیکن اُن کی کوالٹی بھی ایسی تھی کہ چند نو
نگلنے کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی تھی.. اُن میں کسی ایسے تیل کی بُو تھی جو شاید وہی
نیپالی بھائیوں نے کھٹمنڈو فلائٹ کے دوران اپنے سروں پر تھوپ رکھا تھا.. چنانچہ اکثر
کی طرف رجوع کیا جاتا.. لیکن اُن کی سبزیاں بھی پژمردہ اور ڈھیلی اور بے کیف ہو
پاکستانی ترکاریوں کی طرح اُن کے ذائقے تازہ اور ہرے نہ ہوتے اور نہ اُن کے رنگ
میں تازگی کا نکھار ہوتا..

چنانچہ ابھی ہم پانچوں کھٹمنڈو کی سیر کے لئے کمربستہ تھے اور صرف میں تھا جو
کی وجہ سے کمر شکستہ تھا..

نئی نئی آشنائی تھی اس لئے ہر کوئی چوکنا اور احتیاط پسند تھا..

"میں ابھی حال میں ہی.. یعنی صرف سترہ برس پیشتر کھٹمنڈو آ چکا ہوں اس
میں آپ کو آج کی شام گائیڈ کر سکتا ہوں.." ضیاء صاحب نے پیشکش کی۔

چونکہ ہم میں سے کوئی بھی حال ہی میں یا ماضی میں بھی کھٹمنڈو نہیں آیا تھا
لئے ہم سب نے اُنہیں ایک ایسے پیر و مُرشد کی طرح عقیدت سے دیکھا جو ہا
راہبر و راہنما ہو سکتا تھا اور سب جانتا تھا.. یُوں بھی ضیاء صاحب کی داڑھی... اُن
گولڈن بیرڈ ایک "میوٹنی آن دی باؤنٹی" کے ملاح کی طرح چمکتی تھی اور ہم سب بے
متاثر ہوئے جب اُنہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا کہ... نیو روڈ چلے گا..

منیر نیازی صاحب بے حد خود پسند ہیں.. اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اور جیسا وہ کہ
ہیں اُنہیں خودپسندی کا حق حاصل ہے.. ایک تخلیقی فن کار خود کو ناپسند کیسے کر سکتا ہے.
انہوں نے مختلف ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کو کچھ نام دے رکھے ہیں جو قدرے ظالمانہ
ہیں لیکن ایسے ہیں کہ یادداشت کے ساتھ چپک جاتے ہیں تو اُنہوں نے بابا ظہیر کاشمیری
کو جنہیں خبر تھی کہ وہ چراغ آخر شب ہیں اور اُن کے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے اُن کی
سنہری فرنچ کٹ داڑھی کی نسبت سے اُنہیں "سنہری بچھو" کا خطاب دیا تھا..

ظاہر ہے میں ضیاء صاحب کی گولڈن بیرڈ کے حوالے سے اُنہیں یہ خطاب دے
کر گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن.. اُنہیں سنہری بابا کہنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا..

ضیاء صاحب نے اگرچہ ہوٹل سولٹی کے پورچ میں ٹیکسی ڈرائیور کو "نیو روڈ
چلے گا" کا حکم دے کر ہمیں متاثر کر لیا تھا لیکن ٹیکسی ڈرائیور ہرگز متاثر نہ ہوا اور ایک
بڑا سا تاثر نما منہ کھولے ہمیں دیکھتا رہا..

ضیاء صاحب نے پہلے تو اپنی انگریزی جیسی بھی تھی آزمائی پھر تنگ آ کر اپنے
پشاوری لہجے میں کہنے لگے "اوئے کافر کے بچّے چلے گا؟"

اور حیرت انگیز طور پر کافر کے بچّے نے پہلے تو زور زور سے سر ہلایا اور جواب
میں ایک انگریزی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ ہندوستانی۔ اردو اور شاید پنجابی میں بھی ایک ایسی
لمبی تقریر کی کہ اُسے فل سٹاپ لگانا مشکل ہو گیا۔

"چُپ کرو یارا.." ضیاء صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

یارا فوراً چُپ ہو گیا۔

"چلے گا؟"

"کہاں چلے گا؟" اُس نے پُوچھا "دھوکا دربار چلے گا؟"

"دفع کرو جی.." طاہرہ بی بی نے عینک اور ناک بیک جنبش چڑھائی "یہ ہم سے
دھوکا کر رہا ہے.. ہم نہیں جاتے کسی ایسے دربار میں جہاں دھوکا ہوتا ہو"

"ویسے دُنیا میں کونسا ایسا دربار ہے جس میں دھوکا نہیں ہوتا ہمشیرہ..."

ہمشیرہ کے مرتبے پر فائز ہوتے ہی طاہرہ بی بی نہایت خوش ہوئیں اور مجھے پہلی
بار توقیر کی نظر سے دیکھا..

"یارا ہم نیو روڈ جائے گا.." ضیاء صاحب نے پھر اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کیا۔

"چلے گا"

ہم سب ٹیکسی میں سوار ہو گئے..

وہ ٹیکسی جس میں ٹریفک رُولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہم پانچوں سوار تھے
اُن آتش کدۂ ایران کے سلگتے سُرخ شگوفوں والے درختوں کی قربت میں سے ہو کر نکلی
جن کو صرف میں دیکھتا تھا..

ڈرائیور ہمیں پھر نیو روڈ کے صراط مستقیم سے ہٹانے کی کوشش میں جٹ

"اچھا اچھا تو آپ پشوپتی ناتھ چلیے گا.. سب لوگ اُدھر جاتا ہے.."

"یہ.. یہ کونسے ناتھ ہیں؟" فاروق نے مُونچھوں کو ایک بے وجہ بل دیا۔

"یہ تو ہندوستان سے آنے والے ہندو لوگ کا سب سے بڑا مندر ہے.. آپ ہ
ہیں ناں؟"

"لاحول ولا.." طاہرہ بی بی اپنے عقیدے پر یہ براہ راست یلغار برداشت نہ
سکیں "ہندو ہوں گے تمہارے ہوتے سوتے.."

"ہم تو ہندو ہیں.." ڈرائیور نے دانت نکال کر کہا کہ ہم ہیں جو کچھ کرنا ہے کر
اور مت بھولو کہ تم ہمارے دیس میں ہو اور نیپال دُنیا کی اکلوتی ہندو سلطنت ہے..

طاہرہ بی بی عرف ہمشیرہ فوراً بیک آؤٹ کر گئیں.. "اللہ آپ کو ہندو ہونا مبار
کرے.. ہم بھی کسی زمانے میں شاید ہندو ہوا کرتے تھے لیکن اب اللہ کے فضل
مسلمان ہیں.."

"تو مسلمان پشوپتی ناتھ جی کو نہیں مانتا؟.. کیسا مسلمان ہے" ڈرائیور اداکا
نہیں کر رہا تھا اُس کی حیرت بجا تھی۔ جیسے ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص
صاحب.. پیر عبدالقادر جیلانی یا امام رضا کو کیسے نہیں مان سکتا۔ اُس کی سمجھ میں یہ نہ
آرہا تھا کہ کوئی پشوپتی ناتھ جی کو کیسے نہیں مان سکتا بے شک وہ مسلمان ہو..

"ہم کسی بھی ناتھ وغیرہ کو نہیں مانتا.. لیکن یہ ہیں کون.." خالدہ سرگوشی' سرگ
میں بیدار ہوئیں۔

"پشو کا مطلب ہے جانور.. جانتا ہے..؟"

سب نے انکار میں سر ہلایا لیکن میں نے اجتناب کیا.. صرف اس لئے کہ میں جا
تھا.. بچپن میں جب میری بڑی خالہ جان ہمیں جھانویں سے رگڑ رگڑ کر اور کانوں میں دُ
تک انگلیاں چلا کر لائف بوائے صابن کو مُنہ اور آنکھوں میں بھی لگا لگا کر گاؤں کے گھڑ
کُھرے میں نہلاتی تھیں تو ہمیشہ کہتی تھیں "تم پشو ہو یا بندے ہو اتنے گندے ہو"

اور خالہ جان کی ایک رگڑائی نہلائی کے بعد بچہ صاف ستھرا اور ٹش ٹش کر
لگتا تھا.. اُس کے کان لمبے ہو جاتے تھے.. اور بدن پر اتنی خراشیں ہوتی تھیں کہ وہ اُلٹ

آفٹر شیو لوشن لگانے کا رِسک نہیں لے سکتا تھا..

"یہ جانور لوگ کا بھگوان ہے.. بندر لوگ کا.. بھینس کا اور گئو ماتا کا.. اور یک
لوگ کا"

"اوئے تمہیں ہم سب کی شکل میں کہیں کوئی اس قسم کے پشو کا شکل دکھائی دیتا
ہے کہ ہمیں اس قسم کے بھگوان کی ضرورت ہے" ضیاء صاحب تاؤ میں آ گئے "بس تم
ہمیں نیو روڈ لے چلو.."

ٹیکسی ڈرائیور پھر بھی پشوپتی ناتھ جی کے گن گاتا رہا "اُدھر ہندوستان سے بڑا بڑا
سیٹھ آتا ہے اور لاکھ روپے دان کر کے کہتا ہے کہ ہماری طرف سے روزانہ پشوپتی ناتھ
جی کو گائے کے دودھ میں نہلاؤ.."

"تم بھی درشن کو جاتے ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"صاحب پیسے والا لوگ درشن کو جاتا ہے.. ہم غریب لوگ ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھا
بیٹھا پرنام کر لیتا ہے.. صاحب ہمارے پاس اتنا دودھ ہو تو ہم بھگوان کو نہلانے کی بجائے
اپنے بچوں کو پلائے...."

اس ڈرائیور پر اگرچہ ہتک پشوپتی ناتھ جی کا مقدمہ دائر ہو سکتا تھا لیکن شاید
نیپال میں اس قسم کا کوئی قانون نہ تھا ورنہ ہم فوراً رپورٹ کر دیتے..

حیرت ہے.. ہندوؤں میں بھی بے دین اور ملحد عناصر پائے جاتے تھے..

ٹیکسی دریائے بھاگ متی کے پل پر سے گذر کر ذرا اونچائی پر پُرانے شہر کے گلی
کُوچوں میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئی..

ہم دم بخود تھے کہ ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنی تنگ گلیوں میں' موچی دروازے
اور ہیرامنڈی کی گلیوں میں سے کوئی ٹیکسی یا کار بھی گذر سکتی ہے..

یہ علاقہ میرے لئے نہایت نایاب' دلکش اور دل پذیر تھا اور میرے عقیدے کے
لئے نہایت مخرب الاخلاق تھا۔ یہاں بھی جگہ جگہ بھگوان اور بھگوانیاں آسن جمائے بیٹھے
تھے اور کتنے بھلے لگتے تھے.. اور اُنہیں دیکھ کر میرے اندر کا ہندو کروٹیں لیتا تھا اور چاہتا
تھا کہ اُن پجاریوں میں شامل ہو جائے جو اُنہیں زعفرانی چاول اور دُودھ بھینٹ کر رہے
تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو ہماری خیریت نیک مطلوب تھی اس لئے نیپالی ٹیکسی ڈرائیور ذرا

دھیرج سے اور تحمل سے ٹیکسی چلاتے تھے.. اگر ان گلیوں میں کوئی پاکستانی ڈرائیور آ
اُس کی گردن پر ہمارے علاوہ درجنوں بھگوانوں کا خون ہوتا۔

ٹیکسی نیو روڈ کے چوک میں کھٹمنڈو کی شام میں رُکی.....

لیکن اس سے پیشتر ہماری ناقص عقل میں یہ نہ آتا تھا کہ اتنے تنگ راستو
یہ ڈرائیور مندروں۔ دیوی دیوتاؤں اور لوگوں کو بچاتا ہوا کیسے گذرتا ہے۔

ویسے میں نے اہل کھٹمنڈو کو نہایت ملحد اور بے دین پایا۔

یہ سب کے سب ایئرپورٹ والے ٹورسٹ خان صاحب کے بقول سب
سب کافر کے بچے تھے اور اُن کی بخشش کا کوئی امکان نہ تھا۔

ٹیکسی میں سے مَیں دیکھتا تھا کہ وہ اپنے پتھر کے خداؤں کے سامنے نذر نیاز
تھے اور سر جھکاتے تھے..

میرے لئے یہ ایک شدید قسم کا کلچرل شاک تھا..

میں اپنے تئیں ایک صاف ستھرے نتھرے ہوئے وحدانیت پر مقیم یقین
والے معاشرے سے آیا تھا.. اور یہاں خداؤں کی کلیئرنس سیل لگی ہوئی تھی۔ کہیں
دیوی گلے میں کھوپڑیوں کا ہار سجائے براجمان ہے.. کہیں مہاراج گنیش اپنی سونڈھ لہرا
ہیں اور کہیں ہنومان جی اپنی دُم اُٹھائے کھڑے ہیں اور کہیں.. خواتین اُس لنگ کو چُ
ہیں.. بوسے دیتی ہیں۔ پھُول چڑھاتی ہیں اور تیل بھینٹ کرتی ہیں۔ وشنو مہاراج کے
ایستادہ لنگ کو جس کا تذکرہ ہم پاکیزہ رُوحوں کے لئے ممنوع ہے..

چنانچہ ٹیکسی رُکی اور ہم نیو روڈ کے روشن جگمگاتے چوراہے میں اُتر گئے۔

البتہ میں یہاں ایک تصحیح کرنا چاہتا ہوں.. ٹیکسی ایک نہ تھی.. دو تھیں۔ اَ
میں کہہ چکا ہوں کہ ہم پانچوں ٹریفک کے رُولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ہی
میں سوار ہوئے تھے لیکن.. یہ تو ہماری پاکستانی خواہش تھی کہ اسی طرح گذر اوقا
جائے لیکن بے دین ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا..... ویسے بھی ایک ہی ٹیکسی میں گذر
کرنے کی خواہش کی زد میں عمدہ اخلاقیات بھی آتی تھیں.. ایک ٹیکسی میں.. ہم
ہم پہلو اور ہم آغوش ہو سکتے تھے.. ذرا جڑ کر بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ
تھیں.. خالدہ سرگوشی تھیں اس لئے ہمارے لئے اس قسم کی غیر شرعی اور غیر محرم رفا

ممکن نہ تھی.. اور یہ ہماری خواہش بھی نہ تھی۔
اس لئے دو ٹیکسیاں تھیں جو نیو روڈ کے چوراہے پر رُکیں۔

"کتنا پیسہ؟" ٹیکسی سے اُترتے ہوئے خالد صاحب نے اپنی سنہری داڑھی پر ہاتھ
پھیرا..

"پچاس روپیہ" جواب آیا..

ہم نے اُسے پچاس روپے نیپالی عطا کئے تو ڈرائیور جو ابھی تک اس ناسمجھی میں
تھا کہ یہ لوگ پشوپتی ناتھ جی کے مندر کی یاترا کو کیوں نہیں گئے کہنے لگا "آئی سی.."

ہم نے کہا "بالکل آئی سی.. بلکہ یُو سی.." ہم بھلا انگریزی بولنے میں پیچھے رہ سکتے
تھے اور آئی سی یُو سی کا مطلب نہیں جانتے تھے۔

لیکن وہ ملعون مسلسل بضد رہا "نہیں.. آئی سی.. آئی سی"

بالآخر یہ کھلا کہ نیپال کی راجدھانی میں ایک تو اُن کا اپنا نیپالی سکّہ روپے کی
صورت میں چلتا ہے اور اُس کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی روپیہ بھی رائج اور افضل ہے
جسے.. آئی سی. یعنی انڈین کرنسی کہا جاتا ہے... اِس آئی سی بحث کے بعد سنہری بابا جہاں بھی
جاتے 'کسی دوکان' ہوٹل یا فٹ پاتھی بازار میں تو کسی نہ کسی شے کی جانب اشارہ کر کے
بہ آواز بلند پُوچھتے.. آئی سی میں کتنا؟.. ہم پوچھتے آپ خریدتے تو کچھ ہیں نہیں پُوچھتے کیوں
ہیں؟ کہتے 'پُوچھنے میں کیا حرج ہے..

نیو روڈ کے چوک میں ملحدین اور کافرین کی ایسی زبردست رونق تھی کہ ہم دنگ
رہ گئے.. "اب کدھر جائیں؟"

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر
جائیں گے.." سنہری بابا نے ایک بلند آہنگ قہقہہ داغتے ہوئے جواب دیا۔

ہم اس شعر اور اس قہقہے کے معانی کی گہرائی تک ہرگز نہ پہنچ سکے.. سنہری بابا کو
غالب کوٹ کرنے کا خبط تھا اور یہ خبط ہمیشہ بے موقع ہوتا۔

"ادھر یہ سامنے ہنومان دھوکا ہے تارڑ صاحب' کھٹمنڈو کے قدیم مندروں کا سب
سے بڑا مجموعہ... اِدھر چلتے ہیں"

یعنی ہمارے ساتھ پھر دھوکا ہو گیا تھا..

"کدھر چلتے ہیں؟" خالدہ سرگوشی جو حسب عادت یا روائت گُم سم تھیں کر بولیں..

"ہنومان دھوکا..."

"نہ جی.." طاہری دی گرل گائیڈ جو آج صبح تک محض ایک عام سی گرل تھیں اپنی عبادت گذاری اور خوشگوار کلامی کے باعث اب ہمشیرہ کے رُتبے پر فائز تھیں اُنہوں نے سر ہلا کر "نہ جی" کہا۔

"کیوں نہ جی؟" فاروق نے فوراً کہا کہ وہ نیو روڈ کی چہل پہل میں ایک کرنٹ کی طرح دوڑتی زندگی کی گرفت میں آچکا تھا۔

"ہمیں کسی قسم کے کافرانہ دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔ اپنا ایمان سلامت بے حد امپارٹنٹ ہے.."

"یا تو آپ اپنا ایمان سلامت رکھئے یا اسے کھٹمنڈو کے دھوکے میں آکر پر

"چلئے یہ دھوکا بھی کھا کر دیکھتے ہیں..." ہمشیرہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے پسِ عینک اُن کی آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ ہماری ٹانگ کھینچ رہی ہیں.. انہوں نے اس کا نام دھوکا دربار کیوں رکھا ہوا ہے.. کوئی تُک ہے"

"ہمشیرہ لاہور کے قریب ہم نے بھی ایک قصبے کا نام دھوکا منڈی رکھا ہو اُس کی کیا تُک ہے؟"

"لو ہم تو مسلمان ہیں جو جی آئے کریں..." ہمشیرہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

ہنومان دھوکا میں کوئی بھی کار۔ ٹیکسی کوئی میکانکی ٹرانسپورٹ داخل نہیں سکتی۔ صرف سیاح، یاتری اور سائیکل رکشا داخل ہو سکتے ہیں۔

اور یہیں دائیں جانب وہ چوبی محل تھا جس کی کھڑکیاں جھکی جاتی تھیں اور کے در ہم پر اُمڈتے تھے... انہی کھڑکیوں کی آرائشی کاریگری لاہور کے قدیم شہ جھروکوں اور بالکونیوں کو شرمندہ کرتی تھی.. میں ان کی اثر انگیزی کو کیسے قبول کر لیتا کسی اور عقیدے کا آسمانی حُسن تھا اور مجھے کہا جاتا تھا کہ بنیاد پرستی میں ہی عافیت ہے۔ ہم سب اپنی اپنی دُنیاؤں اور عقیدوں میں ہی مست رہتے ہیں.. اِدھر اُدھر منع ہے۔ بس یہی ایک دُنیا ہے' یہی ایک راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے ہم جنت میں دا

ہوں گے..

اور جب ایک اور دُنیا... ایک اور راستہ دکھائی دیتا ہے تو ہم فوراً آنکھیں بند کر لیتے ہیں.. اور ناراض ہو جاتے ہیں' رنجش میں چلے جاتے ہیں۔ ہمارا دل دُکھتا ہے... ہم مفاہمت نہیں کر سکتے.. اور یُوں بھی کفر کے ساتھ مفاہمت کرنا اپنی عاقبت کو گنوانا ہے..

لیکن یہ محل ایک معجزہ ہے.. کسی دوسرے یقین اور ایمان میں بھی تو معجزہ رُونما ہو سکتا ہے۔

بسنت پور چوک میں... اُس کے پتھریلے فرش پر تاحد نظر وہ سب کچھ سجا تھا جو کسی غیر مُلکی سیاح کی جیب میں سے اُس کا آخری ڈالر نکلوا لینے پر قادر تھا.. بسنت پور چوک نیپالی' ہندوستانی اور ہانگ کانگی اور کہیں کہیں پاکستانی اور کشمیری ہینڈی کرافٹس کی ایک وسیع اور اوپن ایئر نمائش تھی.. اور یہاں کے دوکاندار اور دوکانداریاں سیاحوں کو پھانسنے میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔

جونہی... بدھ کے مجسّمے۔ لکڑی کے شیر اور ہاتھی۔ وشنو کے نقاب۔ شہد کے پیالے۔ گُل دان۔ تانترک آرٹ کے نمونے۔ شطرنج کے مہرے۔ بھینسے۔ جناب شیوا کے لنگ۔ منقش کھڑکیاں' مور کے پَر' پینٹ کئے ہوئے چہروں والی گڑیاں' تبت کے ظروف... سامنے آئے تو خالدہ سرگوشی کی آنکھیں پتھرا گئیں..

وہ گُم ہو گئی..

نیپال کے قیام کے دوران کسی جگہ' کسی شوکیس میں یا فٹ پاتھ پر جب وہ کوئی ایسی شے دیکھ لیتی جو "شاپنگ" ہو سکتی تھی تو اُس پر یہی پتھرا جانے والی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ دُنیا و مافیہا سے کٹ کر کسی اور جہان میں چلی جاتی' اور کبھی اس دوکان کے اندر اور کبھی اُس سٹال پر اور کبھی فٹ پاتھ پر سجے نمونوں پر نظریں بچھائے جھکّی جھکّی چلی جاتی اور غائب ہو جاتی... اکثر ہم آگے نکل جاتے اور یکدم احساس ہوتا کہ خالدہ ندارد.. اس کے بعد ایک سرچ پارٹی ترتیب دی جاتی جو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر اُسے کسی تبتی دوکاندار کے ساتھ کسی بدھ راہب کے پیالے کے بارے میں مول تول کرتے تلاش کر لیتی اور تقریباً زبردستی واپس لے آتی...

"شاپنگ" دیکھتے ہی وہ حسن بن صباح کی جنت میں چلی جاتی۔

وہ کوئی ہیر، کوئی صاحباں، کوئی جولیٹ ہو جاتی جو "شاپنگ" کے عشق میں
جاتی۔ وہ ایک بے خود شاپر تھی جو رہ نہیں سکتی تھی۔

کوئی ایک جھمکا۔ ایک مجسمہ۔ ایک لیمپ شیڈ۔ ایک شال... اُسے ہم سے بچا
دیتے۔

چونکہ وہ اکثر گُم ہو جاتی تھی اس لئے عوام الناس نے اُسے گمشدہ حسینہ
دے دیا۔ ہم نے اگلے چند روز کے دوران اپنا نصف وقت سیر سپاٹے میں گذارا اور
نصف وقت اُسے تلاش کرنے میں گذارا۔

لیکن یہ "ونڈو شاپنگ" کی بیماری ایسی متعدی تھی کہ اُس کی رفاقت کی وجہ
ہم سب بھی آہستہ آہستہ مبتلا ہو گئے۔ اور شاپنگ مینی ایک ہو گئے۔

بسنت پور چوک میں سحرانگیزی ہی ایسی تھی کہ میں خود اس میں گُم ہو گیا۔

"میں تمہیں بہت اچھی قیمت دوں گی... وِشنو کا نقاب ہے اس پر جڑاؤ
اصلی پتھروں کا ہے اور دو سو سال پُرانا ہے۔" ایک نوخیز اور قدرے کائیاں نیپالی بچّی میرے
چہرے کے آگے وہ نقاب یوں دکھاتی تھی جیسے آئینہ دکھا رہی ہو۔ اور آئینے میں کیا
ہوں کہ یہ بڑے بڑے دانت اور سُرخ زبان۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو تسلی دی کہ
یہ شکل تمہاری نہیں نقاب کی ہے۔ اگرچہ چند برسوں میں تقریباً ایسی ہی ہو جائے گی۔
ابھی نہیں۔

"تو یہ دو سو برس پُرانا ہے۔؟"

"دو سو برس سے بھی زیادہ پُرانا... میں تمہیں بہت اچھی قیمت دوں گی۔"

"لیکن میرے ٹورسٹ کتابچے پر درج ہے کہ کوئی سیاح نیپال سے باہر کوئی
شے نہیں لے جا سکتا جو سو برس سے زیادہ قدیم ہو..."

"تم پورا دھوکا دربار اُٹھا کر لے جاؤ تو بھی تمہیں ایئرپورٹ پر کوئی نہیں روکے
یہ تو ایک چھوٹا سا نقاب ہے... لے جاؤ تمہارے گھر میں اس کی برکت سے ہُن برسے
میں تمہیں ایک اچھی قیمت دے رہی ہوں" وہ ایک ریمارکبل سیلز گرل تھی۔
بولتی چلی جا رہی تھی۔ میں اُسے صرف بولتے دیکھ رہا تھا اور وہ بولے چلے جا رہی
"صرف پندرہ ہزار نیپالی میں ایک جینوئن اینٹیک..."

"نہیں چاہیئے۔"

"چلو دس ہزار نیپالی تو ڈرٹ چیپ ہیں... میں تمہیں ایک اچھی قیمت دے رہی
ہوں۔ اس پر جڑے پتھر پلاسٹک کے نہیں اصلی ہیں۔ آخری قیمت پانچ ہزار ہے۔ کیا تم
وشنو کے لئے اتنی قیمت بھی نہیں دے سکتے۔"

"نہیں۔" میں اُس کی چرب زبانی کو انجائے کر رہا تھا۔ "میں وشنو کے ماننے
والوں میں سے نہیں ہوں۔" کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن ذرا ڈر ابھی کہ کہیں وشنو ایک
اور سچ نہ ہو۔ اور اگر ہوا تو میری پوزیشن بہت آکورڈ ہو جائے گی۔

"انڈین ہو؟"

"نہیں، پاکستانی۔"

اُس بچّی خاتون نے مُجھ پر ایک نظر حقارت ڈالی کہ خواہ مخواہ میں اپنا ٹائم پھوکٹ
میں خراب کیا اور فوراً ایک گورے سیاح پر وشنو کے ڈورے ڈالنے لگی۔

خالدہ سرگوشی بار بار ایک موٹی تبتی عورت کے پاس جاتی تھی، کچھ ہینڈی کرافٹس
اُٹھاتی تھی اُنہیں حسرت سے دیکھتی تھی، تبتی خاتون کو کچھ کہتی تھی جواب میں وہ سرہلاتی
تھی اور وہ واپس آ جاتی تھی۔

"تارڑ صاحب ادھر آئیں۔"

تارڑ صاحب اُدھر چلے گئے۔

اُس نے سیاہ رنگ کے منقش دو گلدان اُٹھائے اور کہنے لگی "یہ پانچ سو نیپالی
میں مہنگے ہیں؟"

خالدہ دی شاپنگ گرل نے واقعی پورے بسنت چوک میں بکھرے جعلی نوادرات
میں سے دو ایسے گلدان سپاٹ کر لئے تھے جو یونیک تھے۔

"اگر تمہیں مہنگے لگتے ہیں تو میں خرید لیتا ہوں۔"

"جانے دیں تارڑ صاحب۔ میں اس مائی کو دو ہزار روپے سے پانچ سو تک لائی
ہوں، میں ان گلدانوں کو جانے دیتی ہوں"

خالدہ کی شاپنگ میں ایک اور شاپر کا اضافہ ہو گیا۔

بسنت پور چوک کے پہلو میں ایک اور پُررونق سیاحوں کی آماجگاہ بازار تھا جس

میں ٹورسٹ ایجنسیاں تھیں۔ سستے ہوٹل اور شراب خانے تھے اور ایک ریستوران
بھی تھا جس میں جھولتے بجلی کے رنگ برنگے بلبوں تلے ایک فوارے میں سونڈھ بلند
ایک مہاراج بھی تھے۔

یہاں جگہ جگہ "انٹرنیشنل فون کال۔ فیکس" کے سٹکر چسپاں تھے۔ شیشے
دروازوں کے پیچھے سیاح اپنے اپنے دیسوں سے بات کرتے تھے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم آج کی شام ہنومان دھوکا میں اُترتی شام کے دھوکے
پل دو پل کے لئے نکل کر اُس شام میں پہنچ سکیں جو ہمارے گھروں میں بھی اُترتی ہو گی
یہ ممکن تھا۔

متعدد ٹیلی فونوں پر حکومت کرتی ایک ستھری مسکراتی نیپالی لڑکی نے جب
فراہم کردہ نمبر گھمایا۔ چند لمحے سُنا اور پھر فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں یقین نہ کر سکا
کہ اس کے آخری سرے پر عینی ہو سکتی ہے۔

"ہیلو بیٹے میں ابّو بول رہا ہوں۔"

"ابو۔" اُس کی آواز میں شگوفے کھلنے لگے اور اُن کی مہک مجھ تک پہنچی "کہا
سے ابّو؟"

"کھٹمنڈو سے۔ دھوکا دربار سے۔ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ آپ کیسے ہو؟"

"ابو مجھے فزیالوجی میں کنگ ایڈورڈز کی بہترین طالبہ کا گولڈ میڈل ملا ہے
97-96 کی بہترین طالبہ کا۔ تقریب میں آپ کو بھی بلایا گیا ہے۔"

"کیا بات ہے عینی بیٹے کی۔"

"اور سلجوق بھائی کو ابھی سول سروس کی کال نہیں آئی اور سمیر نے اس بار
کالج میں ٹاپ کیا ہے۔"

لگتا تھا کہ تمام اچھی خبریں... ایسی خبریں جن سے والدین خوشی سے بیوقوف
جاتے ہیں... میری کھٹمنڈو روانگی کی منتظر تھیں... عینی کی آواز ایک گونج کے ساتھ دور
آتی تھی۔

"امی کہاں ہیں؟"

"وہ کچن میں کچنار گوشت پکا رہی ہیں۔"

"اُنہیں بلاؤ۔"

"امی۔ ابو کا ٹیلی فون۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ اگر میں فون تک آؤں گی تو ہانڈی جل
جائے گی..."

"کچنار گوشت مجھ سے زیادہ اہم ہے۔" میں نے جل کر کہا... لیکن فوراً ہی مونا
لائن پر تھی... "ہیلو... کی حال اے؟..."

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا لائن کٹ گئی۔ کیونکہ میں نے ہی نیپالی نار کو کہا تھا
کہ تین منٹ بعد ڈس کونیکٹ کر دینا تاکہ۔ خرچہ زیادہ نہ ہو۔

گھر بات کی تو فون لائن میں رچی ہوئی کچھ اُداسی بھی بدن میں اُتری۔

اس بازار میں۔ اس کی چہل پہل اور ٹورسٹوں کی چہل قدمی میں میں نے ایسے
متعدد ریستوران دیکھے جن میں کوئی بھی شام خمار اور خوشی کی شام ہو سکتی تھی... اور وہاں
ایسے سیاح بیٹھے تھے مہاتما بدھ اور ہنومان کے مجسموں کی قربت میں اور اُن کے چرنوں میں
چراغ جلتے تھے اور وہ خمار اور خوشی میں تھے۔

اور یہیں اسی بازار میں مَیں نے دُوسری منزل پر واقع ایک ریستوران کی کھڑکی
میں اُس لڑکی کو دیکھا تھا جو اپنے پُرجوش نیپالی بوائے فرینڈ کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اُن
لوگوں پر جو نیچے بازار میں چلتے تھے اِک نظر کرم کرتی تھی۔ اور اُس کے بال سنہری اور
بے پرواہ تھے اور جہاں کہاں اُس کے بال تھے وہاں بھی سنہری ہوں گے اور اُس کا جوانی
سے دمکتا چہرہ ایک مستی کی مسرت میں نیچے دیکھتا تھا جہاں ہم تھے مگر ابھی ہم اُس سپاٹ
تک نہیں پہنچے تھے جس پر وہ اپنی نظر کرم کرتی تھی۔ اور جب میں اُس سپاٹ میں داخل
ہوا جس پر اُس کی گونا بے خودی آنکھیں مرکوز تھیں تو میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ
قدرے متعجب ہوئی اور پھر ذرا آگے جھک کر ایسے کہ اُس کے بدن کا بالائی بوجھ بھی جھکا
اُس نے ایک مست مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلا کر اپنی سرخوشی کا اظہار کیا۔ یہ حسینہ
اگرچہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھی بلکہ اُس کا نیپالی بوائے فرینڈ اُسے بعد میں سنبھالنے
کی مصیبت میں شاید مبتلا تھا لیکن اُس نے ایک عمر رسیدہ نائٹ کو ہاتھ ہلایا تھا جو شولری
کے تمام تر آداب سے واقفیت کے باوجود اُس کھڑکی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"یہ آپ ہر کس و ناکس کو ہاتھ ہلاتے چلے جا رہے ہیں؟" ہمشیرہ طاہرہ نے بہت

مائنڈ کیا۔۔

"یہ کس و نا کس نہیں' ایک پریٹی گرل ہے۔"

"آپ اِسے جانتے ہیں؟"

"ہاں۔۔ جب کبھی کوئی کھڑکی کھلتی ہے اور اُس میں کوئی دل رُبا چہرہ ہوتا ہے اُسے میں جانتا ہوں"

"معیوب حرکت ہے ویسے۔۔۔ آپ کو اپنی شہرت اور سٹیٹس کا خیال رکھنا چاہیے یُوں لفنگوں کی طرح اشارے نہیں کرنا چاہئیں۔۔" ہمشیرہ نے ذرا رنجیدہ ہو کر دردمندانہ مشورہ دیا "اور تارڑ صاحب۔۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ جب کبھی آپ کوئی سردار جی نظر آتے ہیں تو آپ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں سردار جی کی ہو رہیا اے۔۔۔ لوگ کیا سوچیں گے آپ کے بارے میں۔۔۔ آپ کو پاکستان وقار کا کم از کم خیال رکھنا چاہیے۔۔"

"یہی تو عیش کا مقام ہے ہمشیرہ۔ کہ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا' کوئی نہیں پہچانتا میں یہاں وہ ہوں جو آج سے تیس برس پیشتر ہوا کرتا تھا۔۔۔ ایک گمنام آوارہ گرد۔۔ جو من موج میں جو جی چاہے کر سکتا ہے۔۔ کسی کو بھی اشارے کر سکتا ہے۔۔ وہاں میں ایک حصار میں قید رہتا ہوں۔۔ اپنی اوچھی اور بازاری شہرت میں قید۔۔ یہاں میں ایک آزاد پرندہ ہوں بہت سارے پرندوں میں ایک پرندہ۔۔"

"لیکن ہم لوگ تو آپ کو جانتے ہیں ناں؟"

"آپ وطن واپس جا کر بے شک میری ان کرتوتوں کے بارے میں ایک پریس کانفرنس طلب کر لینا اور میں نہایت دانشورانہ بردباری سے سُوجی ہوئی سنجیدہ بُوتھی سے ان الزامات کی تردید کر دوں گا۔۔ آپ کی رپورٹ پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔۔"

"ویسے مجھے اور میرے خاوند کو کبھی یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسے بھی ہو سکتے ہیں"

"ہم نہ صرف ایسے بلکہ ایسے ویسے بھی ہو سکتے ہیں ہمشیرہ۔۔"

"خالدہ کہاں ہیں؟" یکدم کسی نے چونک کر کہا۔

وہ پھر لاپتہ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک سرچ پارٹی ترتیب دی گئی اور اُسے بالآخر

گنیش کے چرنوں میں بیٹھے ایک پجاری کے پاس دریافت کر لیا گیا اور وہ پجاری کے گلے میں جو مالائیں تھیں اُن کا سودا کر رہی تھیں۔۔

وہ عزیز از جان چیکو گائیڈ ابھی تک ہمارے آس پاس منڈلاتا چلا آ رہا تھا۔۔

"ضیاء صاحب۔۔ اس کردار کو رخصت کر دیں۔۔ اسی میں بہتری ہے"

"تم رخصت ہو جاؤ" سنہری بابا نے فوراً کہا۔

وہ نہیں ہوا۔

"یہ تو نہیں ہوتا۔۔" اُنہوں نے بے چارگی سے کہا۔۔

"تم کیوں رخصت نہیں ہوتا؟" میں نے ذرا تمکنت سے کہا۔۔

"تارڑ صاحب۔۔" فاروق آگے آ گیا "یہ دیوی دیوتاؤں سے ملائے گا۔۔ یعنی دیویوں سے بھی ملائے گا۔۔"

"آپ صرف چائے پلا دینا۔۔ اور کچھ نہ دینا" وہ لجاجت سے بولا "ہم ہسٹری بتائے گا"

"صرف چائے؟"

"یس سَر۔۔ میرا نام پرکاش ہے"

دھوکا دربار میں شام اُترنے لگی۔۔

ایک ایسے مندر کے سامنے جس کی آہنی جالی کے پیچھے شیوا کا نقاب ڈھلتی شام میں زندہ ہوتا لگتا تھا۔۔ اور جس کے مُنہ سے خاص موسموں میں شراب کی آبشار بہتی تھی' وہاں ایک بہت بڑی گھنٹی لٹکتی تھی۔۔ اور ہر نیپالی پہلے اُسے پرنام کرتا تھا' سینے پر ہاتھ باندھ کر سر جھکاتا تھا اور پھر ہاتھ بلند کر کے اُسے حرکت دے کر ٹن ٹن بجاتا تھا اور ایک شام کے لئے مناسب ثواب کما کر رخصت ہوتا تھا۔۔ جیسے ہم سلطان باہو اور بہاؤالدین زکریا کے مزاروں پر سجی سبز چادروں کے کناروں پر رکھے رنگین لٹوؤں کو اُٹھا کر چُومتے ہیں اور ثواب کما کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر اُس گھڑیال میں سے لٹکتی آہنی زبان کو تھام کر اُسے جھولایا اور دھکیل دیا۔۔۔ ایک گہری گونج والی ٹن ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے دھوکا دربار کے تمام مندروں کی گھنٹیوں کے در کُھل گئے ہیں اور وہ ایک مترنم تسلسل کے ساتھ ٹن ٹن۔۔

ٹان.. بجتی چلی جا رہی ہیں.. جیسے کسی کنویں میں مقیم کوئی بھگت نروان پا جانے کی خو
گھنٹیاں بجانے لگے اور اُن کی آواز کنویں کی گولائی میں گردش کرتی ہوئی گونجتی ہوئی
جائے.. جیسے گھنٹیوں کا ایک سمفنی آرکسٹرا حرکت میں آ گیا ہو.. یہ کیا ہے کہ اگر ایک
اسی گھنٹی کو بجاتا ہے تو وہ دو چار بار ٹن کرتی خاموش ہو جاتی ہے اور اگر میں نے اُسے
لگایا ہے تو وادیٔ کھٹمنڈو میں اُس کی گونج تیرتی ہے اور اُس کا تسلسل ختم ہونے م
نہیں آتا..

شاید اس کا کوئی جواز ہو..

شاید وہ ماننے والے کے لئے ایک بار بجتی ہو.. اور کسی "کافر" کے ہاتھ لگ
مسلسل احتجاج کرتی چلی جاتی ہو.. ویسے گھنٹی کیا جانے کہ میں ماننے والا ہوں یا نہیں.

"سر یہ آپ کیا کر رہے ہیں.. خواہ مخواہ گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے ہیں.."
بابا ذرا نروس ہو گئے "نیپالی لوگ مائنڈ کر جائیں گے.."

"سنہری بابا ایک تو یہاں آپ ٹیلی ویژن کے فرعون نہیں ہیں کہ مجھ پر اپنی
مسلط کر سکیں اور دوسرا یہ کہ نیپالی لوگ تو تب مائنڈ کریں گے اگر ہم اِن گھنٹیوں کے
سے خالی گذر جائیں.. حجر اسود کو بوسہ دینے کا امکان ہو اور کوئی حاجی ایسا نہ کر
مشکوک ہو جائے گا.ــ"

"میرے ذہن میں آپ کا جو امیج تھا وہ تباہ و برباد ہو گیا ہے.ــ"

"میرے ذہن میں بھی.ــ" ہمشیرہ بھی شامل ہو گئیں.

"ہاں تارڑ صاحب ذرا زیادہ ہی اوور ہو گئے ہیں" خالدہ جو دستیاب ہو چکی
اُس نے بھی سرگوشی کی "ویسے کسی پجاری سے پوچھتے تو سہی کہ یہ گھنٹی کتنے میں
جائے گی.ــ"

"تارڑ جی.." فاروق نے ایک دوستانہ دھپ میرے کندھے پر رسید کی "
پلیز اوور ہو جایئے.."

فاروق صرف ایسا تھا جو میری اس جذباتی فراوانی اور لبریز ردِ عمل کو خوب
تھا کہ وہ عمر کے اُس حصے میں تھا جسے میں پچیس برس پیشتر گذار چکا تھا..

یہ ایک نہایت نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ ہم پانچوں زندگی میں

اکٹھے ہوئے تھے اور ہماری شناسائی چند گھنٹوں اور ایک آدھ گھنٹی بجانے پر محیط تھی اور
اس کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ یہ آشنائی برسوں کی ہے اور ہم ایک دوسرے کی رگ رگ
سے واقف ہیں..

مجھے ہمیشہ اپنے پروٹوٹائپ امیج کو شکستہ اور تاراج کرتے ہوئے بے حد مسرت
محسوس ہوتی ہے کہ یہ مجھے' میرے اصل' کو نہ بیان کرتا ہے اور نہ میری نمائندگی کرتا
ہے.. نہ میری صورت اور رُوپ اور کردار کی تصویر کشی کرتا ہے.. میں اپنے جعلی امیج سے
بالکل جُدا شخص ہوں.. مجھ میں شک اور شوخی بہت ہے جو اکثر بے محل ہوتی ہے.. اور
میرے چاروں ساتھیوں نے یہ جان لیا تھا اور قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق.. مجھے
جوں کا تُوں.. میں جس حالت میں بھی تھا' مجھے مجبوراً قبول کر لیا تھا....

یہاں کچھ فرشی خدا بھی تھے.. جن کے تقدس اور پُوجا پاٹ کے لئے کوئی عمارت
ایستادہ نہ کی گئی تھی....یہ ڈیڑھ اینٹ کے الگ مندر تھے... مختصر چار دیواری کے اندر ایک
ہموار پتھر... جو خدا تھا.. اور اُس پر اُبلے ہوئے چاول' زعفران اور گھی.. جو بھینٹ کئے گئے
تھے.. اور اُن پر مکھیاں عیش کرتی تھیں..

"یہ کیسے ناعاقبت اندیش لوگ ہیں تارڑ صاحب.. یا شائد بھولے بادشاہ ہیں.. ان
کا خیال ہے کہ یہ خوراک دیوتاؤں تک پہنچ رہی ہے.. اور اس پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں.."
ہمشیرہ نے ایک ایمان افروز اعتراض کیا..

"ہمشیرہ طاہرہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور اس کہنے پر ہمیشہ مطعون کیا جاتا ہوں کہ
برصغیر کے مسلمان کو اُس کے ہندو صنم بہت ستاتے ہیں.. جماعت کی آستینوں میں واقعی
ایسے بت ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن وہ اُن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا... ہم جو نذر
نیاز کرتے ہیں' دیگیں چڑھاتے ہیں ــ داتا صاحب کے مزار پر چنے کے پلاؤ کے چڑھاوے
چڑھاتے ہیں... وہ کیا ہے.. فوتیدگی ہوتی ہے تو ہر جمعرات کو مُردے تک پہنچانے کے لئے
مسجد میں کھانا کیوں بھیجتے ہیں... ہر منگل کے روز لاہور کی سڑکوں پر صبح سویرے کالے
بکرے کی جو سریاں نظر آتی ہیں.. باغ جناح میں تُرت مُراد کی قربت میں جو پانچ سو برس
پُرانا برگد کا درخت ہے اس کی کوکھ میں دیئے کیوں جلاتے ہیں اور اُس کی ٹہنیوں کے
ساتھ اُمیدوں کے دھاگے کیوں باندھتے ہیں ــ گھوڑے شاہ کے مزار پر سونے چاندی اور

مٹی کے گھوڑے کیوں نذر کرتے ہیں.. اگر وہ سب کچھ پہنچتا ہے تو یہ اُبلے ہوئے
زعفران اور گھی بھی پہنچتا ہے..“

”آپ پر تو کفر کا اثر ہو گیا ہے...“

سارے میں کسی تیل کی مہک تھی اور مکی کے دانوں کی گرم خوشبو تھی جو
پاتھ پر بیٹھی دیہاتی عورتیں ٹورسٹ لوگوں کے لئے آگ پر بھونتی تھیں..

خالدہ پھر آگے پیچھے ہو چکی تھیں..

چنانچہ ہم اُس کی تلاش میں سرگرم ہو گئے..

وُہ ٹل چوک میں سے نکلتے ہوئے ایک بازار میں رگھوناتھ کی دوکان پر
پشمینے کی ایک شال اوڑھے ہوئے یہ اندازہ لگا رہی تھیں کہ یہ کتنی گرم ہے ”
صاحب آ جائیں— زبردست شاپنگ ہے.. اپنی بیگم یا بیٹی کے لئے کچھ تو خرید لیجئے..“

”سستی ہے؟“

”پتہ نہیں.. اس نے پانچ ہزار نیپالی مانگے تھے اور میں نے ایک ہزار کی آفر
ہے، پتہ نہیں مانتا ہے یا نہیں..“

ہم سب بڑبڑاتے ہوئے اندر چلے گئے— ہم سب اس آسانی سے گم ہو جا
والی حسینہ سے عاجز آ چکے تھے لیکن جب بھی ہم اپنے غصے کے اظہار کے طور پر اُ
خونخوار نظروں سے دیکھتے وہ اپنی بھاری پلکیں اُٹھا کر نہایت کومل سُروں میں کہتی تھی ”
دیکھیں تو سہی.. نہایت زبردست شاپنگ ہے“ تو ہم موم ہو جاتے تھے—

یہاں بھی.. رگھوناتھ کی مختصر دوکان میں ہم موم ہو گئے.. اور اس موم کے
قطرے باقاعدہ اُن شالوں پر گرے جو نیپال کے پشمینے سے ہاتھ کی کھڈیوں پر بنی
تھیں.. اور یہاں بھی سنہری بابا نے دوکان کے اندر داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا ”آئی سی
کتنا؟“

رگھوناتھ تو قدرے سراسیمہ ہو گیا کہ شائد چھاپہ پڑ گیا ہے اور ہکلا کر بولا ”کو
شال سر؟“

”کوئی سی شال..“

رگھوناتھ نے کوئی سی ایک شال کی قیمت انڈین کرنسی میں بتائی..

”بس ٹھیک ہے—“ سنہری بابا مطمئن ہو گئے ”پوچھنے میں کیا حرج ہے“

لاہور میں امریکن ایکسپریس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے نیپال سے ملاقات کے لئے
لروں کا زادِ راہ وصول کرتے ہوئے میرے برابر میں براجمان ایک شکل اور مزاج دونوں
سے اچھے کاروباری نے اپنے موبائل کو کان سے الگ کیا اور مجھ سے پُوچھا ”تارڑ صاحب
ہاں جا رہے ہیں..؟“

”نیپال..“

”بیوی کے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”نہیں..“

”تو پھر نیپال کیوں جا رہے ہیں.. سنگاپور یا بنکاک کیوں نہیں جاتے.. نیپال تو ہمیشہ
بوی کے ساتھ جایا جاتا ہے..“

”کیوں؟“

”وہاں کوئی شاپنگ نہیں ہے.. مجال ہے کوئی ایک چیز ایسی دکھائی دے جائے جسے
خریدنے کو جی چاہے..“ وہ صاحب نہایت پُرمسرت ہوئے ”میں جب بھی اپنی بیگم کو ہمراہ
لے کر جاتا ہوں تو وہ شاپنگ کرتے کرتے میرا بھرکس نکال دیتی ہے چنانچہ پچھلی مرتبہ میں
جان بُوجھ کر بے حد اصرار سے اُسے کھٹمنڈو لے گیا.. وہ پاگل ہو گئی گھوم گھوم کے اور
میرے زرمبادلہ میں ایک ڈالر کی بھی کمی نہ کر سکی... لیکن یہ خوشی عارضی تھی وہ مجھے
زبردستی سنگاپور لے گئی اور ایک ہی دن میں پورے سال کی کسر نکال دی.. لیکن آپ نیپال
کیوں جا رہے ہیں؟“

”اس لئے کہ ٹکٹ آ گیا ہے..“

اس دوران یونیسکو کے ایک سیمینار میں ثروت محی الدین سے ملاقات ہو گئی
”نیپال؟ ہاں وہاں تو خریدنے کو کچھ نہیں.. البتہ وہاں کا پشمینہ بہت کمال کا ہوتا ہے.. ہمالیہ
کی بلندیوں پر جو بھیڑیں پالی جاتی ہیں اُن کی اُون سے بُنتے ہیں اور بہت گرم ہوتا ہے اور
سستا بھی..“ ثروت کا میں اعتبار نہیں کرتا کیونکہ وہ نام کے علاوہ بھی اہل ثروت میں سے
ہے اور اُن کو پاکستانی روپوں کی بجائے ڈالروں میں سوچنے کی عادت ہوتی ہے.. لیکن اب
یہاں ڈھلتی شام میں اور اُس کے دھوکے میں مبتلا دھوکا دربار کے ٹل چوک کے نزدیک

خالدہ اُسی پشمینے کو اُنگلیوں میں سرکاتی گمشدہ کہتی تھی "بے حد نرم ہے تارڑ
آپ بھی خرید لیں"

ہم جب رگھوناتھ کی دوکان سے باہر آئے تو وہ سیٹھ رگھوناتھ ہو چکا تھا
کی تجوری میں ہمارے دس ہزار نیپالی بہار دیتے تھے...

"تارڑ صاحب یونیسف کی جانب سے جو دعوت نامہ بلکہ حکم نامہ آیا تھا
درج تھا کہ قیام کے دوران ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہمارے ذمے ہے لیکن ڈنر کا بند
آپ خود کریں گے.. چنانچہ شام ہو رہی ہے.. لوگ بھگوانوں کی پُوجا کر رہے ہیں
پُوجا کر لیتے ہیں"

"تو پھر کسی پتھر کے خدا کے چرنوں میں پڑے ہوئے زعفرانی چاولوں اور گ
ہی یہ پُوجا کر لیتے ہیں.." میں نے تجویز پیش کی۔

"توبہ کریں تارڑ صاحب غیراللہ کے نام پر کی گئی قربانی کا گوشت بھی حرا
ہے یہ تو پھر دال چاول ہیں" ہمشیرہ فوراً میرے ایمان کے دفاع کے لئے کمربستہ ہو گئیں

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا بے وقوف ہوں کہ زمین پر پڑے مکھیوں
بھنبھناتے یہ چاول ڈنر کے طور پر نوش کر جاؤں گا؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"آپ کا کچھ پتہ نہیں ویسے..." وہ ابھی تک مجھے بہت مخدوش جانتی تھیں۔

رگھوناتھ کی دوکان سے باہر آکر ہم ایک مرتبہ پھر دربار چوک کے مندرو
بھول بھلیوں میں گھومنے لگے... پرکاش جو گائڈ کے رُتبے پر اپنے آپ کو اپنی من
سے فائز کر چکا تھا مختلف مندروں اور صنم خانوں کے حال سناتا تھا..

اور یہیں مجھے خیال آیا کہ اردو شاعری میں بُت کدوں اور بُت پرستی اور
خانوں اور صنم چہروں کی جو بھرمار ہے یہ شاعر اگر دھوکا دربار میں تشریف لا کر بہ نفس
اِن صنم چہروں اور بُتانِ نیپال کو دیکھ لیں تو زندگی بھر کسی دل رُبا چہرے کو صنم سے ت
نہ دیں اور اُسے بُت کہنے سے شدید پرہیز کریں..

کسی ایک چوبی محل کے دروازے پر ایستادہ ہنومان جی کی موجودگی میں اور ڈ
شام میں پرکاش میرے نزدیک آیا اور ایک خالدہ گمشدہ ٹائپ سرگوشی میں بولا "سا
جگن ناتھ مندر ہے اِسے دیکھے گا؟"

"نہیں دیکھے گا... میں نے زندگی بھر کے لئے آج کے دن میں کافی مندر اور
بھگوان دیکھ لئے ہیں.."

"لیکن جگن ناتھ کا مندر تو نہایت سپیشل ہے۔ اِسے دیکھ کر گوری لوگ بہت
ایکسائٹ ہوتا ہے.."

"کیوں ایکسائٹ ہوتا ہے؟"

"دیکھے گا تو پتہ چلے گا.."

شب کی تاریکی شام میں اُترتی تھی اور دھوکا دربار میں کھنکتی گھنٹیوں کی آوازوں
کو ایک سیاہ رِدھم سے آشنا کرتی تھی، میں پرکاش کے پیچھے پیچھے جگن ناتھ مندر کی جانب
چلا اور چونکہ تاریکی بڑھتی جاتی تھی اس لئے کسی نابینا کی طرح احتیاط سے چلا کہ کہیں کسی
فرشی پتھر صنم کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ جگن ناتھ مندر ایک چوکور پلیٹ فارم پر دھونی
رمائے بیٹھا تھا..

اُس کے چاروں اَور ایک گیلری تھی اور اُس کے نیچے جو چھوٹے چھوٹے چوبی
مجسمے تھے اُنہیں غور سے دیکھتا ہوں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں بلکہ چودہ طبق روشن ہو
جاتے ہیں۔ ایک طبق روشن ہونے سے ہی سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے تو اکٹھے یک مشت
چودہ طبق روشن ہو جائیں تو رات کو دن کر دیتے ہیں اور اندھیرے میں گُم سٹیج کو اس
طرح چکاچوند کر دیتے ہیں کہ ان کی روشنی میں آپ ایک ٹیلی ویژن ڈرامہ آسانی سے
شُوٹ کر سکتے ہیں.. تو میں یہاں جگن ناتھ مندر کی چندھیا دینے والی روشن سٹیج پر جب میں
اپنی آنکھوں کے کیمرے سے ایک مجسمے پر زُوم اِن کرتا ہوں تو اُس کی حرکات دیکھ کر پسینے
چھُوٹ جاتے ہیں..

جو کچھ ہوس خواہش کرتی ہے.. جو کچھ آپ کر چکے ہوتے ہیں.. اُس میں کہیں نہ
کہیں ایک آنچ ایک آسن کی کسر رہ جاتی ہے... اور وہ ایک آنچ وہ ایک آسن ان مختصر
مجسموں میں نمایاں تھے۔

یہ ایک عجیب وقوعہ ہے.. ایک حیرت انگیز اور نادر امر ہے کہ ہر پچیس پچاس
اور ہر صورت میں سو برس بعد اخلاقیات اور مذہب کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ لباس
متروک ہو جاتا ہے۔ رہنے سہنے اور کھانے پینے کے انداز جُدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ

شاعری اور حُسن کی تفسیر بدل جاتی ہے لیکن ہزاروں برسوں میں جو شے آج تک نہ
وہ جنسی عمل ہے۔۔

وہ غاروں میں رہنے والے ہمارے بھائی بند یا بہنیں ہوں — بابل کے بای
فرعونوں کے بستر ہوں یا مغل منی ایچر تصاویر ہوں۔۔ جگن ناتھ ایسے مندر ہوں۔
وہی ڈھنگ اور وہی چلن ہوتا ہے جو آج کے مین ہٹن — شانزے لیزے یا لاہور
روڈ یا موچی دروازے کے باسیوں کا ڈھنگ ہوتا ہے۔۔ اس عمل میں کوئی تبدیلی نہیں
کوئی نئی ترکیب کوئی نئی سائنس ایجاد نہیں ہوتی۔

انسان جب لباس کے بغیر خلوت میں اس عمل کے لئے ہوتا ہے تو وقت اس
کی شناخت ممکن نہیں ہوتی۔۔

وہ انسان غاروں کا مکین بھی ہو سکتا ہے اور آج کے خلائی عہد کا بھی۔ اُ
پہچان ممکن نہیں ہوتی۔۔

جگن ناتھ مندر کی چوبی گیلری کے مجسموں میں کاماسوترا کے وہی انداز
ابھی تک نہیں بدلے۔۔ اور نہ بدلیں گے۔۔ بے شک ہم کلوننگ کے زمانوں تک آ
ہیں۔۔

ہماری خواتین یعنی ہمشیرہ اور خالدہ گمشدہ ایک مختصر لنگی میں بندھی نیپال
ساتھ مصروف گفتگو تھیں۔۔ اور سنہری بابا اور فاروق اگرچہ یہاں مقدس لیکن آ
گائیوں کی طرح اِدھر اُدھر گشت کر رہے تھے۔ میں نے اُن دونوں کو فوری طو
مشاورت کے لئے طلب کر لیا۔۔

"کیا ہے؟"

"کچھ ہے تو بلا رہا ہوں۔۔ چپکے سے چلے آؤ — خواتین کو خبر نہ ہو"

وہ چلے آئے۔۔ اب جو اُنہوں نے جگن ناتھ مندر کے چوبی مجسموں کو دِن د
بلکہ اب تو رات دہاڑے محوِ اختلاط دیکھا تو اُن کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے —
تینوں کے مل ملا کے بیالیس طبق روشن ہو چکے تھے۔ البتہ اُن کی باچھیں بھی کھل
تھیں "بھئی تارڑ صاحب یہ تو سخت بے شرم لوگ ہیں — یعنی حیا کا کوئی کانسپٹ ہی
ہے۔۔ ذرا قریب ہو کر دیکھیں اور ان کی اخلاق باختہ اقدار پر مزید لعن طعن کریں۔

سامان ہے"

وہ دونوں عبرت کے سامان کا نزدیکی مطالعہ کرنے کے لئے مزید نزدیک ہوئے اور
اُن کے چہروں پر وہی شرمندگی اور سرخوشی تھی جو کسی نامحرم سینما ہال میں بیٹھے تماشائیوں
کے چہروں پر "ٹوٹے" دیکھتے ہوئے طلوع ہوتی ہے۔۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری دونوں خواتین اُس لنگی پوش نیپالی حسینہ سے
فارغ ہو کر ہماری جانب بلکہ جگن ناتھ مندر کی جانب لپکتی چلی آتی ہیں۔۔

میں نے فوراً شدید سراسیمگی کے عالم میں، مندر کے پلیٹ فارم سے اُتر کر اُن
کی جانب اپنی بوڑھی کمر میں لچک پڑ جانے کا خطرہ مول لیتے ہوئے ایک سپرنٹ لگائی اور
اُنہیں راستے میں ہی جا لیا۔۔ "سٹاپ۔۔" میں نے کسی نیوکلیئر پلانٹ کے باہر متعین ایک گارڈ
کی طرح اُن کا راستہ روک لیا —

"ہم بھی تو دیکھیں کہ آپ لوگ اتنی دیر سے کیا دیکھ رہے ہیں۔۔ اور بہت غور
سے دیکھ رہے ہیں۔۔" ہمشیرہ اپنی عینک سمیت ایک فاتح سپہ سالار کی طرح آگے بڑھتی چلی
جا رہی تھیں —

"خبردار جو آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔۔ وہاں خواتین کے لئے کوئی ایسی
شے نہیں ہے۔ جسے آپ دیکھ سکیں"

"ہم تو دیکھیں گے۔۔" ہمشیرہ نے یہ فقرہ اُسی لَے میں کہا جیسے اقبال بانو، فیض کا
کلام الاپتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہم دیکھیں گے۔۔۔ اور وہ لپکی چلی جا رہی تھیں اور اُن کے
پیچھے خالدہ بھی اگرچہ لپکتی نہ تھی ذرا سستی سے چلتی تھی لیکن وہ دونوں خطرناک حد تک
جگن ناتھ مندر کی قربت میں پہنچ چکی تھیں۔۔

تب میں نے ایک مؤدبانہ اور لجاجت آمیز گرج کے ساتھ کہا "ہمشیرہ آپ نے
اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا — اگر آپ نے وہ کچھ دیکھ لیا جو ہم
دیکھ رہے تھے تو آپ فی الفور میری ہمشیرہ نہیں رہیں گی، کچھ اور ہو جائیں گی"

"لیکن کیوں؟" وہ ذرا ٹھٹک گئیں "جھانک لینے میں کیا حرج ہے؟"

"شدید حرج ہے۔۔ نہایت غیر اسلامی مجسمے ہیں اور ایسے ہیں کہ مجھے خود بھی بڑی

شرم آ رہی ہے— آپ میرے کانوں کی لَویں دیکھ رہی ہیں.. سُرخ ہو رہی ہیں—پلی
آ جائیں"

خواتین چونکہ تجربہ کار تھیں اس لئے فی الفور باز آ گئیں اور وہ بھی قدر
سُرخ ہو گئیں.. مجسّمے دیکھ لیتیں تو پتہ نہیں کیا ہو جاتیں..

میں نے سوچا ابھی بہت دن ہیں' کسی فارغ وقت میں ان خواتین سے چور
دوبارہ اِدھر آئیں گے اور تفصیل سے ان بے حیا لوگوں کی بے حیائی سے لطف اندوز
گے' ان کافروں کی کرتوتوں پر لعنت بھیجیں گے اور لاحول پڑھیں گے..

اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا ذکر میں پہلے باب میں کر چکا ہوں— جب دھوکا در
ڈھل چکی شام کے بعد اُترتی رات میں' پرکاش دی گائڈ کی بھڑکا دینے والی' تپک اور
پیدا کرنے والی موجودگی سے میں عاجز آ گیا اور میں نے کہا "تم اپنے آپ کو گُم کیوں
کر دیتے' وہائی ڈونٹ یُو گیٹ لاسٹ.."

"صاحب.. یہ ہمارا شہر ہے— ہم اس میں گُم نہیں ہو سکتا.."

"تو خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو.."

"کونسے خدا کے لئے.. وشنو کے لئے— ہنومان جی کے لئے— شیوا کے لئے؟"

"یار کسی بھی مناسب خدا کے لئے.."

تب اُس نے کہا تھا کہ "دیوی دیکھو گے؟"

"کس قسم کی دیوی.."

"لِونگ گاڈیس.. زندہ دیوی.."

"ایک اور دیوی..؟"

کماری بہائی کے نیم تاریک مندر میں.. اُس نے صرف چند لمحے اپنے جھر
میں براجمان ہو کر اپنے درشن دیئے.. لیکن ہم پر زمانے گذرے..

اور پھر ہمارے کفر اور الحاد سے مایوس ہو کر.. وہ ذرا پیچھے ہوئی' کھڑکی کے
اور کواڑ بند ہو گئے..

کھڑکی اگرچہ بند ہو چکی تھی مگر ہم اُسے دیکھتے تھے—
اُس زندہ دیوی' لِونگ گاڈیس' کماری کے شائبے جو ہمیں شک میں مبتلا کرتے
تھے کھڑکی کے بند کواڑوں پر رات جو اُترتی تھی اُس کی سیاہی کے باوجود اُس کے شائبے
کواڑوں پر نقش ہوتے تھے' دکھائی دیتے تھے—

"کماری.." پرکاش تو یہ نہ دیکھتا تھا کہ کھڑکی بند ہو چکی ہے اور سر جھکائے تسبیح
کے دانوں کی طرح "کماری.. کماری" کے دانے گراتا چلا جاتا تھا—

"بیکری کیفے... فار ہوم دی بیل ٹولز"

"بیکری کیفے" یونہی دریافت ہو گیا..

ہم کوئی اور پُوجا کرتے نہ کرتے.. اپنے اندر کے بُتوں پر سو سو پردے ڈال کر
کی پرستش کو کفر جانتے لیکن پیٹ کے بُت کی پُوجا ہماری مجبوری تھی بے شک ہم کا
جاتے..

"بیکری کیفے" کا بورڈ دیکھ کر ہمشیرہ جو ابھی تک سُرخ تھیں کہنے لگیں "ذ
جھانک لینے میں کیا حرج ہے؟"

سنہری بابا نے فوراً کھانس کر کہا "پوچھتے ہیں کہ آئی سی میں کتنے کا ہے"

"میرے شاپنگ بیگز اب اُٹھائے نہیں جاتے.. تھوڑی دیر بیٹھ جاتے ہیں
صاحب.." خالدہ سرگوشی.. اپنی سرگوشی میں تھیں۔

"اندر ناریاں وافر تعداد میں بیٹھی ہیں تارڑ صاحب.." فاروق نے جھانک لیا
اور اندر کی رونقیں دیکھ کر مُونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

یہ "بیکری کیفے" کماری کے مندر کے عین پہلو میں تھا..

یہ عین ممکن تھا کہ کماری بھی کبھی کبھار سب سے چھپ چھپا کے یہیں برگر
چپس کھانے کے لئے آتی ہو۔

لیکن ہم سب ابھی تک کماری کے طلسم میں تھے... ہم اُس کے مندر سے
تھے اور اس کیفے میں آ گئے تھے..

اور وہ ایسے لمحے تھے کہ ہم اُس کے پجاری بھی ہو سکتے تھے.. لیکن ہم اُس سے
کہیں زیادہ خوش نصیب تھے کہ وہ ہماری ہمسائی مندر کی تنگ چھتوں والے ایک کمرے
میں قید تھی اگرچہ پوتر اور پرستش کے قابل تھی.. لیکن قید تھی اور ہم اُس کی یاترا کرنے
والے آزاد تھے اور بیکری کیفے کے کھُلے صحن میں' چینی لالٹینوں اور خوراک کی خوشبو میں
اور کھٹمنڈو کی رات میں اُترنے والی بدن کو نیم سرد بوسے دینے والی رات میں' آزاد تھے..

اور اِس آزادی میں پرکاش کی ایک بس گھولنے والی زہر آلود اور لاتعلق آواز
آئی "گومی دی منی.."

"منی؟" سنہری بابا چونکے کیونکہ پرکاش کے وہ گاڈ فادر تھے "نیپالی یا آئی سی؟"

"آئی سی"

"بٹ آئی ڈونٹ سی.. تمہارے ساتھ چائے کا وعدہ کیا تھا' وہ پلا دیتے ہیں.. بلکہ
چکن سینڈوچ بھی کھلا دیتے ہیں"

لیکن پرکاش طوطا ہو گیا... ڈھیٹ ہو گیا "نیپال ٹورازم ڈیپارٹمنٹ نے گائیڈز کے
لئے ریٹ مقرر کیا ہے.. گومی دی منی.."

"لیکن پرکاش بھائی آپ تو اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ نتھی ہو گئے تھے اور
کہہ رہے تھے کہ صرف چائے پلا دینا.."

"آپ لوگ اگرچہ سنتے نہیں تھے لیکن میں نے دھوکا دربار کی ہسٹری بتائی.. آپ
کے ساتھ ساتھ چلا.. جگن ناتھ مندر دکھایا.. کماری کو اگر میں نہ بلاتا تو وہ نہ آتی.. گومی دی
منی.."

"یار اسے کچھ دے دلا کے رخصت کرو.. یہ بڑی جُوتھ قسم کی شے ہے"

ہم نے بہت ترس کھا کے اور ذرا جبر کر کے اُس غریب کے بال کو پورے سو
روپے عنایت کر دیئے اور ہمارا خیال تھا کہ وہ اس زرِ کثیر کے حصول کے بعد فوری طور پر
نزدیک ترین خوشی خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر شکرانے کے نفل ادا کرے گا لیکن وہ
نہایت ناشکرا نکلا اور مکر گیا "دو سو روپے..."

"اوئے تو جانتا ہے کہ نہیں.. نامہ نیم کی اولاد.." فاروق ذرا غصیلا ہو گیا اور اُس
کی مُونچھیں پھڑکنے لگیں۔

پرکاش نے سو کا نوٹ اپنی جیب میں جمع کیا اور پھر فاروق کے تن و توش کو [...]
رکھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے "چائے تو پلا دو.. اور چکن سینڈوچ بھی" اگرچہ وہ [...]
دوران بیکری کیفے کے ویٹرز اور دیگر مہمانوں کو بہ آواز بلند ہماری شقی القلبی اور [...]
کے قصّے سناتا چلا جا رہا تھا..

وہ بمشکل رخصت ہوا تو ہم نے جانا کہ یہ عجیب جادوئی اور بُت پرستی کے [...]
میں ڈوبی ہوئی شب تھی..

فرنچ فرائز— چکن سینڈوچز— پیزا— سٹیکس اور برگرز اور آبِ جو کے جو [...]
تھے وہ ہماری آنکھوں کو جگمگاتے تھے..

عجیب جادوئی شام تھی..

جس میں انسان بے خود اور آزاد ہو جاتا ہے..

اور یہاں میں ہمشیرہ اور خالدہ گمشدہ کی فراخ دلی کا بہت معترف ہوا.. ہم نے [...]
سے بصد ادب دریافت کیا کہ اس شام میں.. اس دھوکا باز اور کفر کی رات میں.. ہم
اپنے آپ کے ساتھ کچھ دھوکا کر لیں.. کچھ کفر کی ریت کی پیروی کر لیں.. وہ کھائیں
پئیں جو یہ رات چاہتی ہے تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا.. اگر ہو گا تو ہم بھوکے پیاسے [...]
ہو جائیں گے آپ کے سامنے جسارت نہ کریں گے..

"پلیز گو اہیڈ.." ہمشیرہ نے کہا..

"پلیز انجائے یور سیلف تارڑ صاحب" خالدہ گمشدہ نے اعتراض کیا نہ
بہتان لگایا—

"اگر تارڑ صاحب انجائے کرتے ہیں تو ہم اُن کے مُرید ہیں" سنہری بابا نے
داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور نہایت مسرت سے لبریز ہوئے—

"اور جو مرضی امام کی وہ ہماری.." فاروق کی اگرچہ وہی مرضی تھی جو امام کی
لیکن وہ امام کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا تھا..

چنانچہ ہم نے اُس فریب آلود دھوکا باز شام میں.. دھوکا دربار کے "بیکری"
کے صحن میں اُتری ہوئی رات میں اپنے آپ کو گونا بے خودی سے خوب لبریز کیا..
اور جب انسان لبریز ہوتا ہے تو اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اُسے وہ کچھ

آنے لگتا ہے جو کسی اور کو نظر نہیں آتا اور مجھے برابر کی میز پر دو چپٹی ناک والیاں
کوہ نورد خواتین نظر آئیں جو آپس میں کِھی کِھی کر کے ہنستی تھیں اور اُن کے نچلے دھڑ پر
کسی نیلی جینیں اور جیکٹیں بھی... ہنستی تھیں..

میں اُٹھ کر اُن کے پاس چلا گیا "ہیلو"

"ہیلو.." وہ تنہائی سے عاجز آ چکی تھیں.. صرف اس لئے اُنہوں نے ایک عُمر
رسیدہ نائٹ کے "ہیلو" کے جواب میں اتنا پُرجوش "ہیلو" کہا..

"آر یُو ٹورسٹ؟"

"یس.. نو.."

"گڈ.. گڈ.. نو پرابلم.." وہ کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھیں، لیکن جھکتی چلی جاتی تھیں...
اور اُن کے "نو پرابلم" سے اور جھکتے چلے جانے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ "ٹی ہاؤس
آف آگسٹ مُون" کی جاپانی دوشیزائیں ہیں— جیمز مشنر کے "سایونارا" کی گیشا گرلز ہیں.. یا
پھر میرے پسندیدہ جاپانی ناول نگار یوکیو مشیما کے ناخوش کردار ہیں.. چنانچہ میں نے اپنے
آپ کو ادیب کے طور پر متعارف کروانے کے لئے ایک ادیب کا ہی سہارا لیا "یو نو مشیما..
رائٹر.. ناولسٹ؟"

"آ آ.." اُنہوں نے زور زور سے جاپانی تنظیم کے مطابق ایک ہی ردھم میں سر
ہلائے.. ماشیما.. یوکیو ماشیما.."

"آئی.." میں نے اپنے سینے پر ہتھیلی جمائی "میں.. اُس کا بھائی ہوں.. ہز برادر.."

"آ آ" اُنہوں نے ایک مرتبہ سروں کو زور زور سے ہلانے کی ورزش کی.. اور
پھر جھکتی چلی گئیں— اُن کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا کہ میں نے کیا کہا تھا.. عام جاپانیوں کی
نسبت وہ قدرے دراز قد تھیں اور نیلی جینوں میں اُن کے بدن ورزشی اور متناسب تھے..
اور میں سانس اندر کھینچ کر اپنی بے ہنگم توند کو ظاہر ہونے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا
تھا..

"آپ.. وہیئر.. کہاں جا رہی ہیں؟"

"آ آ... ایورسٹ..." اور ایورسٹ کے تقدس میں وہ اور زیادہ جھکیں.. اور اُن
کے جھکنے سے مجھے کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا کیونکہ اُن کے بلاؤزز کے گلے کھُلے نہ تھے..

وہ دونوں ایورسٹ کے دامن تک جا رہی تھیں اور اُن کا قیام اس دور
بستی میں صرف ایک شب کا تھا۔

اور اُس لمحے یکدم مجھ میں جو تیس برس پیشتر کی شوخی اور لاپرواہی ذرا ا
وہ رخصت ہوئی اور میں ایک شہزادے کی بجائے ایک بوڑھا گداگر ہو گیا کہ میں
بین الاقوامی کانفرنس کی بے معنویت میں کھٹمنڈو میں قید تھا اور یہ دونوں وہاں جا رہی
جہاں مجھے جانا چاہئے تھا.. لیکن میں نے ابھی چونچ نہیں کھولی تھی.. میں انتظار کر رہا تھا..
میری سنو جیکٹ اور جاگرز بھی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے ابھی کھٹمنڈو میں چند
حقِ نمک ادا کرنا تھا.. اور پھر میں نے بھی اپنی ڈار کو چھوڑ کر پرواز کر جانا تھا.... ا
بلندیوں کی جانب کشور ہندوستان کی برفوں کے دامن میں جدھر ٹی ہاؤس آف آگسٹ
کی یہ دوشیزائیں جا رہی تھیں..

"کیا میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں؟" میں نے صرف اپنی محرومی کو دور کر
کے لئے اپنی اداسی سے پیچھا چھڑانے کے لئے یونہی اپنا رانجھا راضی کرنے کے لئے کہا۔

وہ پھر جھکیں.. "آ آ.. نو پرابلم.. شوئر شوئر.. ٹریکنگ ایجنسی.. وہ بندوبست کر
گے.. ہمارے گروپ میں آٹھ لوگ.. آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں.. ہاں.. شوئر!"

اور میں کیسے شامل ہو سکتا تھا..

میں نے اُنہیں سایونارا کہا اور اپنی میز پر واپس آ گیا اور سب سے شکایت آ
عینک سمیت شکایت کرتی ہوئی الزام لگاتی نظریں ہمشیرہ کی تھیں "تارڑ صاحب.." انہو
نے صرف اتنا کہا۔

"نہ.." میں نے شہادت کی اُنگلی بلند کر دی "مجھے پلیز کوئی طعنہ نہ دیجئے گا۔
کے سب آوارہ گرد اور کوہ نورد ایک ہی عمر کے ہوتے ہیں... عمر آشفتہ سری کے.."

ہوٹل سولٹی ہالیڈے اِن کے کمرہ نمبر 550 کی کھڑکی میں سے نصف شب کے
بعد کا جو منظر تھا اُس میں وادی کھٹمنڈو پر دُھند تھی اور اُس دُھند پر تیرتی اُس گھنٹی کی آوا
تھی جسے میں نے بجایا تھا اور اُس کی آواز نہ صرف اُس وادی پر مسلسل سفر کرتی تھی بلکہ
میری عمر کے کھنڈروں پر بھی گونجتی تھی..

اور یہاں.. کھنڈر ہونے سے پہلے کیسے کیسے شہر تھے جو آباد تھے..
کیسی کیسی بستیاں تھیں جن کے کُوچے محبت اور خانہ بدوشی کے وہ لمحے تھے
جن کے موزیک سے میری زندگی کی نامکمل تصویر اُبھرتی تھی— جانے اس تصویر میں ایسے
لمحوں کے مزید کتنے ٹکڑے فِٹ ہونے تھے۔ وقت کی کتنی کترنیں ابھی باقی ہیں جن کے
جڑنے سے یہ تصویر بالآخر مکمل ہو گی اور لمحہ فنا اُسے راکھ کر دے گا.. اُس راکھ میں سے
اگر میری صورت لالہ و گُل میں نمایاں ہو بھی گئی تو کیا.. وہ میں تو نہ ہوں گا.. شائد اگلے
لمحے.. جب میں ہوٹل سولٹی کے کمرہ نمبر 550 کی کھڑکی بند کروں گا تو بستر تک بھی نہ پہنچ
پاؤں گا.. عمر کی سُوئی یک لخت تھم جائے گی اور اجل میری تصویر کو مکمل کر دے گی... لیکن
ابھی اُن گم گشتہ شہروں اور بستیوں کے کھنڈروں پر دھوکا دربار میں بجائی جانے والی گھنٹی کی
گونج دُور تک جاتی تھی... اور کچھ صنم تھے جو ٹوٹتے تھے' اور کچھ بت تھے جن کے عشق
میں مَیں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا.. لیکن ایک لونگ گاڈیس کا درشن سرِشام تھا.. وہ کماری تھی یا
شاہ گوری تھی..

گھنٹی کی صدا عمر کے کھنڈروں پر بھی گونجتی تھی..

اور یہ گھنٹی کس کی فنا کا اعلان کرتی تھی.. فار ہوم دی بیل ٹولز...

”مینا اور طوطے... کس کس کو بلاوا آیا تھا“

اگلی صبح ناشتے کی میز پر سب سے آخر میں سُنہری بابا آئے اور گرتے پڑتے ا
آپ کو بمشکل سنبھالتے ایک سستی شراب پینے والے ٹُن بابا کی طرح ڈولتے ہ
کرسیوں کا سہارا لیتے ہوئے آئے اور ہمارے سامنے صوفے پر ڈھیر ہو گئے.. جیسے
لونگ گاڈیس کے ساتھ شب بسر کر کے آئے ہوں اور اب خلاص ہو چکے ہوں... سب
چہروں پر اُن کے لئے فکرمندی تھی کہ کہیں وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کے باعث ٹھنڈا
موسم کا شکار نہ ہو گئے ہوں..

”ضیاء صاحب خیریت تو ہے ناں؟“

”ہاں ہاں---“ اُنہوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا جو نچڑنے لگی-

”بھئی آپ اتنے سُرخ سُرخ کیوں ہو رہے ہیں؟“ ہمشیرہ کو تشویش لا
گئی-

”آپ کو ملیریا تو نہیں ہو گیا ضیاء صاحب..“ خالدہ اتنی دھیمی آواز میں بولیں
صرف اُن کے سندھی کُرتے میں جڑے شیشوں نے تو سُنا ہو ہم نہ سُن سکے-

”آج تو سیمینار کا آغاز ہو رہا ہے-“ ملک صاحب کو اپنی آفیشل ڈیوٹی یاد آ گئی

”ضیاء صاحب اگر طبیعت مضمحل ہے تو ہوٹل میں ڈاکٹر کی سہولت میسّر ہے؟“

”کیا ہوا ضیاء صاحب؟“ میں نے بھی پُوچھ لیا-

”بھئی آپ لوگ چُپ کریں تو میں بتاؤں---“ وہ ذرا اکڑ کر سیدھے ہو

کوشش میں ایک ”ہائے“ کر کے پھر سے سمٹ گئے ”میں دراصل سُوانا باتھ لے کر آ رہا
ہوں یعنی بھاپ کا غسل... رات بُکنگ کروا دی تھی- آج سویرے اُس بھاپ کے غسل
خانے میں داخل ہوا ہوں تو چند دوشیزاؤں نے دبوچ لیا...“

”کیسے دبوچا..“ فاروق فوراً دلچسپی لینے لگا-

”وہ... خیر دبوچا تو نہیں.. بازو تھام کر ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا جو ایک تنور کی
طرح دہکتا ہوا گرم تھا اور میں گندم کی روٹی کی طرح آہستہ آہستہ سُرخ ہو کر پکنے لگا.. پسینے
چھُوٹ گئے.. میں نے کچھ خفیف سی دوہائی دی' ہلکا سا احتجاج بھی کیا لیکن اُس غسل خانے
میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا. پھر ایک اور کمرے میں دھکیل دیا گیا جس میں کچھ سجھائی نہ
دیتا تھا.. بھاپ ہی بھاپ تھی اور میرا دم گھٹنے لگا.. بس یُوں سمجھ لیجئے کہ گرمی کی شدت سے
چمڑی اُدھڑ گئی اور.. آخر میں ٹھنڈے ٹھار پانی سے نہلا کر فارغ کر دیا... ہائے..“ اُن کا چہرہ
لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں رگیں سُرخ ہو کر پھٹنے کو آئی تھیں..

”آپ کو تکلیف کیا تھی سُوانا باتھ لینے کی؟“

”وہ دراصل..“ سنہری بابا ذرا خجل سے ہو کر بولے ”... وہ.. مفت میں تھا.. ہوٹل
کی جانب سے سپیشل گیسٹس کے لئے کمپلی مینٹری.. میں نے سوچا' ہو جائے...“

میں چونکہ ایک مدت پہلے ناروے میں ایک اور جنگل سُوانا باتھ کے تجربے میں
سے گذر چکا تھا.. اور وہاں بھاپ اور گرمی میں روسٹ ہونے کے بعد' اپنے آپ کو پتّوں
سے بھری شاخوں سے زدوکوب کرنے کے بعد ایک برفانی جھیل میں دھکیلا جا چکا تھا.. اس
لئے میں اُن کی حالت زار کو خوب سمجھتا تھا..

”بدن کے کسی نازک حصے کو تو ضُعف نہیں پہنچا..“ فاروق نے مُونچھیں
سنواریں..

”آہم..“ سنہری بابا نے بہت مائنڈ کیا اور موضوع فوراً بدل دیا ”ناشتے میں کیا
ہے؟“

”بہت کچھ ہے.. فرائی انڈے بھی ہیں!“

”حلال مُرغی کے ہیں؟“

”مُرغی انڈہ دینے کے بعد حلال یا حرام ہوتی ہے ضیاء صاحب..“

"بالکل... لیکن آئی سی میں کتنے کا ہے؟"

سُوانا باتھ کی گرمی سردی ضیاء صاحب کی قوت دانش مندی پر اثرانداز
تھی اور اُسے اثرانداز ہونے کے لیے کچھ زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑا ہو گا..

"یہ جتنے کا بھی ہے... نیپالی یا انڈین کرنسی میں.. ہمیں اس کے لئے ادائیگی
کرنی ہو گی"

"پھر بھی پُوچھ لینے میں کیا حرج ہے—"

"اگر آپ لوگ مائنڈ نہ کریں تو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہونے
صرف تین منٹ رہ گئے ہیں.. اپنے اپنے آخری دو چار انڈے کھائیں اور ناشتہ
کریں.." ملک صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے "دوسرے ملکوں کے ڈیلی گیشن
سے فارغ ہو کر کانفرنس ہال میں پہنچ چکے ہیں.. ہمیں پورے وقت پر پہنچ کر ایک مثال
کرنی چاہیے کہ ہم پاکستانی وقت کے کتنے پابند اور منظم ہیں.."

"چلیں جی مثال قائم کر آئیں.." فاروق کے ساتھ سب لوگ اُٹھ کھڑے
ہوئے—

ہوٹل سولتی کے شاہانہ اونچی چھت والے.. نوادرات سے سجے کانفرنس ہال
عین وقت پر داخل ہو کر ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم پاکستانی وقت کے کتنے پابند ہیں..
ہمارے اس کارنامے کو کسی نے بھی نہ سراہا کہ بقیہ ڈیلی گیشن ہم سے بہت پہلے پہنچ
تھے—

سٹیج کے پہلو میں کسی قدیم مندر سے حاصل کردہ ایک چراغ دان تھا جس
اُوپر ایک مٹی کا دیا روشن کر کے کانفرنس کے افتتاح کا اعلان کر دیا گیا—

نہایت متانت اور بردباری سے رسمی تقریریں کی گئیں جنہیں مندوبین
بنواسرائیل کی طرح کوہ طور سے نازل ہوتے آسمانی صحیفوں کی طرح نہایت خاموشی
عقیدت سے سُنا اور جب کبھی کسی مقرر نے لکھی گئی تقریر سے نظریں اُٹھا کر اُن کی جانب
دیکھا تو انہوں نے فی الفور تالیاں بجا کر اُس کے خیالاتِ عالیہ کی داد دی..

پھر کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین نے باری باری کھڑے ہو کر
تعارف خود کروایا..

میں.. احمد مسعود ہوں.. افغانستان سے.. تالیاں..

میں... شمس آرا حسن ہوں.. کنیز فاطمہ.. زہرا اُم حسن.. نور النہار بیگم.. میرا مترا
بنگلہ دیش سے.. تالیاں..

مائی نیم اِز.. دیپتی گلاتی.. رینو گھوش.. ستیندر پرکاش.. چترا.. فرام اِنڈیا..

آئی ایم رُوپا جوشی.. مان بہادر.. بینا نسبت— دُرگا رگمی.. نیپال سے..

اور طاہرہ— خالدہ— ضیاء— فاروق— سلمان اور تارڑ.. پاکستان پاکستان.. تالیاں!

اب یہ جو ہر مندوب کے کھڑے ہونے پر اپنا تعارف کروانے کے بعد دیگر
مندوبین فلک شگاف تالیاں پیٹتے تھے تو صرف ادب آداب کے لئے پیٹتے تھے ورنہ کوئی
نہیں سنتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اور کہاں سے آیا ہے..

اگر کوئی مندوب.. چلئے میں ہی سہی.. اُٹھ کر یہ تعارف کرواتا کہ خواتین و
حضرات میرا نام اُلو کا کان ہے اور میں مُرغستان سے آیا ہوں.. یا مُجھے شترمُرغ کہتے ہیں
اور میرا تعلق شترلینڈ سے ہے... تب بھی تالیوں میں اُتنی ہی گرم جوشی ہوتی.. اور ان میں
رُوپا جوشی بھی شامل ہوتی..

اور یہ کانفرنس کاہے کی تھی.

اگر میں حق نمک ادا نہ کروں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارے مالکوں نے.. ہم غریب
اور دانش سے عاری ملکوں کے بچوں کے لئے اور خاص طور پر بچیوں کے لئے جنہیں
نامعلوم وجوہات کی بنا پر "گرل چائلڈ" کا نام دیا گیا ہے' عقل و دانش سے معمور کرنے کے
لئے ایک کارٹون کردار جسے ہم "نینا" کہہ سکتے ہیں تخلیق کیا ہے.... یہ ایک ایسا کردار تھا
جس میں پاکستان— نیپال— ہندوستان— بنگلہ دیش— افغانستان اور سری لنکا کی جھلکیاں
دکھائی دیتی تھیں...

یہ کردار ہمارے پنجاب کے بقول ایک "پاڈی بچی" کا کردار تھا— ایک ایسی بچی جو
اپنی عُمر سے زیادہ عقلمند بننے کی کوشش کرتی ہے.... بچی نہیں رہتی نابالغ' بالغ بن جاتی ہے
اور لوگ اُس کی باتیں سُن سُن کر عاجز آ جاتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ وہ چُپ ہو
جائے.... اور وہ چُپ نہیں ہوتی.. ہمارے گورے مالکوں کا خیال تھا کہ وہ ہماری بچیوں کو ہم
سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس بچی کے بارے میں کہانیاں لکھنے کے لئے یورپ سے

امریکہ سے درآمد شدہ گورا اور گوری لوگ آئے' ہمارے کلچر اور رہن سہن کا تجز
کیا اور پھر ہمیں بنچ پر کھڑا کر کے بتایا گیا کہ ہمارا کلچر کیا ہے اور رہن سہن کس طر
اور ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا ہے—

کانفرنس کا آغاز تو ہو چکا تھا—

میرا خیال تھا کہ انہوں نے ہمیں مشاورت کے لئے بلایا ہے..

ہم سے مشورہ کر کے اس کارٹون کردار میں مناسب تبدیلیاں کر کے
ہمارے رواج اور موسموں کے قریب لے جانا ہے.. لیکن کھُلا یہ کہ اُنہوں نے جو
تھا' کر لیا اور بقول ہمشیرہ کے "تارڑ صاحب آپ زیادہ سنجیدہ ہو کر شمولیت اخ
کریں— ان لوگوں نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ کیا کرنا ہے.. ہمیں بلا
ہماری رائے سُن کر انہوں نے صرف کارروائی ڈالنی ہوتی ہے کہ فلاں مشہور مم
بھی اتفاق کیا ہے اور فلاں میڈیا ایکسپرٹ نے بھی وہی رائے دی ہے جو ہماری
آپ زیادہ سنجیدہ نہ ہوں—"

اور ہمشیرہ دی گرل گائڈ تو اس قسم کے سیمینارز کی جہاں دیدہ نہیں کانفر
تھیں...

گویا ہم محض ایک ربڑ سٹیمپ تھے اور چونکہ مالکوں نے ایئر ٹکٹ مہیا کیا
نیپال کے مہنگے ترین ہوٹل میں ٹھہرایا تھا جہاں سونا باتھ کی سہولت مفت تھی ا
ہمارا فرض صرف یہ تھا کہ لچھے دار توصیفی تقریریں کریں اور ٹھپہ لگا دیں—

لیکن میں ابھی اس پیچیدہ اخلاقیات سے ناواقف تھا— اس لئے جب مقا
کرسچن نے ایک سکول ماسٹر کی طرح اُنگلی اُٹھا کر مجھے بولنے کا حکم دیا تو میں نے
کہ.. اگر آپ نے یہ کردار تخلیق کیا ہے اور کردار نینا کا ایک طوطا ہے جو انسانوں
بولتا ہے تو یہ کوئی عجوبہ نہیں.. ہمارے مشرقی ادب میں بے شمار ایسی مثالیں موجود
میں جانور انسانوں کی طرف گفتگو کرتے ہیں.. کلیلہ دمنہ ایک ہزار برس پہلے لکھی
منطق الطیر میں پرندے گفتگو کرتے ہیں.. اور کپلنگ کی "جنگل بک" تو ابھی کل
ہے تو یہ کردار "نینا"..."

"نینا..." کانفرنس ہال میں ایک ایسی صدا بلند ہوئی جیسے نینا گم ہو گئی ہو

ں کی والدہ صاحبہ نے جُدائی کے درد میں پکارا ہو.. لیکن یہ نیویارک سے.. تنظیم کے
ہیڈکوارٹرز سے خصوصی طور پر ہم "نیٹوز" کو روشنی دکھانے کے لئے آئی ہوئی میری این کی
آواز تھی جس نے فوراً مجھے اور میری رائے کو ناپسند کیا "نینا... ایک معجزہ ہے.. نینا ایک
بے مثل کردار ہے.. جسے دنیا کے بہترین دماغوں نے لاکھوں ڈالرز کے خرچے کے بعد
تخلیق کیا ہے.. نینا.. ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی بچیوں کی قسمت بدل دے گی."

میری این کا بدن تو ڈائیٹسٹی اور بولڈ اینڈ بیوٹی فل ڈرامہ سیریلز میں پریڈ کرنے
والی بے رُوح.. سرد اور میکانکی جسموں والی.. صرف امریکیوں کے لئے.. شہوت انگیز
حسیناؤں کی طرح تھا.. لیکن اُس کا چہرہ.. بقول کسے... سپاٹ اور گرمی سے پھُوٹ جانے
والے دودھ کی پھٹکیوں کی طرح تھا.. اور اُس پر کسی کاریگر ترکھان کا رندہ پھرا ہوا لگتا تھا
کہ ناک نقشہ ڈھوکا دربار کے کسی فرشی دیوتا کی طرح ہموار ہو چکا تھا— ایک شہوت انگیز
بلیو فلم دیکھنے کے بعد بھی اُس کی جانب رجوع کرنے کے لئے کسی بہت بڑے انعام کا لالچ
ضروری تھا.

وہ اپنی ایک ہتھیلی اُٹھا کر یُوں تقریر کرتی تھی جیسے سالویشن آرمی کی کوئی
رنگروٹ چندہ مانگ رہی ہو.. وہ ایک ناقص کمپیوٹر کی طرح.. ایک خلائی مخلوق کی مانند'
لفظوں کو چباتی' ایک دِل آزار کانوں کو بیزار کر دینے والے تسلسل کے ساتھ ایک
روبوٹ کے لہجے میں... بلابلا... بابا.. نینا.. بلابلا.. کرتی چلی گئی— ہر فقرے کو وہ ایک بلند تان پر
ختم کرتی جیسے ایک کلاسیکی گویا سُر اُٹھاتا ہے اور وہیں ٹھہر جاتا ہے لیکن اُس کی آواز میں
اتنی سوزش اور مسلسل مکانکیت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ انسان اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر
کھڑا ہو جائے کہ بی بی اللہ رسول کے واسطے چُپ ہو جاؤ.. اور اگر پھر بھی چُپ نہ ہو تو
اسے ایک جھانپڑ رسید کر دے— جو ہم تو نہ کر سکتے تھے کہ وہ مالک تھے جنہوں نے ہمیں
اپنے خرچے پر بلایا تھا—

وہ یُوں بولتی تھی اور ناک میں بولتی تھی اور ایک موبل آئل سے عاری انجن کی
طرح بولتی تھی کہ.. ہم نے نیویارک میں فیصلہ کیا ہے...
ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی گرل چائلڈ پرابلم کے لئے فیصلہ کیا ہے..
آپ کی قسمت بدلنے کا فیصلہ کیا ہے..

اور یہ کارٹون کردار نینا ایسا ہے کہ دنیا بھر کے ٹیلی ویژن نیٹ ورک
خریدیں گے..

"اسے کم از کم پاکستان میں تو کوئی نیٹ ورک نہیں خریدے گا..." میں نے
ایک گھنٹے کی سمع خراشی و آزاری... اور بلا بلا.. کے بعد تنگ آ کر کہا.. میں اس لیے
بیزار ہو چکا تھا— کہ کانفرنس ہال کے باہر جو میرے تین دوست درخت تھے وہ بار با
بلاتے تھے کہ اندر کیا کر رہے ہو باہر ہمارے پاس آ جاؤ.

میری این نے اپنے چھلے ہوئے رندہ چہرے کو ایک صدمے کے ساتھ
جانب گھمایا اور ابرو چڑھا کر بولی "وہائی ناٹ؟"

"اینڈ وہائی..."

میری این نے فوراً مجھے خدا کا حرف وحشیوں تک پہنچانے والے اُس مش
طرح دیکھا جو دریائے ایمزن کے کنارے بسنے والے انڈینز اور افریقہ کے بقول ک
"ہارٹ آف ڈارک نیس" کے باسیوں کو دیکھتا ہے کہ اے نادانو' اے نیم انسا
تمہیں تہذیب سے آگاہ کرنے اتنی دور سے آیا ہوں اور تم اعتراض کرتے ہو..

میری این کے لئے میں ایک ایسا ہی نیٹو تھا جو نہیں جانتا تھا کہ اُس کی بھلا
سامان کہاں ہے..

یہ نیٹو اپنے حال میں مست تھا... اور میری این اپنی سپیریئر تہذیب اور یسو
صلیب تھامے اُس کے سر پر سوار تھی..

اور یہ کیسا نیٹو تھا جو اپنے نیٹو ہونے پر شرمندہ نہ تھا..

"وہائی ناٹ.." میری این نے مہذب حد تک اپنی آواز کو بلند کر کے مجھے
جانے سے روکا "اس لئے کہ... نینا کردار کو ایک انٹرنیشنل گروپ آف ایکسپرٹس
تخلیق کیا ہے... اور وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں.. آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ ن
ہے.. نینا ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی گرل چائلڈ کی قسمت ہے.."

اور میں ہندوستان کے ڈیلی گیشن کے ممبران کو فُل مارکس دیتا ہوں کہ ا
نے کرسچن اور میری این کو اس طرح صدقِ دل سے سپورٹ کیا کہ میں اُن کی ڈپلو
حیران رہ گیا "نینا.. جیسے آپ نے کہا' ایک معجزہ ہے.. کم از کم ہندوستان میں— اور ہم

سترہ ریاستوں میں نینا کارٹون اور تصویریں انٹروڈیوس کی ہیں اور وہاں کے لوگوں کے منہ
حیرت سے کھل گئے' وہ تو جانتے ہی نہیں تھے کہ گرل چائلڈ کو بھی تعلیم کی ضرورت
ہے— وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ گرل چائلڈ اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ ایک بوائے چائلڈ...
اور وہ پھر ایک باتیں کرتا طوطا... یہ ایک حیرت انگیز اور قابلِ فخر کارنامہ ہے.. بلکہ ہم تو یہاں
تک کہیں گے کہ کچھ بعید نہیں کہ نینا کردار کو ایک بھگوان کی شکل مل جائے اور اُس کی
پرستش ہونے لگے.. لوگ ابھی سے اُس کے پوسٹر کے سامنے سے ہاتھ جوڑ کر گذرتے
ہیں..."

میری این کے چہرے پر جو رندہ پھرا ہوا تھا اُس کے اثرات کم ہونے لگے اور
اُس کے نین نقش اُبھرنے لگے اگرچہ اُن کے اُبھرنے سے بھی اُسے چنداں فائدہ نہ
ہوا— وہ انڈین ڈیلی گیشن کی معروضات پر مربیانہ انداز میں سرہلاتی تھی اور بار بار میری
جانب دیکھتی تھی کہ اے مردِ ناہنجار سُن' نینا ایک خدا ہونے کو ہے:

کرسچن ایک پرائمری سکول ٹیچر کی طرح نہایت اُلفت بھری نظروں سے اِس
اُستانی کو تکتا تھا—

اور اُس کے تکنے میں جو راز پنہاں تھا وہ بہت بعد میں آشکار ہوا...

یہ سینہ گزٹ کی خبر تھی کہ کرسچن جو اتنا اچھا کرسچن نہ تھا اُس نے کانفرنس کے
دنوں میں اپنی ہندوستانی بیوی کو نہایت اہتمام کے ساتھ کلکتہ روانہ کر دیا تھا..

صرف اس لئے کہ میری این اُس کے ساتھ قیام کر سکے اور یہ لفظ "قیام"
نہایت ذو معنی ہو سکتا ہے اور ہم نیٹو لوگ اس کی معانی میں کیا جائیں.. بلکہ ذرا ہلکے پھلکے
انداز میں یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ یہ میلہ لگایا ہی اس لئے گیا تھا کہ دونوں پریت لڑی میں چند
دنوں کے لئے پروئے جائیں..

لنچ کی میز پر جب ہم جھٹکا گوشت اور گردن مروڑ مُرغ سے پرہیز کرتے ہوئے
نہایت بساند دیتی دال اور سخت چاول نگلتے تھے تو ملک صاحب اپنے خوب رُو چہرے کے
ساتھ شکائت کرتے تھے—

"سَر آپ جانتے ہیں کہ آپ ہمارے ڈیلی گیشن کے نہایت اہم ممبر ہیں اور سَر
آپ جانتے ہیں کہ میں نے لوکل چیف کرسچن سے آپ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ

آپ پاکستان کے لیری کنگ ہیں.."

"اور میں نے ہنس کر کہا تھا کہ نہیں لیری کنگ امریکہ کا.. تارڑ ہے"

"سَر اتنا تکبر بھی اچھا نہیں ہوتا.."

"یہ تکبر نہیں تشخص ہے ــــ"

"لیکن سَر آپ ذرا یہ بھی تو دیکھیں کہ اِنڈین ڈیلی گیشن کس طرح اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے.."

"صرف اس لئے کہ سارا پروجیکٹ اُن کے ذمے تھا اور اُن کے کار لکشمن نے.. جس کا میں بھی مداح ہوں اس پروجیکٹ سے لاکھوں ڈالر کمائے ہیں.. پا کے حصے میں کیا آیا ہے..."

"پھر بھی سَر.. ہم نے آپ کو یہاں مدعو کیا ہے آپ پر رقم لگائی ہے تو... آپ پر ذرا جبر کریں اتنا سچ نہ بولیں... وہاں ٹیلی ویژن پر بھی تو آپ مفاہمت کرتے پاکستان کی عزت کا سوال ہے سَر.."

چنانچہ ہم سب آفٹرنون سیشن میں طوطے ہو گئے.. جو وہ چاہتے تھے وہی بو گئے اور میری این نے ہم پر اُن کفار کی طرح پاکیزگی کی نظر ڈالی جو بالآخر راہ راس آ جاتے ہیں..

البتہ لنچ کے دوران میرا دل بہت دُکھا..

میرے بدن میں دسمبر کے جو گھاؤ تھے اُن میں پھر سے ٹیسیں اُٹھنے لگیں..

دسمبر جُدائی کا اور رُسوائی کا مہینہ تھا اور میں اُسے نہ بھولتا تھا.. اور جب ڈا رُوم میں بنگلہ دیشی وفد کی خواتین داخل ہوئیں تو مجھے وہ جُدائی وہ رسوائی پھر سے یاد آ لنچ کے دوران وہ ہم پاکستانیوں سے ایک مناسب فاصلے پر رہیں.. وہ میرے وطن کی جس کی علیحدگی میں میرا کوئی دوش نہ تھا.. میری تو آرزو تھی کہ میں اُن کے شکوے کچھ اُنہیں کہتا' کچھ اُن کی سنتا.. اُن کی گلے گزاریوں کے سامنے شرمندگی سے سر لیکن ایک اجتماعی جرم پر ایک فرد کی شرمندگی کوئی معانی نہیں رکھتی.. اُن کے پاس بھو کو اتنا کچھ تھا کہ وہ کیا کیا بھولتیں.. ہتھیار ڈالنے سے ایک روز پیشتر فوج نے جن دانشوروں' ادیبوں اور صحافیوں کو شب کی تاریکی میں گھروں سے نکال کر ہلاک کر

اور اُن کی تعداد سینکڑوں میں تھی وہ اُنہیں کیسے بھول جاتیں.. اور کیا ہم بھولتے اگر ہمارے فیض– منیر– قاسمی– مجید امجد– عبداللہ حسین– نثار عثمانی اور مجید نظامی کو یُوں فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے قتل کر دیا جاتا.. میں اُنہیں ایک گہرے دُکھ کے ساتھ دیکھتا تھا– یہ ایک الگ میز پر کیوں براجمان ہیں– آج میں اور وہ ایک ہی پلیٹ فارم پر کیوں نہیں.. آپ کے خطے میں جو گئے وہ سب کے سب آپ کی نسل بدلنے کے ارادے سے تو نہیں گئے تھے.. سبھی "ٹائیگر" تو نہیں تھے– اُن میں ٹیگور کے گیت گانے والے بھی تھے– نذرل کے شیدائی بھی تھے.. بلوچ ایسے سپاہی بھی تھے جنہوں نے ہتھیار اُٹھا کر آپ کو ہلاک کرنے سے انکار کیا تھا اور کورٹ مارشل کے سزاوار ہوئے تھے.. ہم سب تو ایسے نہ تھے..

ہم سے بات تو کریں.. کیا اتنی برساتوں کے بعد بھی خون کے دھبے نہیں مٹے...

اُن کا روّیہ نہ سرد تھا اور نہ اُس میں کوئی گرم جوشی تھی.. ایک لاتعلقی تھی جو زیادہ جان لیوا تھی.. خون کے دھبے ابھی تک نہیں مٹے تھے... ابھی کچھ اور برساتوں کی ضرورت تھی–

ہندوستانی وفد میں میڈیا کے نمائندے تھے.. انفرمیشن منسٹری اور دیگر سرکاری اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے.. اور نیتا پروجیکٹ میں معاونت اور ملازمت کرنے والے ایسے خواتین و حضرات تھے جنہوں نے اپنی روزی روزگار کے لئے بہرطور ان گورے آقاؤں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا تھا– رِدپتی گِل دتی... نہایت گوری چٹی' سرمہ زدہ آنکھوں میں حیرت بھرنے والی اور قد میں بُری طرح مار کھاتی ہوئی ایک پلی پلائی ہنڈلی تھی نہایت دوستانہ رویہ رکھتی تھی اور اُس کے آباؤ اجداد سرگودھا سے آئے تھے۔

"آپ دہلی میں رہتی ہیں تو اہلِ زبان آپ کے شین قاف پر اعتراض تو نہیں کرتے.. ہمارے ہاں تو کرتے ہیں.."

"وہ کیوں کرنے لگے.. وہ تو لکھنؤ یا احمد آباد وغیرہ میں رہتے ہیں.. ہمارا دہلی تو پنجابی سٹی ہے.."

یہ ایک اور کلچرل شاک تھا کہ دہلی.. غالب کا دہلی.. اب ایک پنجابی سٹی تھا..

مجھے ایک عرصہ بیت چکا جب میں دہلی میں تھا اور وہاں میں نے اپنے تئیں اپنی

اردو نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی لیکن اُس کے گلی کُوچوں میں نہ تو کوئی ایسی شکل نظر آئی جو تصویر نظر آتی اور نہ شین قاف کی درستگی کا کوئی موقع مل سکا کسی کے ساتھ میں نے زبانِ اردو میں رکھ رکھاؤ اور اہتمام سے بات کی تو جواب پنجابی میں آیا..

کہا جاتا ہے کہ میرے جیسے کوئی صاحب دہلی میں کوئی کُوچہ تلاش کر رہے ایک صاحب سے پُوچھا "کیوں صاحب.. کُوچہ باقر علی کو یہی راستہ جاتا ہے"

جواب آیا "آہو..."

اب اُن کے کچھُ پلّے نہ پڑا کہ یہ "آہو" کیا ہے اور کیا اس کا مطلب یہ یہ راستہ کُوچہ باقر علی کو جاتا ہے.. یا راستہ کُوچہ باقر علی کو نہیں جاتا.. ایک اور صاحب دریافت کیا تو اُنہوں نے بھی سر ہلا کر ایک گونج دار "آہو--" کہا.. جب تیسرے سے پُوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا "جی ہاں قبلہ آپ درست سمت میں جا رہے ہیں۔ راستہ کُوچہ باقر علی کو جاتا ہے" تو یہ صاحب خوش ہو کر بولے "اجی حضت آپ اور راقِ مصور دہلی میں پہلے شخص ملے ہیں جو ماشا اللہ نہایت تہذیب یافتہ ہیں.."

اس پر اُن صاحب نے ایک پاٹ دار آواز میں کہا "آہو..."

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سندھی سٹی کراچی ایک اردو سٹی بن چکا قلعہ معلیٰ کی زبان اردو کا رکھوالا دہلی اگر ایک پنجابی سٹی بن چکا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔

وہاں ستیندر پرکاش بھی تھا... پتہ نہیں کس منسٹری میں کیا کرتا تھا لیکن انگریزی بولتا تھا تو اُسے ایک ایسے مترجم کی ضرورت پڑتی تھی جو اُس کی انگریزی انگریزی میں ترجمہ کر سکے.. لیکن بے دریغ اور بے تکان بولتا تھا.. ہمارے ہاں اپنے آپ آزار میں ڈال کر اگلی صُبح قبض کا خدشہ مُول لے کر مُنہ بگاڑ کر درست لہجے میں انگریزی بولنے کا تردّد کیا جاتا ہے.. لیکن ہندوستانیوں کو اس قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہے.. وہ سلسلے میں کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہیں اور جو بیان کرنا چاہتے ہیں بے دریغ بیان دیتے ہیں..

رینو گھوش.. ایک ایسی خاتون جو گوروں کی رگ رگ کو جانتی تھی.. اور رگ حمیت کو فراموش کر کے اُن کی اُسی رگ پر ہاتھ رکھتی تھی جو اُن کی دُکھتی رگ

ہوتی تھی.. رینو کے بال خضاب زدہ ہونے کے باوجود اُس کی خزاں رسیدگی کا مداوا نہیں کر سکتے تھے.. کھنڈر بتاتے تھے کہ کبھی عمارت عظیم نہ سہی ایسی تو رہی ہوگی کہ اُسے رُک کر صرف ایک پل کے لئے دیکھا جا سکے.. لیکن اب ان کھنڈروں کے اندر جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا..

دِپتی گل دتی سے میں نے سلاد کے پتّے چباتے ہوئے.اور بساند آمیز دال چاول نگلتے ہوئے پُوچھا "آپ اس کانفرنس میں کیسے آئیں؟"

"مُجھے تو پشوپتی ناتھ جی نے بلا لیا.." اُس نے اپنے ٹھگنے قد کے باوجود ذرا اِٹھلا کر کہا- میں چونکہ ان ناتھ جی کی کرامات کا تذکرہ اُس ٹیکسی ڈرائیور سے سُن چکا تھا اس لئے فوراً متوجہ ہو گیا "کیسے بلا لیا؟"

"نیو دہلی میں میرے گھر کے سامنے.. ایک چوکور لان ہے.. پھولوں کی کیاریاں ہیں اور کچھُ گھاس ہے- ایک سویر میں اُٹھی' کھڑکی کے پردے ہٹائے تو وہاں بہت ساری گائیں گھوم رہی تھیں اور گئو ماتا کی بھی مجبوری ہے کہ وہ لید بھی کرتی ہے.."

"واقعی" خالدہ سرگوشی نہایت سنجیدگی سے حیران ہو گئی..

"سُنا ہے اُن کا پیشاب بھی مقدس ہے اور اُس کے پینے سے بندہ سیدھا سُورگ میں جاتا ہے؟" فاروق نے پُوچھا...

"ہم سب کا سوُرگ الگ الگ ہے.. میں جانتی ہوں کہ ہمارے ہاں جو مسلمان ہیں وہ اپنے پیر کی تھُوک کو چاٹ لیتے ہیں.. تو ہم سب کا سُورگ الگ الگ ہے.."

فاروق چپُ ہو گیا..

"اور مُجھے..." دِپتی نے اپنے گورے چٹے سینے پر ہتھیلی رکھ کر کہا "مُجھے آپ سُورگ بھی دو تو بھی میں گئو ماتا کے پیشاب کو پینا تو کیا سونگھوں بھی نہیں.. یہ کون آپ کو ہندوؤں کے بارے میں اس قسم کی باتیں بتاتا ہے؟"

"ہم خود ہندوؤں کے بارے میں اپنے آپ کو اس قسم کی باتیں بتاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہماری بقا اسی میں ہے.."

"تو میرے گھر کے سامنے جو لان تھا اُس میں گئو ماتا لید کرتی پھرتی تھیں تو مُجھے سخت بُرا لگا.. بہت گھن آئی کہ یہ یہاں گندگی پھیلاتی ہیں... اور میں نے کھڑکی بند کر دی..

اور اُسی دوپہر مجھے فون آگیا کہ آپ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے چُن لیا گیا ہے تو مجھے سخت شرمندگی ہوئی..."

"کیوں شرمندگی ہوئی؟"

"میں نے سوچا کہ جدھر سے بلاوا آیا ہے.. کھٹمنڈو شہر سے.. وہیں تو پشوپال ناتھ کا مندر ہے جس میں جانور گھومتے ہیں.. بندر— سؤر— بھیڑ بکریاں اور گائیں بھینسیں کرتی ہیں.. یاتری اُن کے بھی چرن چُھوتے ہیں اور وہاں اُس مندر کی پوترتا میں گائیں کرتی ہیں پیشاب کرتی ہیں لیکن پشوپال مائنڈ نہیں کرتے.. اور میں اپنے گھر کے سامنے لان ہے اُس میں لید کرنے والی گائیوں کو مائنڈ کرتی ہوں.. اور اس کے باوجود اُنہوں مجھے کھٹمنڈو بلا لیا ہے.. آپ جانتے ہیں ناں کہ "پشو" کا مطلب جانور ہوتا ہے.. پشوپال جانوروں کو پالنے والا.."

"جی ہاں.. میری ماسی صاحب جب ہم بچوں کے میلے کچیلے اور گندے مند رہنے سے اور غلیظ جوہڑوں میں نہانے سے عاجز آ جاتی تھیں تو کان دبوچ کر کہتی تھیں "اوئے تم بندے ہو کہ پشو." اور اُن زمانوں میں ہمارا خیال تھا کہ "پشو"... کشمیری پشمینے کی کوئی قسم ہے.."

"تو بس اُسی دوپہر کو بلاوا آ گیا.."

"اچھا..." میں سبزی ترکاری اور دال چاول کو نگلتے ایک کھیت میں مُنہ مارتے کی طرح بیزار ہو چکا تھا "آپ کو بھی بلاوا آتا ہے؟"

"کیوں ہمیں نہیں آ سکتا؟"

"پتہ نہیں.. لیکن آپ تو ہندو لوگ ہیں— بلاوا تو اُدھر سے.. مکے مدینے سے آتا ہے.."

"اچھا.." دیپتی کی سُرمہ زدہ آنکھیں اچنبھے اور بے یقینی سے پھیلتی گئیں "لیکن ہمارا خیال تھا کہ بلاوا صرف پشوپال ناتھ جی کی جانب سے ہی آتا ہے".. اُس کی حیرت سے بڑی تھی—

بلاوا دراصل کس کو آتا ہے.. اس کا فیصلہ کون کرے..

ہر پختہ ایمان والا شخص یہی کہتا ہے کہ بلاوا صرف مجھے آتا ہے..

مہاتمابدھ کو جنگل سے بلاوا آتا ہے کہ اپنا راج پاٹھ ترک کر اور ادھر آ جا..

مُوسیٰ کو کوہ طور بلاتا ہے..

رام کو سری لنکا سے پکارا جاتا ہے...

گورونانک کو فرید بلاتا ہے کہ اُٹھ فریدا سُتیا صُبح نماز گذار..

منصور حلاج کو دار بلاتی ہے کہ آ... اپنے نعرہ انا الحق کے ساتھ آ اور مفتیان دیر و حرم کے فتووں کی پاداش میں سُولی پر سج جا اور جب تیرے ہاتھ پاؤں قلم ہوں اور تب اذان کی صدا بلند ہو تو اپنے خون سے اپنے چہرے کو وضو سے آشنا کر. اور نماز گذار..

کسی کو حسین بلاتا ہے اور وہ لکڑی کے صندوقوں میں لیٹ کر کراچی کے ساحل سے رواں ہونے کی کوشش کرتے ہیں..

اور کبھی کوئی سلطان باہو.. اُس پکار پر دھیان رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ... اگر رب نہانے دھونے اور وضو کرنے سے ملتا ہو تو وہ مینڈکوں اور مچھلیوں کو مل جائے.. اگر وہ ذات جنگل بیلے میں گُم ہو جانے سے مل جائے تو ڈھور ڈنگر اور مویشیوں کو مل جائے.. یہ نفل نماز زنانے کام ہیں اور اونچی آواز میں وہی اذان دیتا ہے جس کی نیت کھوٹی ہو.. ہُو!

اور جب میرے ایک بزرگ اور پسندیدہ شاعر موہن سنگھ کو بلاوا آتا ہے تو وہ "ساوے پتر" میں کہتا ہے کہ رب اِک گورکھ دھندا.. جس کی گتھیاں کھول کھول کے کافر ہو جائے بندا.. اور لائی لگ مومن کی نسبت.. ایک طے شدہ راستے پر آنکھیں بند کر کے چلنے والے مومن سے.. کھوجی کافر چنگا... وہ کافر بہتر ہے جو کھوج میں رہتا ہے—

بلھے شاہ نے بھی یہی پکار کی تھی.. کی جاناں میں کون او بلھیا..

شائد میں بھی وہی کافر تھا جو کھوج میں رہتا تھا..

تو بلاوا کس کو آتا ہے... اس کا فیصلہ کون کرے..

اس نازک اور گورکھ دھندے لمحے میں خالدہ سرگوشی نسوانی کمزوریوں کی کمک لے کر پہنچ گئی "ویسے دیپتی.. اور آپ کو دیکھ کر مجھے دیپتی نول یاد آ جاتی ہے.. یہ جو پنک سویٹر آپ نے پہن رکھا ہے اس کا رنگ آپ کے رنگ سے بہت سُوٹ کرتا ہے... اور

آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں.."

دیتی اپنے فربہ اور مختصر قد کے ساتھ سرخوشی میں جتنا ہنس سکتی تھیں، ہنس
اور میں نے فوری طور پر نوٹ کیا کہ اگر وہ کھڑی نہ ہوں اور دوپہر کے کھانے کی
یونہی براجمان رہیں تو اُس پر کوئی مڈل ایج بندہ باآسانی عاشق ہو سکتا تھا۔

"رئیلی.." دیتی اتنی "پیاری لگ رہی ہیں" کے کومنٹ پر ذرا بلش کر گئیں۔
قدرے سُرخ ہو گئیں اور پھر اپنے پنک سویٹر پر ایسے ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے ایک ریچھ
قدرے گورا چٹا ہو اور آنکھوں میں سُرمہ لگاتا ہو اپنی من پسند ریچھنی سے تفصیلی ملا
کے بعد اپنی کھال پر ہاتھ پھیرتا ہو..

چنانچہ.. جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا آفٹرنون سیشن میں ہم سب طوطے ہو گئے
لیکن ہم کوئی ناتجربہ کار طوطے تھوڑی تھے کہ یکدم چھوٹتے ہی اُن کی ہاں میں ہاں اور
میں ٹیں ملانے لگتے..

ہم تادیر اپنی دانشمندی واضح کرنے کے لئے سر ہلاتے رہے.. پھر کہیں جا کر
نے اپنا پہلا "ٹیں" کیا۔

اور پھر ذرا توقف کے بعد دوسرا "ٹیں".. اب ہمیں نینا کے کردار میں وہ خو
نظر آنے لگیں جو اُسے کسی صوفی بزرگ کے رُتبے کے آس پاس لے جاتی تھیں۔
ہمیں مرحومہ ڈیانا کی کوئی گمشدہ کزن نظر آنے لگی اور نیپالی نژاد فلم ایکٹرس منیشا کوئرالہ
نزدیکی عزیزہ لگنے لگی۔ میری این نے ہمارے سارے گناہ معاف کر دیئے اور اپنے رگڑ
ہوئے چہرے کی تختی پر ایک شاباشی مسکراہٹ پھیلا لی۔ ہمیں بھی اپنی غلطی کا احساس
کہ ہم بھی کیسے ناشکرے لوگ ہیں کہ اپنے مہربانوں قدردانوں پر تنقید کرتے ہیں جن
وجہ سے ہم نے پچھلی شب ایک لونگ گاڈیس کو دیکھا تھا۔ دھوکا دربار کی دھوکا شام
کاماسترا کے آسنوں کی زیارت کی تھی... ہم کیسے ناشکرے تھے..

اور اس کے باوجود میری نگاہ ونیشن بلائنڈز سے نابینا کی گئی اُس کھڑکی کی جا
جاتی تھی جس کے پار وہ تین شگوفہ بردار میرے برادر درخت تھے جو صرف میرے
دار تھے... باہر کیا کیا ہے اور میں کہاں بیٹھا ہوں اور صرف حق نمک ادا کرنے کے
مجبوراً بیٹھا ہوں۔

"کے ٹو کہانی" کے ایک ساتھی عامر نے اپنے صنعتی کلچر کی جکڑبندی سے آزاد
ہونے کے لئے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک ٹریک کرنے کا پروگرام بنایا "تارڑ صاحب
آپ چلیں گے؟"

"میں اگرچہ اُس کوہ نورد سے ذرا سی بہتر جسمانی حالت میں ہوں جو نیم معذوری
کی حالت میں بیساکھیاں ٹیکتا پورٹرز کے کندھوں اور باہوں کا سہارا لیتا کے ٹو بیس کیمپ
تک جا پہنچا تھا.. تو اب سوال ایورسٹ کا ہے تو ہم کتنی ہائٹ تک جائیں گے..؟"

"تقریباً انیس ہزار فٹ تک..."

میں نے فوراً حساب لگایا کہ میں آج تک زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر پہنچ کر
زندہ بچا ہوں.. شائد ہسپر پاس' تقریباً سترہ ہزار فٹ اور وہاں میرا سانس خیمے کے پردے
سے ٹکرا کر برف کی پھوار بنتا تھا اور میرے چہرے پر چھڑکاؤ کرتا تھا اور سانس کبھی آتا تھا
اور کبھی نہیں آتا تھا اور کبھی شائد ٹھہر بھی جاتا تھا تو اس میں اگر ہزار دو ہزار فٹ مزید جمع
کر لئے جائیں تو کیا نتیجہ نکلتا ہے.. تجربہ کار کوہ پیماؤں نے خبردار کیا تھا کہ اٹھارہ ہزار فٹ
کے بعد "ڈیتھ زون" شروع ہو جاتا ہے اور وہاں آپ کے پھیپھڑے کسی بھی لمحے بغیر
وارننگ کے بھک سے اُڑ سکتے ہیں اور اُن کی اُڑان کے ہمراہ جو شے پَر پھڑپھڑاتی چلی جا
رہی ہو گی وہ آپ کی رُوح ہو گی... چونکہ میں اپنی رُوح کو اچھی طرح جانتا تھا اور یہ جانتا
تھا کہ میری رُوح ذرا سا رُوح پرور نظارہ بھی دیکھ لے تو میرے بدن کو چھوڑ کر مائل پرواز
ہو جاتی ہے جیسا کہ اُس نے وادیٔ سوختر آباد میں کیا تھا اس لئے قابل فہم طور پر میں ذرا
دل گرفتہ اور پریشان ہو گیا "پتہ نہیں میں اتنی بلندی سہار سکتا ہوں کہ نہیں..."

اور عامر نے مجھے جو جواب دیا میں اُس نیک سیرت نوجوان سے اُس کی امید نہ
رکھتا تھا "تارڑ صاحب محبوب چاہے کتنا ہی فربہ کیوں نہ ہو اُس کا وزن سہارا جاتا ہے"

"لیکن یہ تو... میرا مطلب ہے بہت مہنگا سودا ہو گا..."

"آپ نے اپنے خرچے سے صرف کھٹمنڈو پہنچنا ہے اور اُس کے بعد تمام
انتظامات... ایک گھنٹے کی ایئر فلائٹ' وہاں سے آگے چار دن کا پیدل ٹریک.. کھانا پینا.. خیمے'
پورٹر اور گائڈ... یہ سب میرے بزنس کونیکشن کے ذمّے ہوں گے۔ آپ اپنے ہمراہ صرف
ایک سلیپنگ بیگ لے کر جائیں گے۔"

میں نے اُس شام اپنے سلیپنگ بیگ کو رُک سیک میں سے نکالا اور
اپنے سینے کے ساتھ لگا کر ایک سرد آہ بھری..

اور عین آخری لمحوں میں کیا وقوعہ ہوا.. عامر اپنے صنعتی کلچر کی کسی مشی
میکانزم میں پھنس کر بے بس ہو گیا "تارڑ صاحب مینوں معاف کر دیو.. میرا نکلنا نا مم
گیا ہے... لیکن آپ چلے جائیں' کھٹمنڈو میں بقیہ گروپ آپ کا انتظار کر رہا ہے..."

میں نے اپنے آپ کو کھٹمنڈو سے پرے ایک غیر ملک اور غیر خوراک او
خداؤں والی سرزمین میں مکمل اجنبیوں کے ہمراہ کوہ نوردی کی مشقت کے شب و رو
مبتلا دیکھا تو اس تصویر کے ساتھ مفاہمت نہ کر سکا.. "نہیں عامر... تمہارے بغیر نہیں"

میرے گمان میں یہ تو تھا کہ میں کبھی اتنے برسوں کے بن باس کے بعد کہی
کہیں لوٹوں گا— یورپ.. ایشیا.. کہیں نہ کہیں... لیکن کھٹمنڈو تو میرے سان گمان میں
تھا..

مُجھے بھی بلاوا آ گیا تھا—

میں نے سوچا اِس پشوپتی ناتھ جی کا پتہ کرنا چاہیئے کہ کیا یہ اپنے ماننے والوں
بلاوے بھیجتے ہیں یا دیگر ہم جیسے کفار کے لئے بھی ایک الگ سیکرٹریٹ کھول رکھا ہے—
ضمیر جعفری کا ایک مصرعہ ہے کہ — بام تک آئے مئے گلفام تک آئے نہیں
میں بھی کھٹمنڈو کی بام تک تو آ گیا تھا.. لیکن ایورسٹ کے دامن کی مئے
تک ابھی نہیں پہنچا تھا... اُس مئے گلفام تک پہنچنے کا سامان میرے کمرے میں سوٹ
کے نیچے بے آرام ہو رہا تھا... سنو جیکٹ اور جوگرز.. اُن کا بس چلتا تو وہ خود چلنے
کیونکہ وہ اپنی حقیقت میں نہیں تھے ایک لایعنی آرام کی عافیت میں تھے—

مئے گلفام کا بلاوا کب آئے گا؟

مے خوار منتظر تھے.. اُن کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور وہ زاہدوں کی مجلس میں کرو
بدلتے تھے.. اور مئے گلفام کا بلاوا نہ آتا تھا—

نقل کفر والی بات ہے کہ کفر نہ باشد.... ایک لاہوری مائی صاحبہ اندرون شہ
کٹڑی میں سے زندگی میں پہلی بار باہر نکلیں کہ اُنہیں بھی بلاوا آ گیا تھا اور مسجد نبوی
زار وقطار روتی ہوئی پائی گئیں۔ کسی نے اُن کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر پوچھا مائی جی

کیوں رو رہی ہیں؟ مائی کہنے لگیں' پتر میں لاہور سے آئی ہوں.... اور آج داتا صاحب کا
عرس ہے اور میں کہاں بیٹھی ہوں.... تو میں بھی اُس جاہل مائی کی طرح تھا.... اور اپنے آپ
سے پوچھ رہا تھا کہ.... میں کہاں بیٹھا ہوں.... یہ پوچھ رہا تھا جب کرسچن نے پرائمری سکول
ٹیچرز والی اُنگلی اُٹھا کر اُسے میری طرف سیدھا کیا "مسٹر تزار تمہارا کیا خیال ہے؟"

مسٹر تزار نے اگرچہ پچھلے دو گھنٹے سے کانفرنس کی پُر مغز تقریروں کا ایک لفظ بھی
نہیں سُنا تھا اور اپنے سامنے رکھی آفیشل نوٹ بک پر چڑیاں طوطے بناتے رہے تھے یا
کھڑکی کے باہر اپنے دوست درختوں کی جدائی کے غم میں چشم نم رکھتے تھے' ایورسٹ کے
بلاوے کا انتظار کرتے تھے.... اور پشوپتی ناتھ جی کے چرنوں کو چھونے کے ملحدانہ عمل کے
بارے میں غور کرتے تھے' وُہ کیا بتاتے کہ اُن کا کیا خیال ہے.... لیکن ایک مکار سیاست
دان کی طرح اور وہ کونسا ایسا سیاستدان ہے کم از کم ہمارے ملک میں جو مکار نہیں ہوا
سوائے بابا جناح کے.... میں نے کھانس کر اور اُنگلی سے اپنی ابرو سنوار کر کہا.... "اگر ہم
معروضی حالات کے بہاؤ کا تنقیدی جائزہ لیں اور صدق دل سے کائنات میں جنم لینے والی
آفاقی تبدیلیوں کو بروئے کار لا کر اُن بے پایاں مسائل کا تجزیہ کریں جو تیسری دنیا کے گرد
غربت' جہالت اور بیماری کی صورت میں سیاہ بادلوں کی طرح منڈلا رہے ہیں اور اُن کی تہہ
تک پہنچنے کے لئے اِک سعی بے مثال کریں تو انسانی جذبوں کی توقیر صرف اُس صورت
میں ہو سکتی ہے جب ہم انسانیت کی مرتی ہوئی لاش پر.... بلکہ لاش تو پہلے سے مر چکی ہوتی
ہے ہم انسانیت کے بیمار بدن پر نوحہ کناں ہوں تو پھر ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ
کردار.... آپ کا تخلیق کردہ نیٹا کردار ہی ہمہ گیر آفاقیت کا مظہر یہ کردار ہی اُمید کی آخری
کرن ہے.... اور...."

اور یہ سب کچھ میں نے بہ زبان انگریزی ادا کیا اور نہایت دِقّت سے ڈھونڈھ
ڈھونڈھ کر وہ لفظ استعمال کئے جو شاید ملکہ وکٹوریا کے زمانے میں بھی متروک ہو چکے
تھے.... میری دانشوری اور علمیت کی دھاک مندوبین کی جڑوں میں بیٹھ گئی اور ہر سُو ایک
عقیدت آمیز سناٹا چھا گیا.... آپ کے نظریات اور عقائد کی تائید میں کوئی دوسرا شخص
چاہے کتنی ہی بے سروپا گفتگو کیوں نہ کر رہا ہو آپ اُسے آب حیات کی طرح حلق میں
اُنڈیلتے جاتے ہیں اور سر ہلاتے چلے جاتے ہیں.... اور کرسچن اور میری این اور دیگر ڈیلی

گیٹ سرہلاتے چلے گئے.... طوطا اگر راہ راست پر آجائے تو کیا کمال طوطا ہوتا ہے۔

صرف باہر جو تین درخت میرے دوست اور برادر تھے وہ جانتے تھے کہ
لایعنی گفتگو کر رہا ہوں' میں نے وینیشن بلائنڈز کی نابینائی میں پوشیدہ اُن تینوں کی
دیکھا اور ایک بے ایمان لفنگے کی طرح آنکھ ماری کہ بس مٹھی بند رکھو اور چپ رہو
کسی کو نہ بتانا کہ میں لفظوں کی سیڑھیاں چڑھتا چلا جاتا ہوں اور اُن میں کوئی معانی
ہیں۔

اور شاید اُن میں سے کسی ایک کا ایک شگوفہ فٹ پاتھ پر گرا.... ایک گالی
کی طرح جو مجھ جیسے جعلی دانشوروں کی مفاہمت پسندی اور کمرشل ازم کے مظاہر
ہمیشہ گرتا ہے اور ایسا شگوفہ تیزاب کی طرح گرتا ہے اور فٹ پاتھ میں چھید کر دیتا ہے
لیکن میں قطعی طور پر مجرم نہیں محسوس کر رہا تھا کہ میں نے حق نمک ادا
تھا۔

"شراب خانے میں قمار خانے میرے بغیر نہ جانا..."

ہم اُس سیمینار کی دل آزار قید سے شام چھ بجے رہا ہوئے....

ہوٹل کی لابی میں سے نکل کر باہر آئے اور وسیع پورچ کے سامنے چمڑے کی آرام دہ کرسیوں پر ڈھیر ہو کر ایک لمبا سانس لیا.... اور اس گہرے ناآسودہ سانس میں کھٹمنڈو کی شام کی خنک ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں دور تک گئی۔ اُنہیں کانفرنس ہال کی آلودہ ہوا سے خالی کیا اور خود قیام کیا....

ہم ہوٹل کے اندر سارا دن ایک مصنوعی آب و ہوا میں سانس لیتے رہے تھے۔ اُس کی عادی ہو چکے تھے جیسے مزارع ظلم کا عادی ہو جاتا ہے' غریب بھوک کا عادی ہو جاتا ہے اور عیاش شخص بدن کا عادی ہو جاتا ہے.... لیکن ظلم' بھوک اور بدن زندگی کے نارمل رؤیے تو نہیں ہوتے۔

جیسے نایاب پودوں کو گرین ہاؤس میں ایک مخصوص طے شدہ درجہ حرارت میں پالا جاتا ہے۔ وہ سب اُس مصنوعی موسم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی ہے....

گرین ہاؤس میں نشوونما پانے والے ان پودوں کو اگر اٹھا کر باہر کھلی فضاء میں لے آئیں تو وہ فوراً مرجھا جاتے ہیں۔

لیکن ہم تو وہ پودے تھے جنہیں زبردستی گرین ہاؤس میں قید رکھا گیا تھا اور اب جب ہم باہر آئے تھے تو اپنے موسموں میں تھے اور ہمارے پتے سرسبز ہوتے تھے اور ہم

کھلتے تھے اور اپنے آپ پر لعن طعن کرتے تھے سارا دن گرین ہاؤس میں کیوں قید، فرار کیوں نہیں ہوگئے.... آج داتا صاحب کا عرس ہے اور تم کہاں بیٹھے تھے....

کھٹمنڈو کی شب داتا صاحب کا عرس تھا.... یہ آج کی شب داتا کی نگری تھا۔ یہ یہاں کے باسیوں کے لئے پشوپتی ناتھ جی کی نگری تھا.... لیکن.... ہمارے لئے یہ نگری.... داتا کی نگری تھی.... اس میں پلاؤ کی دیگیں کھنکتی تھیں اور عقیدت مند ہجوم گنج بخش کی سیڑھیوں کو بھرتا تھا.... تو ہم سب کے سب کانفرنس ہال کے گرین ہا کے پودے کھلنے لگے اور ناآسودہ سفری تمناؤں کی مہک دینے لگے....

اور تب ہم نے.... صنم خانوں کے اس اجنبی دیار کی ہوا میں گہرے سانس ہوئے، چمڑے کی کرسیوں پر اطمینان سے براجمان.... کسی ایک سردار کو دیکھا....

ہر سردار ایک پروٹو ٹائپ ہوتا ہے.... وہ پگڑی باندھتا ہے.... ہندوستان کا پر پیچ رنگین اور کشتی نما اونچی پگڑی باندھتا ہے.... افریقہ کا ہو تو سادہ اور سیدھی باندھتا ہے.... اور اسے کسی قسم کا کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا.... نہ اپنا آپ چھپاتا اپنے جذبات کو چھپاتا ہے۔ میرے والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ دنیا میں ہر نسل او مذہب کے فقیر ہوتے ہیں لیکن.... پٹھان اور سکھ فقیر آپ کو ڈھونڈے سے بھی نہیں گے.... کسی کے آگے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کم ہاتھ ایسے ہوتے ہیں جو کسی پٹھا سکھ کے ہوں گے.... سردار دنیا کے کسی خطے میں ہو، کسان ہو اُجڈ گنوار ہو یا ٹائی کوٹن ہو پر سردار ہی رہتا ہے او آپ جب کبھی نعرہ لگا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ جی کی حال اے؟

تو سردار ذرا چونک جاتا ہے اور پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر خوش ہو کر کہتا

"آپاں تے عیش کر رہے آں.... تُسی کتھوں آئے او؟"

سردار کبھی اپنے گراس رُوٹس کو نہیں بھولتا....

ننکانہ صاحب میں.. سکھوں کے مکّے مدینے میں.... گرو دوارہ جنم استھان اُس مقام پر جہاں گورونانک پیدا ہوئے تھے وہاں.... جب ایک پشتون سردار میرے شلوکا.... باندھتا تھا اور راگی بابا فرید کے اشلوک الاپتا تھا کہ "اُٹھ فریدا سُتیا گذار.... تو مجھے احساس ہوا کہ تمام مذاہب کی نسبت سردار سب سے زیادہ توحید

ہے.... اُس کے گورو دوارے میں کوئی شرک نہیں۔ کوئی مجسمہ، کوئی تصویر نہیں.... وہ صرف گرنتھ صاحب کے آگے سر جھکاتا ہے.... اُسے کوئی کامپلیکس نہیں.... اگرچہ ان خوبیوں کے باوجود مشرقی پنجاب میں اُس کی خونریزی اور مسلمانوں کے خون کی پسندیدگی اور لاکھوں لاشوں کا جواز پیدا نہیں ہوتا.... اگرچہ میرے آبائی گاؤں جوکالیاں کے گردوارے میں آس پاس کے گاؤں کے سینکڑوں سکھ اپنے بال بچوں کے ہمراہ اپنی جان بچانے کے لئے آئے تھے اور میرے گاؤں کے لوگوں نے انہیں مکمل تحفظ کی ضمانت دی تھی کہ وہ اگرچہ ایک مختلف مذہب کے پیروکار تھے لیکن اُن کا جاٹ قبیلہ ایک ہی تھا.... وہ مسلمانوں کی شادیوں میں شریک ہوتے تو اُنہیں "سُوکھا راشن" دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی خوراک اپنی مرضی اور عقیدے کے مطابق خود تیار کرلیں.... وہ "نیوندرا" بھی ڈالتے اور دھی رانی کو ڈولی میں بٹھاتے ہوئے آنسوؤں سے اپنی گھنی داڑھیاں بھی گیلی کرلیتے.... وہ بھی چیمے، چٹھے، رندھاوے، گوندل، باجوے اور تارڑ تھے.... مولوی نور دین ہر روز مسجد سے اعلان کرتے کہ گردوارے میں مقیم سکھ بال بچے ہمارے بال بچے ہیں، ہمارا خاندان ہیں اور ہم نے اپنے خاندان کا خیال رکھنا ہے لیکن مشرقی پنجاب میں سرداروں کی کرپانوں سے جنم لینے والا مسلمان خون بہتے بہتے دریائے چناب کے کنارے.... جوکالیاں تک بھی آپہنچا.... جن کے پیارے کرپانوں کا شکار ہوئے تھے یا جن کی مائیں بہنیں برہنہ کی گئی تھیں وہ اپنے پاگل پن اور آنکھوں میں نچڑتے خون کے ساتھ جوکالیاں آئے اور گورودوارے کو آگ لگادی.... مقامی کسانوں نے مزاحمت کی تو اُن کو بھی اُس آگ میں دھکیل دیا گیا۔

اُونچے رُتبے والیاں سکھ سردارنیاں اُس کنوئیں میں ڈوب مریں جو گورودوارے کے دروازے کے پاس ہے....

ایک عرصے تک اہلِ جوکالیاں نے اُس گورو دوارے کے سوختہ در و دیوار کا رُخ نہ کیا کہ وہ شرمندہ تھے.... رات کی تاریکی میں لوگ کنوئیں میں اُتر کر سکھ سردارنیوں کے ڈھانچوں میں سے سونے چاندی کے زیور تلاش کرتے....

وہ گورو دوارہ اب بھی اُس نیم سوختہ حالت میں موجود ہے.... وہ مہاجروں کے لئے ایک شادی گھر کا کام دیتا ہے.... یہ مہاجر نہ چیمے ہیں نہ چٹھے ہیں اور نہ تارڑ ہیں۔ نہ ان کو خشک راشن دیتے ہیں اور نہ یہ ہمارے ساتھ شادی بیاہ کے موقع پر "نیوندرا"

ڈالتے ہیں اور نہ اِن کی داڑھیاں ڈولی کو وداع کرتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگتی
کیونکہ مشرقی پنجاب میں اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا اِس کا بیان بھی ممکن نہیں.....
چنانچہ آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں ایک سردار کو پکارتے ہیں کہ سردار
حال اے..... تو..... وہ.....

تو ہوٹل سولتی کے باہر کھٹمنڈو کی نیم سرد شام میں جب میں نے ایک متمول
آسودہ سردار جی کو دیکھا اور ان کے پہلو بہ پہلو ان کا خاندان نیپال نگری کی غربت
نمایاں ہو رہا تھا تو میں نے پوچھا "سردار جی کی ہو رہیا اے؟"
اُنھوں نے نہایت متانت سے..... جو سکھ حضرات میں تقریباً مفقود ہوتی ہے
جواب دیا کہ آپاں تے عیش کر رہیاں..... تسی کتھوں آئے او؟

"پاکستان۔۔۔"

یہ ایک ایسا جادوئی لفظ تھا کہ بے شک سردار آزاد خالصتان کا شدید مخالف
اندرا گاندھی کے دربار صاحب آپریشن کا بے شک حامی ہو لیکن وہ لفظ "پاکستان"
ہمیشہ ٹھٹکتا ہے اور رُک جاتا ہے "پر پاکستان دے کیہڑے شہروں آئے او؟"

"لاہور....."

اور لاہور..... اُن کی اور پنجابیوں کی واحد سلطنت کا صدر مقام تھا.....
وَن آئیڈ عدل پسند رنجیت سنگھ نے حکومت کی تھی..... اندرونِ شہر کی بیشتر حویلیاں آ
سکھ سرداروں کے ناموں سے پہچانی جاتی تھیں..... حویلی دھیان سنگھ، حویلی کرپال
لال حویلی.....

جب رنجیت سنگھ کی پوتی بمباں سدر لینڈ جو سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئی تھی
ایک سکاٹش کرنل اُس کا خاوند تھا اور اُس کے باپ دلیپ سنگھ نے کم سنی میں انگریز
کے سمجھانے پر اور خفیف سی ڈھکی چھپی دھمکی دینے پر کوہِ نور ایسا ناکارہ اور بیکار
وکٹوریا کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا تو ملکہ وکٹوریہ نے تمام تر برطانوی آداب کا
کرتے ہوئے مجبوراً یہ حقیر تحفہ قبول کر لیا تھا۔ تو اِسی دلیپ سنگھ کی بیٹی ایک مکمل
بلکہ سکاٹش میم تھی، کیونکہ دلیپ سنگھ کو اُس کی عاقبت کا ڈراوا دے کر عیسائی
تھا..... اُس نے اپنی عمر کا آخری حصہ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں بسر کرنے کی خواہش

اور جب ملک آزاد ہوا اور بہت سوں نے اُسے پوچھا کہ رانی..... ادھر سے تو ہندو اور سکھ
نقل مکانی کر رہے ہیں آپ لاہور چھوڑ کر کس بدایوں یا امروہہ کو ہجرت کریں گی؟..... تو
اُس نے ایک کلاسیکل لہجے میں شاید انگریزی میں کہا ہوگا اور ظاہر ہے سکاٹش لہجے میں کہا
ہوگا کہ "میں لاہور کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں، یہ میرے دادا رنجیت سنگھ کا دارالخلافہ ہے اور
میں اس سلطنت کی واحد رانی ہوں....."

وہ رانی..... جیل روڈ پر گلبرگ کے مین ایونیو پر مڑنے سے پہلے ایک عیسائی
قبرستان میں مدفون ہے۔ فارسی رباعیوں اور "ہیئر لائز پرنسس بمباں سدر لینڈ گرینڈ ڈاٹر
آف مہاراجہ رنجیت سنگھ لائن آف پنجاب ڈاٹر آف مہاراجہ دلیپ سنگھ" کے کتبے کے
نیچے مدفون ہے۔ اور قبرستان کے باہر شیل کے پٹرول پمپ کے بھاگتے دوڑتے اٹینڈنٹ
اور پجاروز، ہونڈاز اور بی ایم ڈبلیوز میں سُپر پٹرول ڈلواتے ان لگژری کاروں کے پُر تکبر
الک یہ نہیں جانتے کہ اس پٹرول پمپ کے پہلو میں..... دیوار کے پار پنجاب کی آخری
جینوئن پرنسس محوِ خواب ہے.....

بمباں کے والد دلیپ سنگھ کے عیسائی ہونے کا کم از کم ایک فائدہ تو تاریخ کو
ہوا..... وہ سکھ ہوتی تو جل کر راکھ ہو چکی ہوتی لیکن اب وہ دادا کی سلطنت کی خاک میں
ہے اور اُس کی نشانی باقی ہے۔

چنانچہ آپ دنیا کے کسی تختے پر چلے جائیں اور کسی سردار سے پوچھیں کہ.....
تو میں نے اُس سیمینار کی قید سے آزاد ہو کر چرمی کرسی پر بدن کو ریلیکس کرتے
ہوئے اس خنک ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرا جس کا داخلہ کانفرنس ہال میں ممنوع تھا اور
میں نے ایک سردار جی سے پوچھا، سردارو کی حال اے؟.....

تو سردار جی نے فوراً کہا "آپاں تے ایتھے عیش کرن آئے آں۔۔۔"

"تے ہور کی کرن آئے او؟"

"تے ہور جوا کھیڈن آئے آں....."

میرے لئے یہ اطلاع حیرت انگیز تھی کہ ہندوستان میں تمام تر لبرل ازم کے
باوجود باقاعدہ جوا ممنوع ہے۔ وہاں کوئی جوا خانہ یا کیسینو نہیں ہے..... حالانکہ ہندومت میں
جوئے کی ہرگز ممانعت نہیں ہے بلکہ دیوالی کے موقع پر اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا

ہے.... چنانچہ ہر جواری ہر مالدار ہندوستانی جب داؤ لگانے کے لئے بے چین ہوتا
کھٹمنڈو کا رُخ کرتا ہے.... اس شہر میں سات عظیم الشان کیسینو اِن کا انتظار کرتے
تقریباً بیس برس پیشتر جب یہاں انسان کے اندر جو قسمت آزمائی اور اپنے آپ کو
میں امیر کرنے کی خواہش ہوتی ہے اُس کے امکان یہاں تعمیر کئے گئے.... کیسینوز وجو
آئے تو سینکڑوں نیپالی دیوالیہ ہوگئے.... دیوالی آنے سے پہلے ہی دیوالیہ ہوگئے' اُنہو
اپنی جمع پونجی ہاری تو گھر فروخت کر دیئے' اپنے آپ کو بیچ دیا اور کچھ نے اپنی بیویا
دیا تو نیپالی حکومت نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا' اُنہوں نے قمار خانے تو نہ بند کئے
اُن میں نیپالیوں کا داخلہ بند کر دیا.... صرف غیر ملکی آئیں اور جو کچھ لائیں یہیں
جائیں' اس سے بہتر اور منافع بخش اور کونسا بزنس ڈیل ہو سکتا تھا....

تو اب اچھے موسموں میں.... اور یہاں ہمارے لئے ایک اور سرپرائز تھا
کھٹمنڈو میں اچھے موسم صرف سرما اور بہار کے تھے.... گرمیوں میں یہاں دِل آزار
ہوتی تھی اور ایئر کنڈیشنرز کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا....

تو اب اچھے موسموں میں.... جوئے کے شوقین ہندوستانی اس ہمالیائی سلطنت
صدر مقام پر غول در غول اُترتے تھے.... اپنی بیویوں.... دوست لڑکیوں اور اولا
سمیت.... اور اُن میں سے بیشتر کھٹمنڈو پہنچ کر نہ ہماری طرح کسی دھوکا دربار میں حا
دیتے ہیں' نہ کسی زندہ دیوی کے درشن کو جاتے ہیں اور نہ ایورسٹ کے دامن میں
کے لئے آہیں بھرتے ہیں.... وہ سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھ کر براہِ راست نز
ترین قمار خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہ اُدھر ڈوبتے ہیں تو کسی اور کیسینو
اُبھرتے ہیں۔ وہاں ہارتے ہیں تو ایک اور جوئے خانے میں جا پہنچتے ہیں.... انگلستان
"پب کرالنگ" نام کا ایک نہایت شریفانہ رواج ہوتا تھا.... پندرہ بیس دوست اور د
لڑکیاں کسی ایک شب کاروں میں ٹھنس کر اپنی کاؤنٹی کے مختلف قدیم شراب خانوں
قدم رنجہ فرماتے تھے.... حسب توفیق حلق سے آبِ جو یا دخترِ رز کو اُتارتے تھے
صرف ایک جرعہ اُتارتے تھے اور پھر کسی اور مے خانے کا رُخ کر لیتے تھے.... کم
درجن بھر شراب خانوں میں حاضری مستحسن ٹھہرتی تھی اور اس کے بعد ہر قسم
چراغوں میں روشنی نہ رہتی تھی اور وہ خمار میں گم گھروں کو لوٹ جاتے تھے.... کچھ

طور کھٹمنڈو میں ہندوستانی جواری بھائی "کیسینو کرالنگ" کرتے ہیں.... اِدھر ڈوبے اُدھر
نکلے اور پھر قمار میں گم ہوٹل کو لوٹتے تھے....

اب اِس شام کھٹمنڈو میں ہمیں کچھ تو کرنا تھا....

خمار اپنی جگہ.... لیکن قمار کی کشش نے مجھے کبھی بھی اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا
سوائے اُن دنوں کے جب میں سکھدیپ سنگھ رانگی کے سامنے بیٹھ کر تاش کے تین پتّوں
کو اپنے ہاتھوں میں ایک کلی کی طرح کھلتے دیکھتا تھا اور پھر اُنہیں پھینک دیتا تھا.... داؤ پر
لگائی ہوئی رقم اتنی معمولی ہوتی تھی کہ ہم بعد میں جو کوئی بھی جیتتا تھا.... اُس کے پلّے سے
ایک ایک اطالوی کافی پیتے تھے.... لیکن اب اِس شام کھٹمنڈو میں ہمیں کچھ تو کرنا تھا....

اور یہاں رسمِ نیپال بھی تھی اور دستور بھی تھا کہ جوا کھیلا جائے.... میں نے
سُنہری بابا سے رجوع کیا "کیوں جناب.... کیا خیال ہے.... ہو جائے؟"

"یارا ہمارا تو آفیشل معاملہ ہے.... ہم سرکاری طور پر اپنی مرضی سے کچھ نہیں
کر سکتے.... البتہ آپ جہاں لے چلیں گے ہم مجبوراً چلے چلیں گے اور بعد میں اعتراض ہوا
تو کہہ دیں گے کہ تارڑ صاحب زبردستی لے گئے تھے سو ہم چلے گئے.... پلیز آپ ہمیں
زبردستی لے چلیں...."

"کیوں فاروق؟"

"یہ جوا وغیرہ کھیلنا ہمارے مذہب میں ممنوع ہے تارڑ صاحب...." اُس نے اپنی
مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لیکن مسکراتی آنکھوں کے ساتھ کہا اور اُس کی مسکراتی
آنکھیں بھی یہی کہتی تھیں کہ پلیز ہمیں زبردستی لے چلیں....

"اگر حضرتِ شیخ اونٹوں کی دوڑ پر رقم لگاتے ہیں تو یہ جائز ہے کہ اونٹ بہرطور
ایک اسلامی جانور ہے.... اور اگر پیر صاحب.... گھوڑوں کی ریس پر داؤ لگاتے ہیں تو وہ بھی
شرع کی حد میں ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق یہ ریس اس لئے جائز ہے کہ
گھوڑوں کو جہاد کے لئے تیار کرنا ایک مجاہدانہ عمل ہے اور اگر کوئی ناعاقبت اندیش اُن پر
رقم لگاتا ہے تو یہ اُس کا ذاتی فعل ہے جس کی پُرسش روزِ قیامت ہوگی.... البتہ ایک
تھڑے پر براجمان چند مزدور یا عمدہ اخلاقیات سے عاری شخص اگر جوئے میں ملوث ہوتے
ہیں تو.... یہ غیر شرعی حرکت ہے اور قطعی ممنوع ہے...."

"سر جی.... ہم کسی تھڑے پر براجمان معمولی لوگ نہیں.... ایک بین الا
کانفرنس کے مندوبین ہیں۔ ہمارے لئے تو اخلاقیات کے پیمانے الگ ہوں گے.... تو ہم
سے نکل چلتے ہیں.... لیکن ہر دو خواتین کو چنداں خبر نہ ہو...."

"لیکن کیوں خبر نہ ہو؟"

"یہ کچھ معیوب سا لگتا ہے کہ سارا دن کانفرنس کی قید میں کاٹ کر ای
بھری نیپالی شام میں ہم اُن سے کہیں.... کہ آپ ذرا ہمیں معاف کر دیں ہم جوا کھ
رہے ہیں...."

"فاروق ڈیئر.... ہم ہرگز جوا کھیلنے نہیں جا رہے' بلکہ جوا دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"اس کے باوجود اچھا نہیں لگتا.... اگر ہم اُن سے پوچھ لیں تو کیا حرج۔
یونہی دریافت کر لیں کہ آج کی شام کے لئے اُن کے ارادے کیا ہیں...."

"آپ دریافت کر لیں.... آپ بزرگ ہیں...."

میں نے اپنے کمرے سے ہمشیرہ صاحبہ کو فون کیا "آپ اس وقت بے حد
چکی ہوں گی اور آرام کرنا چاہتی ہوں گی کہ دن بہت تھکا دینے والا تھا.... تو آپ
کریں...."

"خبردار...." اُن کی آواز ٹیلی فون پر بھی دہلا دینے والی تھی اور اتنی بلند تھ
میرے کمرے سے نکل کر وادیِ کھٹمنڈو پر "خبردار' خبردار" کہتی پھیل گئی.... "آپ
کہیں جا رہے ہیں؟"

"کہیں بھی نہیں۔" میں نے فوراً دہل کر کہا "اور اگر کہیں جا رہے ہیں تو
وہاں جا کر کیا کریں گی؟"

"آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"بس وہ.... ہوٹل سولتی کے قمار خانے میں جا رہے ہیں.... یونہی وقت گز
کے لئے...."

"جوا کھیلنے کے لئے جا رہے ہیں...." اُنہوں نے اتنے غصے سے کہا کہ مجھ
ہو گیا کہ اس کے بعد ایک فتویٰ آئے گا۔

"قطعی نہیں.... ہم تو صرف جوا دیکھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ

کیجئے"

ایک اور "خبردار" اُن کی جانب سے لڑھکتا ہوا آیا "دیکھو لڑکو...."

"یہ آپ کس کو کہہ رہی ہیں؟" میں نے "لڑکو" کے خطاب پر فی الفور بھنگڑا
ڈالنے سے صرف اس لئے اجتناب کیا کہ کہیں میری فربہ کمر کی کوئی چُول ڈھیلی نہ ہو جائے
اور مجھے "چِک" نہ پڑ جائے....

"یہ میں آپ لوگوں کو.... مرد حضرات کو کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ نے کسی
نہایت عمدہ شراب خانے میں جانا ہے یا کسی قمار خانے میں جانے کا قصد رکھتے ہیں' تو....
میرے بغیر.... آپ نے نہیں جانا...."

"آپ.... عصر کی نماز سے فارغ ہو چکیں؟"

"الحمدللہ...." اُدھر سے جواب آیا "اور تسبیح بھی کر چکی ہوں"

"اور اس کے باوجود شراب خانوں اور قمار خانوں میں جانے سے گریز نہیں
کریں گی؟"

"الحمدللہ...."

اب انکار کی گنجائش کہاں تھی....

ہوٹل سولتی کی لابی میں.... اطالوی بار اور قد آدم شیشوں کی گذرگاہ کے
رمیان.... ہم جب اپنے کمروں سے نیچے آئے تو ہمشیرہ ٹہل رہی تھیں اور مسلسل ہندو
مداؤں کی شان میں گستاخیاں کرتی چلی جا رہی تھیں اور تسبیح کے دانوں کو پھرولتی چلی جا
ہی تھیں اور ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہ آنے دیتی تھیں اور کیسینو میں جانے کے
لئے بے تاب اور بے حال ہوتی تھیں....

اور خالدہ گمشدہ.... اپنے آپ میں گم.... اُنہیں کہیں لے جانے کا سوال تو تب پیدا
وتا جب وہ اپنے آپ سے باہر آتیں تو.... وہ کہیں کسی مجسّمے کی پتھر صورت کی آنکھیں
یں.... کسی پشمینے کی شال میں بُنی ہوتی تھیں اور اپنی سرگوشیوں میں ایک اور مدھم
رگوشی ہوتی تھیں....

"جس کو دیکھا قمار میں دیکھا... جواری کی کماری"

ہوٹل سولتی کے پہلو میں.... ہم نے پہلے یہ جانا کہ یہ نامکمل سی عمارت ا
حصہ نہیں ہے کوئی زیرِ تکمیل ہوٹل ہے.... لیکن وہ اِسی عالی شان اور وسیع ریاس
ایک گوشہ تھا اور کیسینو رائل کہلاتا تھا....

ہم سب.... پنج بدن جب رات کے گیارہ بجے ایک ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے ا
قمار خانے کے صدر دروازے پر روشن نہایت بازاری قسم کی آرائش کی جانب بڑھے
تو سب کے سب ذرا خجل تھے.... جھجکتے تھے.... جیسے پہلی مرتبہ لاہور کی "ہیرا منڈی
رہے ہوں.... ہیم برگ کی "ریپا بہان" میں شوکیسوں میں سجی برہنہ خواتین کو نظروں
ٹٹولنے کے لئے جا رہے ہوں.... ہم سب نہایت خجل تھے.... اور ظاہر ہے "ہم سب"
مُراد صرف مرد حضرات تھے... شاید خواتین میں بھی یہ خواہش جنم لیتی ہو کہ جیسے ا
مردوں کو یہ سہولت ہے کہ یہ اپنی من مرضی سے مطلوبہ سہولت خرید سکتے ہیں ا
بھی شوکیسز میں سجے مردوں کو خرید سکیں...

وہاں ہمارے پاسپورٹ چیک کئے گئے.... صرف یہ جاننے کے لئے کہ
مقامی نیپال تو نہیں ہیں جو اپنا تن من دھن اور بیوی بیچنے کے لئے آئے ہیں' اور پھر
نہایت عزت و احترام سے قمار خانے میں اُترنے کی گزارش کی گئی۔

ہم نیچے اُترے.... قمار خانے کے شور اور موسیقی اور روشنیوں میں ا
سیڑھیوں کے اختتام پر ایک نیپالی خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا.... اُس نے اپنے آ

اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا اس کے باوجود کہ اُس کے پاس لپیٹنے کے لئے اور پوشیدہ رکھنے کے لئے کچھ نہ تھا....

اور وہاں.... سیڑھیوں کے اختتام پر.... فیوڈور دوستووسکی میرا منتظر تھا...

اُس کے چہرے پر "سفید راتیں" تھیں برف ہوتی ہوئیں.... سائبیریا کی قید میں منجمد ہوتی ہوئیں۔ "جرم و سزا" کے جرم تھے۔ "ایڈیٹ" کی احمقانہ سختی تھی۔ "بردرز کارموزوف" کے ایسے بھائی تھے جو پادری بھی تھے اور تشکیک کا شکار بھی تھے۔

لیکن دوستووسکی یہاں نیپال کے اس کیسینو رائل کے دروازے پر ان کی وجہ سے نہیں.... صرف اپنے ناولٹ "جواری" کی بنا پر موجود تھا۔

"جواری" پڑھنے کے بعد جوئے کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ جیسے زاہد' عبادت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہیروئن کا عادی سفید سفوف کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ بلکہ دم لگاتا ہے۔ ایسے مجبور کُن دباؤ میں آیا ہوا شخص جوا کھیلنے پر بے بس ہو جاتا ہے اور دم نہیں مار سکتا....

اور کیسینو رائل کے دروازے پر.... صرف دوستووسکی ہی میرا منتظر نہ تھا... اس کے پہلو میں بابا ٹالسٹائی بھی کھڑے تھے....

اور اُنہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے.... میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا تھا.... وہ میرے راہنما اور مرشد تھے.... انہوں نے مُجھے ناول نگاری کے رمُوز سے آشنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ میں ایک پھسڈی مرید کی طرح اُن سے کچھ بھی سیکھ نہیں سکا تھا لیکن انہوں نے کوشش کی تھی۔

وہ اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے تھے "کیا تم بھی" وار اینڈ پیس" کے آخری حصے کو جس میں مَیں نے تاریخ کے جبر اور اس کی لایعنیت پر بحث کی ہے۔ فضول اور بے مقصد قرار دیتے ہو؟" ہر عظیم ناول میں ایک فضول حصہ ہوتا ہے تاکہ نقاد اس پر تنقید کر کے خوش ہو سکیں اور اپنے وجود کا جواز پیش کر سکیں.... اگر وہ حصہ نہ ہو تو نقاد کیا کریں گے؟ بھوکے مر جائیں گے....

کیسینو رائل کے داخلے پر نیپالی خوش آمدیدی خاتون کے برابر میں دوستووسکی اور ٹالسٹائی اس لئے میرے منتظر تھے کہ وہ تاریخ کے سب سے بڑے جواری تھے۔

دوستو وسکی نے اپنی ذات کے سب پرت ناولٹ "جواری" میں کھول دیئے
اور ٹالسٹائی ایک جاگیردار ہونے کے باوجود اپنے مزارعوں سے زیادہ قریب
اپنی سٹیٹ ان کے حوالے کر دی اور مذہب اور اخلاقیات کی ایک نئی توجیہہ پیش کر
صوفی ہو گیا.... اگرچہ اس کے صوفی ہونے میں اس کی سخت گیر بیوی کا بھی ہاتھ تھا...
نے اپنے عقائد کی خاطر ایک بڑا جوا کھیلا۔ ناول "وار اینڈ پیس" میں جب ایک پرنس
پوری جاگیر' مزارع اور عالی شان گھر جوئے کے میز پر ہار جاتا ہے تو صرف ایک خو
کرتا ہے' کاش وقت چند لمحوں کے لئے پیچھے چلا جائے اور میں پھر سے اپنی ریاست
عزت نفس کا مالک بن جاؤں اور اس جوئے کی میز سے اٹھ کھڑا ہوں.... یہ پرنس اینڈ
نہیں تھا.... شاید ڈولوخوف تھا.... شاید کوئی اور.... مجھے اس کا نام یاد نہیں اس کا الیہ
ہے....

میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ ایک بڑا ناول لکھنے کے لئے ایک پیغمبر سے
کر ایک پراس چی چیوٹ تک کا تجربہ درکار ہے....
یہ وہی لوگ تھے جن کے پاس تجربے کا یہ احاطہ.... یہ سلسلہ تھا۔
دوستو وسکی کے پاس موت کا.... سفید راتوں کا اور.... جوئے اور جرم کا....
ٹالسٹائی اپنی سفید ریش اور بوڑھے بدن کے ساتھ کسی نامعلوم ریلوے سٹی
کے بینچ پر بیٹھا موت سے ہمکنار ہوا.... تنہائی اور بے رُخی کا شکار.... اگرچہ ایک گھنے
میں کچی قبر میں دفن جس پر کبھی خزاں رسیدہ پتے گرتے ہیں اور کبھی شگوفے اُسے ڈ
ہیں۔

یہ دونوں حضرات کیسینو رائل کے داخلے پر میرا راستہ روکے کھڑے تھے
مجھے دریافت کرنا پڑا کہ کیوں؟
"اس لئے کہ ہم تو بے خبر تھے۔ اور روسی مزاج کی آشفتہ سری میں مبتلا تھے
ہم تمہیں خبر کرنے آئے ہیں کہ تم تو مذہب اور تعصب کی آشفتہ سری ترک کر دو...."
"وہی آشفتہ سری جو ایک عظیم مملکت کے ٹکڑے کر دیتی ہے؟"
"ہاں.... کوئی بھی ڈوگما ہو.... مذہبی عقیدہ ہو.... مارکس کا ہو یا کسی پیغمبر کا...
اس کے پیروکار تنگ نظر ہو کر خلق خدا پر عرصہ حیات تنگ کر دیں تو وہ ریاست قائم نہ

رہتی...."
"ہاں ہم میں بھی وہی پاگل پن جنم لے چکا ہے جس کے بارے یونانی کہتے تھے کہ
اولمپس کے خدا جب کسی قوم کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُسے پاگل کر دیتے ہیں.... میں
بھی اپنے راکھ ہوتے معاشرے میں اپنا چہرہ پونچھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سب کچھ ختم
ہونے کو ہے زوال پذیر ہے.... لیکن کوئی بھی میری آواز پر کان نہیں دھرتا.... میں جان چکا
ہوں کہ سب کچھ بکھر جانے کو ہے...."
"کب تک؟"
"تاریخ میں برسوں کا نہیں صدیوں کا حساب ہوتا ہے...."
"یہی تمہاری کم عقلی ہے.... سوویت یونین تو اپنے متعصب عقیدے کے ساتھ
ایک صدی بھی زندہ نہیں رہ سکا.... بکھرنے سے چند برس پیشتر تک کسی کے گمان میں بھی
نہ تھا...."
"لیکن آپ لوگ تو انقلاب سے پیشتر اپنی حیات مکمل کر کے چلے گئے.... آپ
کیسے جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔"
"ادیب' ایک خاص سطح پر پیغمبر ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ مستقبل میں کیا
ہونے والا ہے.... کیا تم نہیں جانتے؟"
"تارڑ صاحب کیا ہو گیا ہے؟" خالدہ سرگوشی نے چپکے سے کہا....
"اِن پر اثر ہو گیا ہے" فاروق ہنسا....
"بس ذرا کیسینو میں جھانکا ہے تو بُت بن گئے ہیں.... ایک ہی مقام پر گڑے
کھڑے ہیں...."
"اِسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جھانکنا نہیں چاہئے" سُنہری بابا نے اپنا قول
دہرایا....

وہ درست کہتے تھے.... مجھ پر اثر ہو گیا تھا....
کیسینو رائل کے داخلے پر دوستو وسکی اور ٹالسٹائی میرے منتظر نہ تھے....
جسے میں دوستو وسکی سمجھا تھا وہ روسی ریاستوں سے آیا ہوا ایک ادھیڑ عمر براؤن
داڑھی والا اور چہرے میں غرق شدہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اور جو مجھے لیو ٹالسٹائی نظر آیا تھا

وہ دراصل ایک عمر رسیدہ سردار تھا جو اپنی لمبی سفید داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرتا تھا۔
اور میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ قمار خانے کے استقبالیہ کلرک کے سامنے ہم نے اپنے آپ کو غیر ملکی ثابت کرنے کے لئے پاسپورٹ رکھے تو کلرک جو شاید چوبیس گھنٹے سے ڈیوٹی پر تھا جمائی لے کر بولا "یہ انڈین پاسپورٹ' سبز رنگ کے ہو گئے؟"

"یہ پاکستانی پاسپورٹ ہیں بیوقوف۔۔۔" ہمشیرہ صاحبہ نے ڈانٹ پلا دی "جھانک کے تو دیکھو ان کے اندر...."

"سوری...."

اور جب نیپالی خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور ہاتھ جوڑ کر "نمستے" تو ہمشیرہ نے کھٹاک سے جواب میں "وعلیکم السلام" کہہ کر اُس کی مسکراہٹ منجمد تھی۔

اس نیپالی قمار خانے میں مخرب الاخلاقی کی کوئی حد نہ تھی.... چنانچہ جی خو گیا۔

کیسینو کے روشن رات کو سویر کرتے چکا چوند ہال میں قباحتوں کے تمام تر موجود تھے۔ رولیٹ کی بے شمار میزیں تھیں جن کے ارد گرد اتنا رش تھا کہ جواری اپنے ٹھپے ہتھیلیوں پر رکھے اور جیبوں میں ٹھونسے منتظر تھے کہ کوئی ایک شخص جو کھیل رہا ہے وہ خلاص ہو تو وہ فوراً اس کی کرسی پر براجمان ہو جائیں.... جیسے گینگ ہو رہا ہو اور وہ اپنی باری کے منتظر ہوں.... سلاٹ مشینیں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں کھٹا کھٹ چل رہی تھیں اور جیک پاٹ کے آرزو مند ہاتھ ان کے ہینڈلز کو سانس نہ دیتے تھے۔ کیسینو کے اہل کار اور اہل کاریاں.... اور اہل کاریاں بھی ایسی کہ اُن کی اہلیت سے کون کافر انکار کر سکتا تھا.... سیاہ جیکٹیں اور بو ٹائیوں میں ملبوس ہاتھوں میں کے پتے پھینٹتے آپ کی جانب نہایت اُلفت بھری نظروں سے دیکھتے تھے.... کہ آ قسمت آزمائی کا شکار ہونا چاہیے آئیے.... کراوڈ میں اِکا دُکا گورے گوریاں بھی تھے آٹے میں نمک کے برابر.... لیکن بقیہ حصہ سخت نمکین تھا اور انڈین تھا.... ہاں اگر دوسرے نمبر پر تھی اور جو پہلی آفیشل زبان تھی وہ پنجابی تھی....

"اوئے جو گندرنا تھا.... سوہے رنگ اُتے سارے ٹھپے لادے.... جت جائیں گے...."

اور جو گندرناتھ گنگنا کر کہتا "سوہے وے چوڑے والیا میں کہنی آں.... کر چھتری دی چھاں میں چھانویں بہنی آں...." اور اپنی ساری متاع سُرخ رنگ کے نمبروں پر لگا دیتا.... ہار جاتا اور اُٹھتے ہوئے کہتا "اوئے میں تیری ماں نوں...."

ایک اور ٹیبل سے آواز آتی "بھاجی میں دو لکھ ہار گیا.... ہن کی کریئے؟"

"ہُن کھٹمنڈو توں چلئے.... ہور کی کریئے"

"پر ہوٹل دا کرایہ کون دے گا...."

"ادھی راتی چپ چپیتے نکل چلاں گے پرنام سنگھا...."

"سر آپ داؤ پر کتنا لگائیں گے؟" نیپالی اہل کار کسی مخمور سکھ سے پوچھتا....

"اوئے اَسی جند جان لا دیاں گے...."

بلکہ اِس پنجابی ماحول کی وجہ سے میں سخت نروس تھا کہ ابھی چھاپہ پڑ جائے گا اور ہم سب نازیبا حرکات میں مشغولیت کے جرم میں دھر لئے جائیں گے اور اگلی صبح اخباروں میں ہمشیرہ صاحبہ اور خالدہ سرگوشی سمیت ہم ملزمان کی تصاویر فرنٹ پیج پر شائع ہوں گی.... صرف اس لئے کہ پنجابی سُن کر میں فوراً لاہور پہنچ جاتا تھا.... اور وہاں ایسا ہی ہوتا تھا.... کھٹمنڈو کے قمار خانوں میں پنجابی ہی کیوں زیادہ پہنچتے ہیں؟

ہندوستان میں اور بھی تو درجنوں قومیں ہیں جو ان کی نسبت زیادہ خوش حال اور دولت مند ہیں.... وہ اِدھر کیوں نہیں آتے....

شاید اس میں خطۂ پنجاب اور اس کی تاریخ کا گہرا عمل دخل ہے.... یہ کبھی قحط اور خشک سالی کا شکار نہیں ہوا.... اس کے دریاؤں کے کناروں پر وید اس لئے لکھے گئے کہ یہاں زندگی کا ایک گہرا اطمینان تھا.... ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے گودام گندم سے بھرے رہتے تھے.... جنگل بیلوں میں مویشی سر جھکاتے تھے تو گھاس اُن کے نتھنوں میں داخل ہوتی تھی.... بھینس دودھ دیتی تھیں اور جس کے پاس دودھ کا کٹورا ہو اور گندم کی روٹی ہو اُسے دنیا میں اور کیا چاہیے.... اسی لئے تاریخ میں پنجابی فاتحین کے نام کم کم ہوتے ہیں کہ اپنے ملک سے باہر وہی جاتا ہے جو بھوکا ہو اور غربت سے نڈھال ہو.... جسے گھر بیٹھے سب

کچھ میسر ہو وہ کاہے کو پردیس کی راہ اختیار کرے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالے
اگر کوہستان نمک میں سے گزرتے ہوئے کلر کہار کے آس پاس ایک پتھر کی نشست
کر نظارہ کرتا ہے تو یہیں پر وہ کہتا تھا کہ عالم دوبارہ نیست.... اور پنجابیوں نے اِسے
پلّے باندھ لیا.... کہ یہ جہان دوبارہ نہ ہوگا.... اوڑک جاناں مروے.... چل میلے نوں
چنانچہ یہ کھٹمنڈو کے میلے میں آئے ہوئے پنجابی تھے.... کہ عالم دوبارہ نیست!

گمشدہ میرے برابر میں کھڑی تھی اور نہ صرف گمشدہ تھی بلکہ پتھرائی ہوئی
تھی.... کیسینو کی رولیٹ میزوں اور سلاٹ مشینوں اور تاش کے پتوں کی جادوگری
اسے پتھرا دیا تھا.... اُس کی آنکھوں میں ایک کیف تھا جیسے وہ کسی "شاپنگ" کو دیکھ
ہو۔

ہمشیرہ طاہرہ نے ہوٹل سے چلنے سے پیشتر لابی میں پہنچ کر یکدم دوہائی دی
"اوہو.... میں تو اپنی عینک بدلنا ہی بھول گئی ہوں.... یہ والی تو قطعی طور پر مناسب اور
ایبل نہیں ہے...."

"یہ والی جو آپ نے پہن رکھی ہے.... یہ کیوں مناسب نہیں ہے؟"

"یہ".... وہ قہقہہ لگا کر اُسے اُتار کر بولیں.... ذرا چندھیا سی گئیں اور
موجودگی کو جیسے ٹٹولتی ہوئیں بولیں "یہ والی بین الاقوامی سیمینارز میں پہن کر جا
ہے۔ اِس میں مَیں زبردست انٹلکچوئل لگتی ہوں.... ابھی بدل کے آتی ہوں"

اور اب وہ اپنی فیشن ایبل عینک میں مکمل طور پر ملبوس تھیں اور نہایت
لگ رہی تھیں کاش کہ اُن کے میاں اُنہیں اس دل ربائی میں دیکھ لیتے۔

قمار خانے میں کہیں کسی ایک سپاٹ پر قیام پذیر ہونے سے پیشتر اِدھر اُدھر
کر.... چہل قدمی کر کے جائزہ لیا گیا کہ حالاتِ حاضرہ کیا ہیں۔

اور ہم جابجا رُکتے رہے....

میں وہاں رُکتا جہاں کوئی سردار نظر آتا....

فاروق وہاں ٹھٹکتا.... جہاں اُسے کوئی ایسی نیپالی ناری نظر آتی جو اپنے لوڈ
میں ذرا جھک کر رولیٹ ٹیبل پر تھپکے جماتی.... اگرچہ نیپالی ناری چاہے کتنا بھی جھک
بقول اپنے جاپانی یوکیو مشیما کے.... وہ سفید چاند نظر نہیں آتے جو بھرے بدن کے

وتے ہیں۔ ہمشیرہ ذرا تمکنت میں ٹہلتیں اور خشونت بھری نظروں سے کسی خیالی شخص کو
ھورتیں اور کبھی کسی اور خیالی شخص کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگتیں۔

گمشدہ کی آنکھیں پتھر ہو چکی تھیں۔ وہ رولیٹ کی میز پر مختلف رنگوں کے
نوں میں سجائے جانے والے ٹھیپوں کو دیکھتی تھیں۔ اور اُس چھوٹے سے سُرخ گیند
ے ساتھ گھومتی تھیں جو ایک اناڑی عاشق کی طرح یہ نہیں جانتا تھا کہ منزلِ مقصود کہاں
ہے.... کدھر رُکنا اور کدھر داخل ہونا ہے اور اٹکتا ہوا.... بے اختیار کسی ایک خانے میں
ھومتا ہوا ساکت ہو جاتا تھا اور اُس کے ساتھ اُن تمام جواریوں کے دل ساکت ہو جاتے
ے جنہوں نے اپنی رقم کسی اور خانے پر لگائی ہوئی تھی۔

سُنہری بابا متعدد ناریوں سے دریافت کر چکے تھے کہ.... یہ جوّا کتنے آئی سی میں
لے گا کہ پُوچھنے میں کیا حرج تھا۔

اور ملک صاحب.... بار بار اپنے سفید ہوتے بال سنوارتے تھے اور اُن جوارنوں
شکایت آمیز نظروں سے تکتے تھے جو اپنے جواری بدن نیلی جینوں اور ڈھیلی ٹی شرٹوں
ں سنبھالتی تھیں اور وہ سنبھلتے نہ تھے اور ذرا روٹھ جاتے تھے کہ اندھی ہو گئی ہو جو
تنے ہینڈسم شخص پر ایک نظر بھی نہیں ڈالتیں....

اور وہ صرف اُن ٹھیپوں کی مالیت پر نظر ڈالتی تھیں جو جواریوں کے ہاتھوں میں
رخ اور سیاہ شگوفوں کی طرح کھلتے اور بہار دیتے تھے۔

اس دوران ایک بلند قامت اور ذرا توانا صحت کا نوجوان چمڑے کی سیاہ جیکٹ کی
بوں میں ہاتھ ڈالے.... جیسے اُس کے ہاتھ وہ پرندے ہوں جو جیکٹ کے گھونسلوں میں
ے دینے کے لئے اُترے ہوں.... میرے آس پاس آیا "تارڑ صاحب آپ یہاں کیا کر
ہے ہیں؟"

اب نیپال میں مَیں جس شے کو سب سے زیادہ انجائے کر رہا تھا وہ مکمل گمنامی
ر پوشیدگی تھی.... میں یہاں اُن زمانوں میں تھا جب مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور میں اپنی
نا کی موج میں تہران کے کسی فٹ پاتھ پر رُک سیک سے ٹیک لگا کر سو جاتا تھا اور
ق ایران مجھے کوئی حشیش زدہ سیاہ فام ہپی جان کر کچھ پرواہ نہ کرتی تھی اور گزرتی جاتی
ی۔ یا میں کابل کی "چکن مارکیٹ" میں کسی ایسی ہپی سیاح خاتون کے ساتھ فلرٹ کر سکتا

تھا جو نوادرات کی کسی دوکان پر کسی ازبک دیہاتن کی سو برس پرانی ماند پڑتے ہوئے
تلّے سے مزین ایک چولی کو اپنے بدن کے بالائی حصے پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے
مجھے کہتی تھی "یہ افغان خواتین.... دے آر بگ.... یہ تو مجھے پوری نہیں آتی...."

یا میں گوالمنڈی چوک میں برسرِعام گاجریں کھا سکتا تھا اور کوئی یہ نہیں
کہ.... ہاہائے تارڑ گاجریں کھا رہا ہے....

چنانچہ اِس "تارڑ صاحب.... آپ کیا کر رہے ہیں؟" نے میرا نقاب اُتار کر
ننگا کر دیا تھا۔

"میں یہاں اِس شہر کھٹمنڈو میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں ایک معزز مہ
کی حیثیت سے آیا ہوں.... آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"جی نہیں.... وہ ایک لاپرواہ اور مست سا نوجوان تھا جو چمڑے کی سیاہ جیکٹ
ایک محبوبہ کی طرح عزیز رکھتا تھا۔" لیکن یہاں.... اس قمار خانے میں آپ کیا کر
ہیں؟ جوا کھیلنے آئے ہیں؟"

"قطعی نہیں.... ہم تو ذرا فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ ثروت دیکھنے آ
ہیں.... لیکن آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"میں تو جوا کھیلنے آیا ہوں.... اور آپ کو ایک ٹِپ دینا چاہتا ہوں کہ سامنے
ٹیبل پر نمبر ۱۹ جو سیاہ رنگ کا خانہ ہے وہ بار بار جیت رہا ہے...."

"درست.... لیکن آپ ہیں کون؟"

"میرا نام خاور ہے.... پیرس میں رہتا ہوں اور وہیں سے براہ راست پاکستا
رُکے بغیر اِدھر آ رہا ہوں.... پاکستانی ہوں.... آپ کے سفرنامے پڑھ کر برگشتہ ہوا تھا
سے فرار ہو گیا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے گ

ایک شب جب میں نیند میں جا چکا تھا ایک فون آیا "سر میں جرمنی سے بو
ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ سر میں آپ کو جرمنی میں مدعو کرتا
ہوں۔ ٹکٹ کا بندوبست ہو گا اور قیام کا مناسب بندوبست ہو گا.... پلیز سر.... کیا آپ
ہیں"

میں نے سمجھا کہ کوئی اردو کانفرنس ہے۔ یومِ پاکستان ہے یا کوئی مشاعرہ ہے؟"

حضرت مجھے شاعر جان کر اتنی منتیں کر رہے ہیں" میں آ تو سکتا ہوں.... لیکن کیوں؟...." میں
نے اُن سے یہ سوال صرف اس لئے پوچھا کہ اُن کا لہجہ قطعی طور پر ایسا نہ تھا کہ اُس پر
پڑھے لکھے ہونے یا ادبی ہونے کا گمان ہو....

"سر.... پچھلی شب ہم پاکستانی دوست ایک شراب خانے میں بیٹھے تھے اور جب
سب حضرات مخمور اور ٹُن ہو گئے تو کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ ہم یہاں کیسے آئے؟" تو سر
آٹھ میں سے پانچ حضرات نے اقرار کیا کہ ہم تو اس مخبوط الحواس مصنف تارڑ کے
سفرنامے پڑھ کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے.... تو ہم نے فیصلہ کیا کہ جو شخص
ذمہ دار ہے.... اور ہم میں سے بیشتر اب ویل سیٹلڈ ہیں.... اور مارکس کی فراوانی ہے تو ہم
نے فیصلہ کیا کہ آپ کو جرمنی میں بلایا جائے.... سر جی.... خرچہ ہمارا ہو گا.... پلیز...." سر
جی.... اپنی سستی اور کاہلی کے باعث جرمنی نہ جا سکے.... لیکن.... میں جان گیا کہ یہ سیاہ
جیکٹ میں پوشیدہ پیرس میں قیام کرتا ہوا نوجوان "پیار کا پہلا شہر" میں گم ہو کر وہاں گیا
تھا۔

میں نے اُس گم نوجوان سے ایک گزارش کی۔ اُس کی سیاہ چرمی جیکٹ پر ایک
بزرگانہ تھپکی دی "برخوردار میری آپ سے ایک گزارش ہے یہاں اِس قمارخانہ کی
مخرب الاخلاقیات میں.... جو کچھ آپ کریں گے میں اس کے بارے میں چُپ رہوں گا....
اور جو کچھ میں کروں گا آپ اس کے بارے میں چُپ رہیں گے...."

"دیٹ اِز اے ڈیل...." اس نے ایک زوردار مصافحہ میرے ساتھ کیا "لیکن
آپ اگر نیپال کا سفرنامہ لکھیں گے تو میرا تذکرہ تو نہیں کریں گے...."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...."

"پلیز کر دیں...." اُس نے ایک پُرجوش قہقہہ لگایا "اور سر ایک ذاتی درخواست
ہے میری جانب سے آپ جہاں جی چاہے کسی بھی نمبر پر یہ رقم لگا دیں...."

اور وہ رقم خاصی تھی جو وہ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا رہا تھا اور نہایت
احترام سے بڑھا رہا تھا.... اور یہ رقم رنگارنگ ٹھیپوں کی صورت میں تھی۔

"لیکن کیوں؟.... میرا تو کوئی تجربہ نہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے پارسا بزرگ کے ہاتھوں کی کرامت سے میں جیت

جاؤں گا.... کیونکہ آپ ہمیشہ لکی رہے ہیں"

"ہاں میں لکی تو رہا ہوں.... مجھ پر بہت فضل ہوا.... لیکن جو کچھ میں جیتنا وہ نہ جیت سکا...."

"وہ کیا ہے سَر؟"

"میں کوئی ایک شاہ گوری، کوئی ایک جھیل کرومبر جیتنا چاہتا تھا...."

"یقیناً"... اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس رقم کا کیا کرے جو اُس کے میں تھی" لیکن سَر...." اُس نے مجھے بہت غور سے دیکھا "آر یو آل رائٹ سَر؟"

"ہاں.... کیوں؟"

"آپ کے ہاتھ میں تو بیئر کا گلاس بھی نہیں ہے تو.... سَر پہلے سے ہی مخمو ہیں؟"

"ہاں.... جب شاہ گوری اور جھیل کرومبر کی بات ہوتی ہے تو میں صدا ہوں"

"یہ کون تھیں سَر؟" اُس کے چہرے پر شدید تشویش بھی تھی اور خوف کہ یہ شخص تو بہکا ہوا لگتا ہے اور میں جان گیا کہ وہ ان چوٹیوں اور جھیلوں سے آگاہ اور سمجھتا ہے کہ مجھ پر نیپالی بیئر کا اثر ہے جو اس قسم کے جنوں میں بات کرتا ہوں۔

"اُس کی برفوں پر جو نیل دھبے ہیں وہ میرے بوسوں کے ہیں اور اُس کے میں مجھے دیکھنے سے اضافہ ہوتا ہے اُن کا خیال ہے کہ میں جنگلی ہوں۔ سخت جنگلی.... تھیں"

"بالکل ہوں گی.... لیکن سَر میں نے تو ایک سادہ سی فرمائش کی تھی کہ آ رقم رولیٹ کے کسی بھی رنگ پر لگا دیں...."

"اور ہار جائیں؟"

"بے شک ہار جائیں.... میں کم از کم یہ تو کہہ سکوں گا کہ تارڑ صاحب میرے لئے رولیٹ کی میز پر رقم لگائی تھی اور میں ہار گیا...."

"آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیلنا چاہتے ہیں؟"

"یہ پہلی بار نہ ہو گا.... ایک بار اور سہی" اُس نے نہایت فلمی انداز میں یہ

بولا۔

میں نے نمبر ۱۹ کے سُرخ خانے میں اُس کے ٹھپے ڈھیر کر دیئے.... رولیٹ کا گیند حرکت میں آیا اور ہر خانے میں اٹکتا، ٹھہرتا.... دلوں کی دھڑکنوں کو اٹکاتا اور ٹھہراتا.... یکدم ساکت ہو گیا....

"میں نے کہا تھا ناں آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیلنا چاہتے ہیں...."

"میرا خیال تھا کہ آپ لکی ہیں۔" اُس کے لہجے میں مایوسی تھی.... اُس نے اب کی بار زیادہ گرم جوشی سے ہاتھ نہیں ملایا اور کندھے سکیڑتا کسی اور ٹیبل کی طرف چلا گیا۔

ہم سب، سرگوشی، ہمشیرہ، سُنہری بابا، ملک اور فاروق بھیڑوں کے ایک گلّے کی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔

آگے ذرا ہجوم زیادہ تھا اور اُس کے پار اُن کے کندھوں پر سے نگاہ کرتے ہم نے دیکھا کہ کیسینو کے اہلکاروں نے ایک ٹیبل کے گرد فیتے لگا رکھے ہیں.... ایک حصار سا قائم کر رکھا ہے تاکہ کوئی اندر نہ آئے.... کیونکہ اُس ٹیبل پر آج کی شب کا سب سے بڑا جواری داؤ لگا رہا تھا.... اُس کے سامنے مختلف رنگوں کے ٹھپوں کے انبار اور مینار تھے جن میں کم سے کم مالیت کا ٹھپہ ایک ہزار نیپالی کا تھا اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے کا تھا.... ایک محتاط اندازے کے مطابق اُس کے سامنے جو دولت ڈھیر تھی وہ پندرہ بیس لاکھ سے کم کیا ہو گی.... وہ نظر رولیٹ کی اُس گیند پر رکھتا تھا جو ڈولتی اٹکتی مٹکتی کسی ایک رنگ کے خانے میں یکلخت تھم جاتی تھی اور بے دھیانی میں کبھی سلاد کو منہ میں ڈالتا تھا اور کبھی بیئر کا ایک گھونٹ بھرتا تھا لیکن اُس کی آنکھیں اس گیند کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں اور اُسی کے ساتھ حرکت کرتی تھیں۔ وہ شکل صورت سے ایک موٹر مکینک لگتا تھا اور ایک بدرنگ چیک شرٹ میں ملبوس تھا، اُس کی آنکھیں اگرچہ کثرتِ مے نوشی کے باعث خُون رنگ تھیں لیکن وہ اپنے خمار پر حاوی تھا اور درست فیصلے کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

وہ آج کی شب کا ہیرو تھا کیونکہ وہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے جیت چکا تھا....

آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ جوئے کی جیت میں نشہ زیادہ ہوتا ہے یا سیاست کی جیت میں....

جوئے کی جیت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ ایک انسان کے فخر میں قید ہوتی ہے
سیاست کی جیت میں ایک انسان پوری قوم کو قید کرلیتا ہے۔

سب لوگ اُسے.... وہ لوگ جو اُس کی ٹیبل کے گرد تنی ٹیپ کے پار اُدھر
نہیں پہنچ سکتے تھے اُسے ایک دیوتا کی نظروں سے دیکھتے تھے.... اور اُس خوش نصیب
کے سامنے.... اُس کی دیوی بیٹھی ہوئی تھی....

وہ دیوی آفیشل تھی یا نان آفیشل لیکن کوئی اتنی خاص دیوی نہ تھی۔

شاید وہ صرف آج کی شب کے لئے اُس کی دیوی تھی....

وہ کبھی کبھار سلاد نگلتے ہوئے اُس پر ایک نگاہ ڈالتا جس میں کوئی چاہت یا پیار
ہوتا اور پھر رولیٹ کے گیند کے سحر میں مبتلا ہو جاتا۔

ہمشیرہ نے اپنی عینک ایڈجسٹ کرکے اُس دیوی کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا
کا بغور مطالعہ کیا اور کہنے لگیں "تارڑ صاحب.... یہ کماری اس جواری نے بُرے وقت
کے لئے سنبھال رکھی ہے.... جب یہ سب کچھ ہار جائے گا"

"ہو سکتا ہے وہ اس کماری کو بھی ہار جائے"

"نہیں۔" طاہرہ نے ناک چڑھا کر کہا "اِسے نہیں ہارے گا"

"کیوں؟"

"اسے کوئی جیتے گا ہی نہیں۔ کیا کرے گا جیت کر"

ہم ایک بے مصرف.... اور ایک پیسہ بھی ہارے یا جیتے بغیر چہل قدمی کر
کرتے نڈھال ہو گئے۔ سلاٹ مشینوں کے سامنے بلند کرسیوں پر زیادہ تر خواتین
مصروفِ عمل تھیں۔ وہ اپنی گود میں سکوں کے پیالے رکھے ان مشینوں کے منہ میں
ڈالتی تھیں اور ہینڈل گھما کر تمام مسخروں، تمام سیبوں یا تمام نمبروں کو گھومتے ہوئے
وہ رکتے تھے تو ایک ہی لائن میں دیکھنے کی متمنی تھیں اور کوئی نہ کوئی سیب آگے پیچھے ہو
تھا اور کوئی ایک مسخرہ دغا دے جاتا تھا اور وہ جیک پاٹ سے محروم رہ جاتی تھیں۔

ہم مزید چہل قدمی کرتے کرتے جب مزید نڈھال ہو گئے تو خالدہ گمشدہ جو ابھی
تک کیسینو کے ماحول میں پتھر تھیں سرگوشی میں کہنے لگی "تارڑ صاحب آپ جوا تو نہیں
کھیلیں گے؟"

"مجھے بہت ساری قباحتیں فیسی نیٹ کرتی ہیں لیکن جوا نہیں کرتا...."

"آپ نے تو مجھے مایوس کر دیا" گمشدہ نے اتنی دُکھ بھری مایوسی سے کہا کہ میرا
جی چاہا کہ میں اپنے چند سو ڈالر اور ٹریولنگ چیکس فوری طور پر داؤ پر لگا کر اُسے اِس
مایوسی سے بچا لوں۔

میں نے ہمشیرہ صاحبہ کی جانب دیکھا تو اُن کی ناراضی اُن کی عینک کے شیشوں پر
ایک شکایت آمیز دُھند کی طرح پھیلتی تھی "ہمشیرہ.... اگر آپ اس غیر شرعی ماحول سے
نالاں ہیں تو ہم ہوٹل واپس چلے چلتے ہیں۔"

"نالاں تو میں آپ لوگوں سے ہوں۔" ہمشیرہ سخت خفا دکھائی دیتی تھیں "بھئی
کیسینو میں آکر یوں ندیدے اونٹوں کی طرح گھومنے کی کیا تک ہے.... بھئی آپ لوگ ذرا
انجائے کریں۔ ذرا شراب وغیرہ پئیں.... جوا وغیرہ کھیلیں.... خواہ مخواہ میں ٹائم ضائع کر
رہے ہیں۔"

ہم مرد حضرات سخت شاکڈ ہوئے کہ یہ پرہیزگار بی بی ہمیں کیا نصیحت کر رہی
ہیں.... اگرچہ ہم اس نصیحت کے لئے قدرے شکرگزار بھی ہوئے....

"کیوں جوا کھیلیں؟" فاروق نے تنگ کر کہا۔

"آپ نہیں کھیلیں گے تو میں کیسے کھیلوں گی؟"

سب کے سر گھوم گئے "ہمشیرہ صاحبہ آپ بھی.... یعنی یو ٹو بروٹس وغیرہ---"

"تو اور کیا...." انہوں نے ہم پر ایک نظرِ ملامت ڈالی جو اُن کی عینک کے شیشوں
کو پار کرتی ہوئی ہمیں ملامتی کرگئی "بھئی میں تو لاس ویگاس گئی تھی تو میں نے وہاں بہت جوا
کھیلا"

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟"

"کیوں؟ کیا حرج ہے؟.... میں تو مغرب پڑھ کر گئی تھی اور عشاء کے وقت لو
آئی تھی.... یوں بھی سلاٹ مشین میں کچھ ریزگاری ڈال کر ذرا ہلا گلا کر لیا جائے تو کیا
ہے...."

"ہمارا یہ خیال تھا کہ آپ.... اور آپ سے ہم ڈرتے بھی بہت ہیں.... ہمشیر
ہوئیں.... تو یہ خیال تھا کہ آپ اس قسم کی مخرب الاخلاق حرکتوں پر کوئی فتویٰ وغیرہ جا
کر دیں گی.... لاحول پڑھیں گی...."

اور ہمشیرہ نے اُس لمحے کیسینو رائل کے روشن قمار خانے میں.... موسیقی
جواریوں کے نعروں کے شور میں ایک عجیب لیکن پتے کی بات کہی "اگر تو میرے لا
پڑھنے سے یہ سب کچھ غائب ہو جائے.... لاس ویگاس اور کھٹمنڈو صفحہ ہستی سے مٹ جا
تو میں فوراً لاحول پڑھ لوں.... لیکن.... یہ چمن تو یونہی رہے گا تو ہزاروں جانور اپنی
بولیاں کیوں نہ بولیں.... ذرا اپنے آپ کو خوش کیوں نہ کر لیں...."

اور منطق کی یہ بات کم از کم ملک پر فوراً اثر کر گئی اور وہ فوراً اپنے بال'
اپنے ڈالر جوئے کے ٹھپوں میں بدلنے کے لئے کیسینو کے کاؤنٹر کی جانب ایک خوش
اونٹ کی طرح جھومتا ہوا چلا گیا....

کیسینو کی انتظامیہ نے یہ خصوصی اہتمام کیا تھا کہ اُس پورے علاقے میں
کوئی بیٹھے تو رولیٹ میزوں کے گرد بیٹھے.... تاش پھینٹتے نیپالی تجربہ کار اور کائیاں جوئے
ترغیب دینے والے سیاہ جیکٹوں اور بو ٹائیوں میں بندھے اہلکاروں کے سامنے بیٹھ
سلاٹ مشینوں کے سامنے اونچی کرسیوں پر براجمان ہو.... اس کے سوا وہاں یونہی
دیکھنے کے شوقین ہم جیسے خواتین و حضرات کے لئے ہم جیسے متقی اور پرہیزگار لوگوں
لئے کوئی نشست نہ تھی....

کوئی انسان' چاہے ماحول کتنا ہی سحر انگیز اور کفر آمیز کیوں نہ ہو.... کتنی دیر

قدمی کر سکتا ہے۔ مڑ گشت کر سکتا ہے.... بالآخر اُس کی ٹانگیں لوہے کی طرح سخت ہو جاتی
ہیں' اور وہ نشست گاہ کے لئے مرا جاتا ہے....
جیسے دنیا کے بڑے میوزیمز میں.... بے شک آپ مونالیزا یا لاسٹ سپر یا لاسٹ
ججمنٹ کو دیکھ رہے ہوں تو بالآخر آپ کسی ایک بنچ کو مونالیزا سے بہتر جانتے ہیں۔ اور
یہاں.... کیسینو رائل میں کوئی ایک نشست گاہ ہم جیسے پرہیزگار لوگوں کے لئے نہ تھی....
اور ہماری ٹانگیں لوہے کی ہو چکی تھیں.... اور ان میں خواتین کی ٹانگیں بھی شامل ہوں گی
اگرچہ ہم تصدیق نہ کر سکتے تھے....

اور وہاں.... کیسینو رائل میں.... صرف ایک نشست گاہ تھی' یعنی
ریستوران.... جہاں سے ہمیں مسلسل بلند آہنگ موسیقی اور اشتہا انگیز کھانوں کی مہک
پکارتی تھی.... اور ہم وہاں کھانوں کی مہک سے زیادہ اشتہا انگیز ایک ایسی لڑکی کو دیکھتے
تھے.... یا شاید صرف میں دیکھتا تھا جس کا محبوب جوئے میں سب کچھ ہار چکا تھا اور شاید
شراب کی گرمی سے اور اُس میں شامل ہار کی حدت سے بے آرام ہوتا اپنی چیک ٹی شرٹ
اتار کر صرف بنیان میں ملبوس اپنے آپ کو بیئر میں ڈبوتا تھا.... ڈوب جاتا تھا تو اپنی محبوب کو
دیکھتا تک نہ تھا اور پھر ڈوب کر ذرا اُبھرتا تھا تو اُسے اُبھرا ہوا دیکھ کر پھر سے ڈوب جاتا
تھا....

اُس لڑکی کی ٹی شرٹ پر.... یعنی اشتہا انگیز ہندوستانی کماری کی ٹی شرٹ پر کچھ
لکھا تھا.... اور ہر کوئی.... جس کسی کے پاس سے وہ گزرتی تھی.... اور جس کسی کے قریب
سے وہ گزرتی تھی اُس کا نوالہ منہ میں رہ جاتا تھا.... وہ اُس کی ٹی شرٹ پر جو کچھ لکھا تھا
اُسے پڑھنے کی کوشش کرتا تھا.... کہ کیا لکھا ہے.... اور اُسے پڑھنا دشوار تھا.... کیونکہ
اُس کماری نے اپنے بدن کی ہل جل سے ہلچل مچانے کے لئے اُس ٹی شرٹ کے نیچے کچھ
بھی زیب تن کرنے کا اہتمام نہ کیا تھا اور یوں ایک مسلسل زلزلے کی کیفیت تھی۔
حیرت ہے کہ ہمشیرہ نے بھی اُس کی بدنی حرکت کی فحاشی پر کوئی لعن طعن نہ کیا بلکہ

اُسے قدر دانی کی نظروں سے نوازا....

اور بالآخر ہم اُس کی ٹی شرٹ پر نمایاں پیغام کو پڑھنے میں کامیاب ہوگئے "زندگی ایک مرتبہ کے لئے ہے Life is only once...." اگرچہ یہ قرین از نہیں کہ وہ فرغانہ کے بابر سے آشنائی رکھتی ہو لیکن وہ گریٹ مغل بھی تو اپنی ٹی شرٹ پر ماٹو لکھ کر زندگی کرتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے عہد کے مطابق اِسے عالم دوبارہ نیست کی صور میں لکھتا تھا لیکن آج تو ہم اِسے Life is only once.... ہی کہیں گے۔

بابر کے قول کی ٹی شرٹ ہمارے اِردگرد چلتی پھرتی تھی اور جب کبھی وہ ہما میز کی قربت میں سے گزرتی تو چند لمحوں کے لئے ہم پر سایہ سا ہو جاتا کہ اُس کا روشنیوں کو روکتا تھا۔

"تارڑ صاحب ماحول نہیں بن رہا۔" ہمشیرہ نے احتجاج کیا۔

"کیوں؟"

"بھئی آپ لوگ نہ تو شراب پی رہے ہیں اور نہ جوا کھیل رہے ہیں۔ مجھے م ہے آپ کے اندر اتھل پتھل ہو رہی ہے اور آپ اُسے دبا رہے ہیں.... تو میری طر سے اجازت ہے۔"

میں نے اس سے قبل اتنی پرہیزگار اور ایسے مخرب الاخلاق درس دیتی ہمشیر دیکھی تھی اور گمشدہ بی بی بھی کسی سے پیچھے نہ تھی اگرچہ اس کی سرگوشی موسیقی ا کراؤڈ کے مخل میں مزید دب جاتی تھی اور وہ ایک قید تنہائی کے قیدی کی طرح ذرا ذ رُک اور ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی تھی "تارڑ صاحب اگر آپ نے جوا کھیلنا ہے تو میں آپ بتاتی ہوں کہ اِسے کیسے کھیلا جاتا ہے۔"

یعنی ایک اور بروٹس....

"کیسے کھیلا جاتا ہے؟"

اس سوال کے جواب میں گمشدہ نے ایک طویل تحقیقی مقالہ پیش کیا کہ رو

کی میز پر کیسے سُرخ اور سیاہ نمبروں کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ کیسے رقم دُگنی ہوتی ہے اور کیسے رقم زیرو ہوتی ہے۔

سُنہری بابا نہ رہ سکے "یہ رقم آئی سی میں ہے یا نیپالی میں؟"

"ڈالروں میں.... میں اپنے بھائی کے پاس امریکہ گئی تھی اور ہم لوگ ایک شب کیسینو گئے تھے۔ وہاں اُس نے اتنی رقم جیتی کہ واپسی پر ہماری کار میں ہر جانب ڈالروں کے بل اُڑتے تھے اور میرا بھائی اتنا خوش تھا کہ وہ کھڑکی کھول کر یہ ڈالر باہر بھی اُچھالتا جا رہا تھا"

"آپ ایک جواری بھائی کی ہمشیرہ ہیں؟" حیرت سے کسی نے پوچھا۔

"نہیں ہرگز نہیں... شائد وہ پہلی بار کسی کیسینو میں گیا تھا"

"آپ نے بھی جوا کھیلا؟"

"ہاں.... اُن میں سے بیشتر ڈالر میں نے ہی رولیٹ کی میز پر جیتے تھے.... پہلی مرتبہ کھیلا تھا اور میرے حصے میں آغاز کرنے والے کی روایتی خوش نصیبی آگئی...."

اب ہم خالدہ بی بی کی بے حد تکریم کرنے لگے اور اُنہیں گمشدہ اور سرگوشی کے علاوہ جواری حسینہ کا خطاب دینے پر بھی غور کرنے لگے۔

سٹیج پر ایک نیپالی لڑکا اور لڑکی تازہ ترین انڈین ہٹس گا رہے تھے.... اور وہ بے حد سُر میں تھے۔ یہ میں اس لئے جانتا تھا کہ اُن دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر میں "تیرے نام" کا موسیقی کا پروگرام کمپیئر کرتا تھا اور ہر وقت طرح طرح کے گوّیوں اور میراثیوں کی سنگت میں رہتا تھا اور جاٹ ہونے کے باوجود اُنہی کی راہ پر چل نکلا تھا اور سُر کے ساتھ اپنا سر ایسے ہلاتا تھا کہ طبلے کی آخری تھاپ پر وہ یکدم ایک جھٹکے سے ساکت ہو جاتا تھا... اور میرا ہاتھ ایک "واہ جی واہ" کے ساتھ فضا میں بلند ہو جاتا تھا۔

یکدم ملک جو ایک طویل عرصے سے غائب تھا اور ہم اس خیال میں تھے کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آج کے اجلاس کی کارروائی کو سامنے رکھ کر کوئی دفتری رپورٹ تیار کر رہا ہوگا.... نمودار ہو گیا۔ اُس کے ہاتھوں اور جیبوں میں بے شمار نیپالی روپے تھے جو اُس سے سنبھلتے نہ تھے جیسے "لائف اِز اونلی ونس" والی حسینہ سے اُس کا سینہ نہ سنبھلتا

تھا.... نوٹ اُس کے کوٹ کی جیبوں میں سے قیدی پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے تھے "آ
میرا جیک پاٹ نکل آیا ہے۔ میں نے سات ہزار روپے جیت لئے ہیں.... اور یہ سب آ
کے لئے ہیں" اُس نے ایک لمحے کے لئے اُن نوٹوں کو ہوا میں اُچھال کر اپنی جیز
اعلان کرنے کے بارے میں سوچا اور پھر شاید ہمشیرہ صاحبہ کے احترام میں گریز کر گیا۔

ملک صاحب اُس جواری شب میں ہمارے ہیرو ہو گئے۔

اُنہوں نے ہماری لاج رکھ لی تھی....

"شاباش۔" ہمشیرہ نے کہا....

بقیہ لوگوں نے اُن کی پیٹھ تھپک کر داد دی اور مسرت کا اظہار کیا۔

"آج کی شب آپ جو کچھ کھائیں پئیں گے اُس کا بل میں ادا کروں گا اور آ
سب اِس جیتی ہوئی رقم سے جوا کھیلیں گے کیونکہ میں اس حرام کی کمائی کا ایک پ
جوئے خانے سے باہر نہیں لے جاؤں گا۔"

چنانچہ حرام کی کمائی تقسیم کر دی گئی۔

جواری حسینہ 'آنٹی گرل گائیڈ' غائب ہو گئیں۔ فاروق جانے کہاں تھا.... میز
صرف میں اور سُنہری بابا رہ گئے....'

"آپ جوا کیوں نہیں کھیلتے؟"

"مجھ سے یہ سوال ابھی ابھی دوستو وسکی اور ٹالسٹائی نے بھی پوچھا تھا...."

"Indeed" ضیاء صاحب نے مجھے پُرتشویش نظروں سے دیکھا "یہ دوستو وسکی
اور ٹالسٹائی وغیرہ جو ہیں تو یہ.... اِدھر ہیں' نیپال میں...."

"یہ تو عقیدے کی قوت ہے بابا جی.... جو ہر شے کو ہر شخص کو چاہے وہ صدیوں
پیشتر گزر چکا ہو حاضر کر دیتی ہے۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں جن کے خوابوں میں پیر فقیر آتے
ہیں اور اُنہیں پارسائی کی خلعت عطا کر کے چلے جاتے ہیں۔ ادب کے مذہب میں جو پیغمبر
ہیں وہ کیوں ایک مُرید ادیب کے سامنے حاضر نہیں ہو سکتے...."

"INDEED" اُنہوں نے صرف اتنا کہا۔

اس دوران شہنشاہ بابر کی پیروکار اپنی ٹی شرٹ پر "عالم دوبارہ نیست" کو ہلاتی
جلاتی ہمارے پاس سے گزر گئی۔

ریستوران میں کوئی میز خالی نہ تھی.... لیکن کوئی بھی شخص تادیر اپنی نشست پر
قائم نہ رہ سکتا۔ اُسے ہال کی سلاٹ مشینیں' تاش کے پتے اور رولیٹ کی میزیں ایسے
سندیسے بھیجتیں کہ وہ بے چین ہو کر اُن کی جانب سفر کرتا.... اور اُس کی نشست پر کوئی
اور تھکا اور ہارا جواری ڈھیر ہو جاتا۔

سامنے کی میز پر ایک برگزیدہ اور عمر رسیدہ سردار صاحب کھائے چلے جا رہے
تھے اور پیئے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی نہایت دیسی اور نہایت ناقابل قبول سردارنی اُن پر
کڑی نظر رکھے فرنچ فرائز کے انبار نوش کرتی چلی جا رہی تھیں.... سردار صاحب کو سٹیج پر
رقص کرتی لڑکی سے یا جوئے سے کوئی شغف نہ تھا.... ایک بار جب وہ اُس شغف کی بوتل
حاصل کرنے کے لئے اُٹھے جس سے اُنہیں شغف تھا اور میرے قریب سے گزرے تو میں
نے حسب عادت پُوچھا "سردار جی کی ہو رہیا اے؟"

سردار صاحب نے میری طرف دیکھا اور پتہ نہیں میں اُن کو نظر آیا بھی یا نہیں
اور بوکھلا کر بولے "عیش ہو رہی اے میں کہیا۔---" اور چلے گئے۔

"اِس بابے سردار نے آپ کو زیادہ لفٹ نہیں کرائی" سُنہری بابا بہت خوش
ہوئے۔

"نہیں تو نہ سہی' میرا تو اخلاقی فرض ہے کہ کھٹمنڈو میں ہر سردار سے اُس کا
حال چال پوچھا جائے؟"

اتنی دیر میں سردار صاحب بار سے اپنی بوتل حاصل کر کے لوٹے تو میں نے پھر کہا
"سردار جی.... کتھوں آئے او؟"

"آپاں کلکتے توں آئے ہاں۔---" وہ اب بہتر موڈ میں تھے۔

"یہ سردار بنگال میں کیا کر رہے ہیں؟"

"مہاراج جو محنت کرتا ہے وہی پَھل کھاتا ہے۔ پورے ہندوستان میں صرف
سردار ہے جو کھوتوں کی طرح محنت کرتا ہے اس لئے پَھل کھاتا ہے...."

"آپ تو پھل کھانے کی بجائے پی رہے ہیں۔"

"آہو.... آپاں دا کلکتے وِچ دو پٹیاں دا بجنس اے.... کدی کلکتے آؤ تے کسے نوں
پچھ لیو کہ دوپٹے والے سردار جی کدھر ہیں.... پہنچ جاؤ گے.... تُسی دِلّی توں آئے او؟"

"نئیں.... لہور توں آئے ہاں۔"

سردار جی تھم سے گئے" سچ مچ دے لہور توں؟"

"آہو...."

"مہاراجہ رنجیت سنگھ دے لہور توں؟"

"ہاں جی۔"

"نہیں جی مزاق کرتے ہو.... ادھر نیپال میں.... سچ مچ دے لہور توں...."

"ہاں جی۔"

"تو مُجھے چرن چھونے دو مہاراج ننکانہ صاحب کے پاسے سے آئے ہو۔"
نے بمشکل اُنہیں اس اقدام سے باز رکھا....

"اُدھر لاہور میں میرے پتا جی اور میں امرتسر سے ٹرین میں بیٹھ کر جاتے تھے
فلمیں دیکھتے تھے تو میں تو ذرا چھوٹا تھا..." اُدھر اُن کی سردارنی اُنہیں نظر میں رکھے
فرائز مسلسل کھا رہی تھیں "مہاراج اُدھر انار کلی اب بھی ہے؟"

"ہے---"

"اور ٹھنڈی سڑک بھی ہے؟"

"ہے...."

"تو مُجھے چرن چھونے دیں۔" سردار جی بہت ہی گلوگیر ہو گئے اور میں جانتا تھا
چرن چھونے کے لئے ذرا جھکے تو وہیں ڈھیر ہو جائیں گے۔ میں نے پھر بڑی مشکل
اُنہیں باز رکھا۔

ہم اپنے ایامِ جاہلیت میں لکھنؤ اور دہلی کی یاد میں آہیں بھرتے اور پاکستا
سرزمین سے کوئی وابستگی نہ رکھتے مہاجرین کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے.... یہ کیوں نہ
بھولتے!.. کیوں ہماری زبان نہیں بولتے.... سندھ اور چناب کی بجائے گنگا اور جمنا کے گ
کیوں گاتے ہیں.... لیکن بہت بعد میں ہم پر کھُلا کہ زمین نہیں بھُولتی.... اپنے چھوڑ
ہوئے گاؤں اور شہر بے شک وہاں کھنڈر ہو چکے ہوں لیکن بدن میں بستے رہتے ہیں
بزرگوں کی قبریں محرم میں ہمیشہ اُس مٹی کی یاد دلاتی ہیں جو آپ اُن پر نہیں ڈال سکے
کوئی ایک پرندہ جو کسی آم کے پیڑ پر بولا تھا.... بولتا چلا جاتا ہے چپ ہی نہیں ہوتا۔

حسین اگر اپنے وطن کے لئے اب بھی کوکتے ہیں تو بُرا نہیں کرتے.... منیر نیازی لاہور کے
ٹاؤن شپ میں بھی ہوشیار پُور کی مہک میں آباد ہے تو وہ بے بس ہے۔ صادقین اگر امروہہ
کے طلسم سے باہر نہیں آتے تھے تو اُن کو دوش نہیں دیا جاسکتا....

راج کپور خاندان اگر اب بھی اپنی ہر شادی پر اور مرگ پر.... شادی شدہ
جوڑے کے چہرے پر یا مُردہ جسم پر پشاور کی مٹی چھڑکتا ہے تو اُسے معتوب نہیں کیا
جاسکتا۔ پران' اوم پرکاش اور کامنی کوشل لاہور کی انار کلی کو نہیں بھُول سکے۔ دھرمیندر'
سنیل دت' راجندر کمار' مدھو بالا' دلیپ کمار' بلراج ساہنی' راجیش کھنہ اور گلزار اور بہت
سے دوسرے اپنے سیالکوٹ' جہلم' ایبٹ آباد' راولپنڈی' پشاور اور دینے کو ساتھ لئے
لئے پھرتے رہے....

اوم پرکاش کی موت سے کچھ عرصہ پہلے لاہور کے دو نوجوان بمبئی گئے اور
ملاقات کے لئے اُنہیں فون کیا تو اُن کے سیکرٹری نے سختی سے انکار کر دیا کہ وہ بے حد
مصروف ہیں.... "جی ہم لاہور سے آئے ہیں" اُنہوں نے درخواست کی....

"تو جناب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا' اوم پرکاش جی نے کہہ رکھا ہے۔ اگر
کوئی لاہور سے آئے تو اُسے آنے دو۔"

ملاقات پر اوم پرکاش نے ان نوجوانوں کے جُوتوں کو غور سے دیکھا اور پوچھا "یہ
بھی لاہور سے آئے ہیں...." اور پھر جھک کر اُن پر جمی مٹی کو چھوا اور اپنے ماتھے پر لگایا
"میرے شہر دی مٹی لے کے آئے او.... میں تہاڈا داس ہاں...."

پچھلے دنوں راجستھان سے مُجھے ایک خط آیا "میں آپکے گاؤں جوکالیاں کا رہنے
والا ہوں.... میرے والد قصبے کے سکول میں فارسی پڑھایا کرتے تھے... عمر ستر برس سے
تجاوز کر چکی ہے۔ شاعری کرتا ہوں' بلھے شاہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ فضا جوکالوی
تخلص کرتا ہوں.... کتاب "رموزِ عرفان" روانہ کر رہا ہوں.... اس درخواست کے ساتھ کہ
اسے گاؤں کے کسی مدرسے میں پہنچا دیں۔ بے شک کسی گلی میں رکھ دیں' چناب کے
کنارے جو بیلا ہے اُس کے کسی درخت کی چھاؤں میں رکھ دیں.... میری تسلی ہو جائے
گی' اطمینان سے مر سکوں گا۔"

انور سجاد ہندوستان گئے تو راجندر سنگھ بیدی سے ملنے گئے۔ بیدی بہت بیمار تھے'

کہنے لگے' لاہور دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے..... کیا وہاں لوگ مجھے جانتے ہیں؟ اور
"بیدی صاحب آپ آئیں تو سہی' آدھا لاہور آپ کے استقبال کے لئے ایئرپورٹ پر
گا"..... تو وہ رونے لگے..... اُن کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

خشونت سنگھ کو آج بھی لاہور میں جو شکل نظر آتی ہے تصویر نظر آتی
ناول "دہلی" لکھنے کے باوجود دہلی میں کوئی کام کی شکل نظر نہیں آتی.....
"ٹرین ٹو پاکستان" لکھتا ہے تو قدرے جانب دار ہو کر لکھتا ہے.....

ہدایت کار اور شاعر گلزار اپنی تمام تر بین الاقوامی شہرت کے باوجود ابھی تک
کی گلیوں میں ہی رات کرتا ہے..... چاند پکھراج کا.....

تو یہ سردار جی بھی..... کھٹمنڈو کے ایک کیسینو میں جب لاہور اور پنجاب
بارے میں جذباتی ہو کر میرے چرن چھونا چاہتے ہیں تو اُس کے پس منظر میں بھی گوجرا
کی امرتا پریتم..... جنڈیالا شیر خان کا وارث شاہ اور قصور کا بلھے شاہ ہیں۔

اُس بزرگ سردار جی کو بھی صرف میں سمجھتا تھا جیسے ہوٹل سولٹی کے
کھڑے تین درختوں کو سمجھتا تھا.....

اس دوران سردار کی سردارنی نے اُسے ایک ایسے سٹیشن پر تادیر رُکے
جہاں اُس کا سٹاپ نہ تھا تو اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا جن کی تاب سردار نہ لاسکا
ہاتھ جوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

جواری حسینہ' جیت ہار کا مسئلہ طے کئے بغیر اپنی اداس آنکھوں سے سرگو
کرتی واپس آ گئی۔

ہمشیرہ کے ہاتھ میں بھی کچھ نہ تھا.....

وہ دونوں فاروق کی جیتی ہوئی رقم کو واپس کر کے آ گئی تھیں۔

اور فاروق جانے کہاں..... جانے کہاں تھا۔

میں کیسینو میں اتنی طویل موجودگی اور صبر کے بعد جب ریستوران سے اُٹھ کر
کے عقب میں واقع باتھ روم میں گیا تو وہاں بہت سارے جواری کموڈز اور یورینلز
اُوپر جھومتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ یہ کموڈ وغیرہ جو اُن کی سرخ آنکھوں کے
کے خمار کو حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے' ذرا ساکن ہو جائیں تاکہ وہ اطمینان سے

بوجھ ہلکا کر سکیں.....

جس کو دیکھا خمار میں دیکھا
جس کو چاہا خمار میں چاہا

ان میں وہ چیک شرٹ والا ہندوستانی جواری بھی تھا جس کے لئے رولیٹ کی
ایک میز کے گرد حصار قائم کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ آج کی شب کا سب سے اہم شخص تھا۔
جس نے بقول ہمشیرہ اپنی کماری کو برے وقتوں کے لئے بچا رکھا تھا اور لاکھوں روپے جیتنے
کے بعد اب ان لاکھوں روپوں کو ہارنے کے بعد شاید اس لمحے کو یاد کرتا تھا جب اس کے
پاس سب کچھ تھا..... جیت کی رقم سے وہ ایک گھر یا دو کاریں خرید سکتا تھا..... اگر وہ اس لمحے
میز سے اُٹھ جانے کا فیصلہ کر لیتا..... اور اُس نے دیر کر دی تھی..... اور اب اُس کے پاس
ایک ایسی کماری کے سوا کچھ نہ تھا جسے کوئی بھی جیتنا پسند نہ کرتا تھا.....

یہ "وار اینڈ پیس" کا پرنس ہو یا "جواری" کا جواری..... چیک شرٹ والا یہ
ہندوستانی ہو یا کوئی مستنصر حسین تارڑ..... یا کوئی اور آوارہ گرد جو زندگی کو داؤ پر لگاتا
ہے..... یہ سب ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں۔

وہ اُس لمحے زندگی کی رولیٹ میز سے اُٹھتے نہیں جب وہ جیت رہے ہوتے ہیں'
اُن کی کماری اُن کے پہلو میں ہوتی ہے..... جیتے ہوئے ٹھیپوں کے انبار اُن کے سامنے ڈھیر
ہوتے ہیں..... زندگی کے جوئے خانے کے سب لوگ اُنہیں حسد سے دیکھتے ہیں اور وہ اُس
لمحے اُٹھتے نہیں..... ذرا دیر کر دیتے ہیں.....

اس آس اور یقین میں کہ ابھی زندگی کے قمار خانے میں اُن کے لئے جیتنے کو
بہت کچھ ہے..... اور وہاں کچھ نہیں ہوتا۔

آپ اپنے بہترین ٹیلی ویژن ڈرامے لکھتے ہیں' اداکاری اور میزبانی میں سپرسٹار
ہو جاتے ہیں' بیسٹ سیلر ہو جاتے ہیں..... لیکن ہوس میں مبتلا ہو کر نہ شکر کرتے ہیں نہ
اُٹھتے ہیں اور دیر کر دیتے ہیں..... اور بالآخر آپ کے چہرے پر صرف راکھ ہوتی ہے.....
مٹی مٹی میں اور راکھ' راکھ میں۔

جواری کموڈز پر جھومتے تھے۔

میں باتھ روم سے باہر آ رہا تھا تو سامنے ایک ایسے کمرے میں سے جہاں سے

موسیقی کا شور اُبلتا آ رہا تھا ایک نیپالی خاتون باہر آ رہی تھی۔ وہ سراپا حسن تو نہ تھی سراپا شہوت ضرور تھی.... اگر کوئی مخمور شخص اُسے دیکھتا تو یہی کہتا کہ جس کو دیکھا میں دیکھا.... لیکن میں کیا کہتا.... اور اُس نے مجھے کچھ کہنے نہ دیا اور کہنے لگی "ہائے۔"

"ہیلو۔"

"آر یُو انڈین؟"

"نہیں.... پاکستانی"

"رئیلی...." وہ ذرا فرینڈلی ہوگئی "ادھر پاکستانی تو کم ہی آتے ہیں.... بلکہ تم پہلے پاکستانی ہو.... ادھر نیپال میں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"ادھر چیری کے شگوفوں سے لدے میرے تین دوست ہیں اُنہیں ملنے ہوں۔"

"ونڈر فل۔" اُس نے اس نہ سمجھ میں نہ آنے والے بیان کی وجہ سے مجھے کموڈز پر جھومنے والا کوئی جواری جانا "صرف اس لئے آئے ہیں؟"

"اور.... ایورسٹ کے چرن چھونے.... انا پورنا کو پرنام کرنے...."

اُسے یقین ہوگیا کہ میں یا تو مخبوط الحواس ہوں اور یا حالتِ خمار میں ہوں۔ وہ اِن دونوں حالتوں کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"یہیں ہوٹل سولتی کے کمرہ نمبر ۵۵۰ میں...."

"سی یُو----" اُس نے اپنے مختصر ہس پر پھنسے لباس کو گرفت میں لے کر کیا اور چلی گئی۔

میں اپنی میز پر چلا گیا۔

سٹیج پر جو گلوکار تھے۔ اگرچہ اُن کو کوئی نہیں سنتا تھا.... سب حالتِ خمار حالتِ قمار میں تھے لیکن وہ مائک کو تھامے اُس میں یہ کہتے تھے کہ ہم نے دیر نہیں کی ہم آگئے ہیں....

جانے کس لمحے.... باہر ابھی تک رات تھی یا دن تھا.... اُنہوں نے ایک شروع کیا.... پُرانی جینز اور گٹار.... بہت مانوس اور دل کش طرز کا نغمہ.... یہ پاکستانی علی حیدر کا ایک پاپ سونگ تھا اور اب جو میں نے کھٹمنڈو کی رات میں.... اُس انجان

پرائی رات میں اُس قمار خانہ کے خمار میں سُنا تو میں اپنی زمین کے لئے اُداس ہوا اور اُس پرانی جین اور گٹار پر میں نازاں بھی ہوا کہ وہ دونوں سفر کرتے ہوئے اس رات میں پہنچ چکے تھے۔

گیت کا اختتام ہوا تو میں اُٹھ کر سٹیج کی جانب گیا اور گلوکاروں اور موسیقاروں کا شکریہ ادا کیا....

"تھینک یُو...."

"یُو آر ویلکم سَر...." اُن کی مسکراہٹ میکانکی اور کاروباری تھی....

"آپ نے میرے پاکستان کا ایک گیت گایا.... میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں"

"یہ پاکستانی گیت ہے؟" اُن کے چہروں سے کاروباری مسکراہٹ سمٹ گئی اور اس کی جگہ حیرت قیام پذیر ہوئی "ہم نہیں جانتے تھے.... آپ پاکستانی ہیں؟"

"وہ تو میں ہوں۔-۔-۔" میں نے فاروق کے جیتے ہوئے کچھ نیپالی نوٹ اُن پر نچھاور کئے اور اپنی میز پر واپس آگیا۔

اگرچہ میں نے اس کیسینو کی کسی رولیٹ میز کے کسی سُرخ یا سیاہ خانے میں داؤ پر ایک بھی ٹھپہ نہیں جمایا تھا.... تاش کی کوئی بازی نہیں لگائی تھی۔ کسی سلاٹ مشین کا ہینڈل نہیں گھمایا تھا.... اور اس کے باوجود میں ایک ہارا ہوا جواری تھا....

اس لئے کہ میں ایک آوارہ گرد تھا اور ہمیشہ دیر کر دیتا تھا....

میرے جوگرز.... سنو جیکٹ.... اور اونی بنیانیں ابھی سُوٹ کیس سے باہر آ کر سانس نہیں لے سکتے تھے۔

میں زندگی کے قمار خانے میں بہ رضاؤ رغبت آ تو گیا تھا.... اس کے باوجود کہ میں جانتا تھا کہ میں جیت نہیں سکتا.... کسی جھیل کرومبر.... کسی شاہ گوری کو اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا تھا.... وادیٔ سونج کی بلندی پر کسی آبشار میں بھیگتے زرد پھولوں کو اپنے گھر میں نہیں لا سکتا تھا.... وادیٔ سوختر آباد کے کسی زرد سنو ٹائیگر کو اپنا نہیں سکتا تھا.... دیو سائی کے میدانوں میں جو عجب رنگت اور شکل کے پھول کھلتے ہیں اُنہیں اپنے میدانوں میں نہیں لا سکتا تھا۔ سنو لیک پر تیرتی کشتیوں کے بادبانوں کا رُخ مُوڑ کر اُنہیں اپنے ڈرائنگ روم کی

زینت نہیں بنا سکتا تھا اس لئے میں ایک ہارا ہوا جواری تھا۔
چنانچہ میں اُس قمار خانۂ حیات سے اُٹھ گیا....

رات کے کسی پہر میں.... جب میں تھکاوٹ اور بے وجہ خمار کی زد میں
نیند میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں.... لاہور میں ہوں.... کھٹمنڈو میں ہو
ارضِ روم میں ہوں میرے دَر پر کوئی دستک ہوئی' اور تادیر ہوئی....
یہ دستک ایک عالم خواب میں تھی....
ایک دُھند میں لپٹے خیال میں تھی....
نیند کی عارضی موت میں کوئی میرے بدن کے دروازے پر ہاتھ رکھتا تھا
تادیر رکھتا تھا....
اور میں نے نرم تکیے میں دفن اپنے مختصر ہوتے بالوں' آنکھوں کو.... اور عم
ڈھلتے چہرے کو اُٹھایا اور ہوٹل سولتی کے روم نمبر ۵۵۰ کی نیم تاریکی میں کہا "کون ہے؟
اور میرے نیند میں ڈوبے وجود کو یوں لگا جیسے خلیل جبران جواب میں کہتا ہے
میں کبھی لاجواب نہیں ہوا.... سوائے اُس شخص کے.... کہ جس نے مجھ سے پوچھا ہو کہ
کون ہے؟
لیکن رات کے اس پہر.... میرے دروازے پر خلیل جبران تو دستک نہ دے
تھا۔
نہ دوستو وسکی اور ٹالسٹائی مجھے اس بے ہنگم وقت میں ملنے کے لئے آسکتے
کون تھا جو میرے دروازے پر مسلسل دستک دیتا تھا۔
میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور ڈولتا ہوا دروازے تک پہنچا
حالت ناگواری میں پہنچا اور دروازہ کھولا تو سامنے قمار خانے کے باتھ روم کے باہر
نیپالی خاتون سے ملاقات ہوئی تھی.... جو خوش شکل نہ لگی تھی خوش شہوت لگی تھی
کھڑی تھی۔
"سوری.... مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا" وہ کمر تک جھک
گئی.... اور اُس کی کمر کمان ہوتی تھی اور اُس کے جسم پر لباس پھنستا تھا....

"نہیں—"
وہ صرف مسکرائی۔
"فرمایئے...."
"میں نے کہا تھا ناں کہ.... سی یُو.... تو میں آپ کو دیکھنے آگئی ہوں...."
اس نے کیا دیکھنا تھا.... جو دیکھنے آگئی تھی۔
شاید وہ لونگ گاڈیس کا ایک رُوپ تھی.... جو ملاقات کے لئے آگئی تھی۔
کماری' کماری....
"سوری—" میں نے دروازہ بند کر دیا....
کسی کو کیا پتہ کہ دروازہ بند کرنے سے بند ہوتا بھی ہے یا نہیں....
کماری' کماری....

”شب کا خمار... ایورسٹ کا بخار“

ناشتے کی میز پر.... ایک اور سویر تھی.... ایک اور قمار کی شب کا خمار تھا۔

کھٹمنڈو کی پہلی دھوپ میں ریستوران کے باہر ہوٹل سولٹی کے لان میں ا
فوارہ اُبلتا تھا۔ جس کے پانیوں کا اُبال جب اپنی شدت سے تھک کر ذرا ٹوٹتا تھا اور پھر
ہوتا تھا تو اُس پر پہلی دھوپ کا سنہری اثر گھل کر اُسے پگھلا ہوا سونا بناتا تھا اور پھر
آتشِ آفتاب کی پہلی کرنوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوارے میں گر جاتا تھا۔

ناشتے کی میز پر....

ہمشیرہ.... اپنی پلیٹ میں رکھے نہایت مختصر اور باریک اور جلے ہوئے ٹوسٹوں
کانٹے سے بے دلی سے ادھر اُدھر کرتی تھیں جیسے کوئی بھٹیارن مکئی کے دانوں کو بھٹی
اُلٹ پلٹ کرتی ہے اور وہ دانے جل گئے ہوتے ہیں۔

وہ نہایت سنجیدہ تھیں اور اس کے ساتھ رنجیدہ بھی تھیں" اگرچہ میں ا
جوس کے تین چار گلاس پی چکی ہوں لیکن میری تسلی تب تک نہیں ہوتی جب تک
ایک نیم گرم کڑکڑاتا ہوا ٹوسٹ نہ کھا لوں.... لیکن.... تارڑ صاحب اِن آپ کے
نیپالیوں کو.... ڈبل روٹی بھی بنانا نہیں آتی.... ہائے وہ اپنے پاکستان کی ڈبل روٹی جس
ٹوسٹ بھرے ہوئے اور ٹھوس ذائقے والے ہوتے ہیں اور جب ٹوسٹر میں اُچھل کر
ہیں اور اُن پر گھریلو مکھن لگایا جاتا ہے اور وہ اُن پر فی الفور پگھلتا ہے تو اُن کی مہک
آپ کے باغ میں کھلے ہوئے پیٹونیاز اور ڈہلیاز بھی مست ہو کر ذرا زیادہ کھل جاتے ہیں

اور یہ ٹوسٹ ایسے گرما گرم اور کڑکڑاتے ہوتے ہیں جیسے گاؤں کے تندور میں سے نکلنے
والی دیسی گندم کی روٹی.... اِن نیپالیوں کو".... ہمشیرہ نے ٹوسٹ ٹٹولتے ہوئے بیان دیا "اِن
نیپالیوں کو نہ ڈبل روٹی بنانا آتا ہے اور نہ اُس پر مکھن لگانا آتا ہے۔ اور نہ...."

"آپ پاکستان کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائیں گی ہمشیرہ؟"

"فی الحال تو ڈبل روٹی کو یاد کر رہی ہوں"

ناشتے کی میز پر بھی سب کی حیثیتیں الگ الگ تھیں۔

بنگلہ دیشی وفد کی خواتین فوارے کے رُو بہ پہلی کرنوں والے چمکتے منظر والی شیشے کی
کھڑکی سے لگ کر بیٹھی تھیں اور اُن میں دو ایسی تھیں جنہوں نے نہایت اہتمام سے اپنے
سر کو ڈھانپ رکھا تھا.... اس کے باوجود کہ ہم اُنہیں کوئی مناسب مسلمان نہیں سمجھتے
تھے.... اب تو اُنہیں کیا پرواہ کہ ہم اُنہیں کیا سمجھتے ہیں یہ تب کی بات ہے جب پاکستان'
پاکستان تھا اور منبر و مسجد سے اور سیاست کی سٹیج سے یہی اعلان کیا جاتا تھا کہ یہ پاکستان
قیامت تک قائم رہے گا.... بس یہ الگ بات کہ وہ قیامت صرف چوبیس برس بعد ہی آ گئی
تو یہ تب کی بات ہے جب ہم اُنہیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہارمونیم پر اپنے
دریاؤں کے گیت گاتے تھے اور اللہ بارش دے کی بجائے اللہ میگھ دے پکارتے تھے جو
سراسر نظریۂ پاکستان کے خلاف تھا۔ اپنے جنگلوں میں رہنے والے جانوروں اور تالابوں
میں اُچھلنے والی مچھلیوں سے پیار کرتے تھے۔ رقص کرتے تھے اور نذرل کے نغمے الاپتے
تھے جو کلکتہ میں رہتا تھا۔ اقبال اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا جو ایک مرتبہ پھر نظریۂ پاکستان
کے منافی عمل تھا.... یہاں تک کہ ہندو ٹیگور کی شاعری کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور اُن کی
خواتین ساڑھیاں باندھتی تھیں جو ایک باپردہ لباس نہ تھا اور اُن کی اُردو نہایت کمزور تھی
اور انگریزی کا لہجہ بہت خراب تھا اور اُن کی رنگت نیم سیاہ تھی اور قد چھوٹے تھے۔
ہماری مسلمانی کا معیار جدا تھا۔ ایک اچھا مسلمان صرف شلوار قمیض پہنتا ہے' موسیقی کو
حرام سمجھتا ہے' اُس کی اردو کا شین قاف درست ہوتا ہے۔ انگریزی آکسونین لہجے میں
بولنے کی سعی کرتا ہے' دراز قد اور کھلی رنگت کا ہوتا ہے چنانچہ وہ ہمارے معیار پر پورے
نہیں اُترتے تھے.... اس کے باوجود کہ مسلم لیگ صرف بنگال میں جیتی تھی پنجاب یا سرحد
میں نہیں' اور تحریکِ پاکستان کا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا.... لیکن وہ ہماری مسلمانی اور

حب الوطنی کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے.....

تو اُنہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ہم بھی اُن کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

آج سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ اپنے ملکی معاملات ہم سے بہتر پر چلا رہے ہیں' یہاں تک کہ انہوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی کنٹرول کرلیا ہے اور کہتے ہیں کہ بنگالی بچے پیدا کرنے سے باز نہیں آسکتا۔ اُن کی معیشت بہتر ہے اور بینکنگ سسٹم تیسری دنیا میں ایک مثال کے طور پر اپنایا جارہا ہے.... اُن کے خزانے پاکستان سے دوگنے ذخائر ہیں' اور وہ اپنے ایئرپورٹس' کارپوریشنیں' بجلی گھر' موٹروے کارخانے غیرملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی ناکام کوشش نہیں کررہے البتہ وہ ایک میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اُن کا ممبر پارلیمنٹ اتنا بے چارہ ہے پارلیمنٹ کے اجلاس میں شمولیت کے لئے سائیکل' رکشے یا کسی کھٹارہ کار میں آتا ہے بلکہ پیدل بھی آتا ہے.....

اگرچہ ہم اُنہیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے لیکن بنگلہ دیش کے وفد خواتین میں سے دو ایسی تھیں جو اپنے سر کو ڈھانپے ہوئے تھیں اور پاکستانی وفد کی خواتین ننگے سر تھیں کیونکہ ہم بہتر مسلمان تھے.....

ویسے اس پوری کانفرنس میں واحد مسلمہ مسلمان' مسعود تھا۔

مسعود ایک خوشگوار طبع کا ہمہ وقت مسکراتا ہوا سیاہ ریش نوجوان تھا جو کانفرنس میں طالبان کے افغانستان کی نمائندگی کررہا تھا.... سُنہری بابا کا کہنا تھا کہ طالبان ہر دو چار روز بعد اُس کی داڑھی مٹھی میں لے کر چیک کرتے ہیں کہ یہ مطلوبہ طالبانی معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں.... کیونکہ اِنہی دنوں کابل میں ایسے ایمان افروز مظاہرے دیکھنے میں آ تھے کہ اگر آپ کی داڑھی مٹھی میں لینے سے ان کے چند بال مٹھی سے باہر نہیں جھانکتے تو آپ کو برسرعام سزا دی جاتی ہے.....

لیکن اس کے باوجود مسعود ایک سلجھا ہوا پُرامن اور نفیس طبیعت کا نوجوان تھا اور خاص طور پر میری باتوں کا برا نہیں مانتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا اور کسی حد تک مجھ سے محبت کرتا تھا.....

یہ الگ قصہ ہے کہ کیا آپ کسی طالبان کی محبت کا خطرہ مول لے سکتے ہیں!

نہیں.....

وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتا تھا لیکن قمار خانے میں جانے سے انکاری ہوگیا تھا'

"آپ میری پوزیشن سمجھتے ہیں ناں....."

اور ہم اُس کی پوزیشن خوب سمجھتے تھے.....

ایک سیشن کے دوران سُنہری بابا نے اُسے دھمکی دی تھی کہ مسعود میں ان بالی حسیناؤں کے ساتھ آپ کی تصویر اُتاروں گا اور خاص طور پر اس حسینہ کے ساتھ جے آپ بے حد رغبت سے دیکھتے ہیں اور جس کی ناف بہت خوبصورت ہے.... اور یہ تصویر کابل میں طالبان کو روانہ کردوں گا۔

اور اس نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا "ہماری یہ قسمت کہاں جناب---"

ناشتے کی میز پر ابھی تک قمار خانے کی شب کا خمار تھا۔

"رات آپ کے کمرے میں کوئی آیا تھا؟" فاروق نے ذرا آگے ہو کر اپنی مونچھیں سنواریں۔

"نہیں۔"

"جانے دیں سر۔"

"شاید کوئی دستک ہوئی تھی۔"

"وہ دستک میرے دروازے پر بھی ہوئی تھی۔"

"پھر....."

"پھر آپ نے بتایا ہے کہ آپ نے دروازہ کھولا تھا یا نہیں۔ تو میں کیوں بتاؤں.... میں بھی تو کیسینو کے باتھ روم تک گیا تھا اور کسی نے "سی یُو" کہا تھا"

ریستوران سے باہر فوارے کے اُبلتے پانیوں کو اب کھٹمنڈو کی دھوپ سے ملاپ کے لئے زیادہ بلند نہیں ہونا پڑتا تھا۔ وہ نیچے آچکی تھی اور ہوٹل کے لان میں گمبری انتھم کے پھولوں کے تختوں کو اندھا کردینے والے لشکیلے رنگوں کے ایک دریا میں بدلتی تھی۔

"تارڑ صاحب...." ہمشیرہ نے اپنی عینک سے معمول کی چھیڑ چھاڑ کرکے اُسے درست کیا "آپ مجھ سے ہاتھ ملائیں۔"

"میں نہیں ملاتا۔"

"کیوں؟"

"میں صدیوں پہلے جب انگلستان سے لوٹا تھا اور خاصا مغربی ہو چکا تھا تو رشتے کی خالہ زاد بہن کو میں نے کسی بات پر خوش ہو کر کہا تھا کہ ہاتھ ملائیں' تو اُس نے جواب میں کہا تھا' تمہیں شرم نہیں آتی ماؤں بہنوں کے ساتھ مذاق کرتے ہو... تو آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر سکتا کہ آپ ہمشیرہ صاحبہ ہیں"

"آپ تو بہت ہی بیک ورڈ ہیں۔" ہمشیرہ نے چہک کر کہا "لیکن میرے پاس ایک زبردست انفریشن ہے' آپ سنیں گے تو ششدر رہ جائیں گے۔"

"میں ششدر رہنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں.... آپ فرمائیے۔"

"یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ایک پہاڑی قصبہ نگر کوٹ نام کا ہے۔ جو بھی کھٹمنڈو آتا ہے وہاں ضرور جاتا ہے...."

"کیوں جاتا ہے اور وہاں جانے میں کتنے آئی سی کا خرچہ آتا ہے" سُنہری بابا دلچسپی لینے لگے۔

"اس لئے کہ وہاں پہنچنے پر آپ کو عظیم ہمالیائی منظر نظر کے سامنے بچھے برف آتے ہیں۔ اور صبح سویرے جو وہاں کا طلوع آفتاب ہے وہ غضب کا طلوع آفتاب ہے کہتے ہیں کہ اُس کی پہلی کرنیں آپ کی نظروں کے سامنے ایورسٹ اور اناپورنا کی دیویوں پر پڑتی ہیں.... تو اس منظر کو دیکھنے کے لئے ایک دنیا وہاں جاتی ہے۔ ہم بھی تو میں شامل ہیں.... کیا خیال ہے اگر ہم لوگ کل صبح پانچ بجے نگر کوٹ کے لئے روانہ جائیں' یہ ہوش رُبا منظر دیکھیں اور دس بجے تک واپس آ جائیں' کیا خیال ہے؟"

"یہ خیال آپ کو سُجھایا کس نے ہے؟"

"اُس نیپالی رُوپا لڑکی نے جو یونیسف کے لئے کام کرتی ہے.... سفید ساڑھی ہے اور آپ سب لوگ کانفرنس کے دوران اُسے اُلوؤں کی طرح تکتے رہتے ہیں۔ اُس کی ننگی کمر کو ایسے تکتے ہیں جیسے وہ کسی چیتے کی کمر ہو.... اور اُس کی کمر ہے بھی اگرچہ پیٹ پر چند جھریاں بھی ہیں"

"نہ جی.... ہم تو نہیں تکتے۔" میں نے فوراً احتجاج کیا۔

"سسٹر.... یہ آپ ہم پر کیا الزام لگا رہی ہیں؟" فاروق نے فوراً میرا ساتھ دیا۔

سُنہری بابا نہایت متانت سے گویا ہوئے "کیا وہ خاتون جو کرپچن کے برابر میں بیٹھتی ہیں تو نہایت دل رُبا لگتی ہیں اور مسکراتی ہیں تو دو دانت ذرا چھپا کر مسکراتی ہیں کہ وہ ذرا ٹوٹے ہوئے ہیں اور ساڑھی ذرا نیچی کر کے باندھتی ہیں اور اُن کی ناف.... ذرا دل کش ہے"

"ہاں ہاں وہی" ہمشیرہ خوش ہو گئیں "آپ نے تو اُن کو دیکھا ہے ناں؟"

"میں نے تو آج تک اُن کی جانب نہیں دیکھا' قسم لے لیجئے...." سُنہری بابا فوراً مکر گئے۔

"بہرحال اُس نے مشورہ دیا ہے کہ ہمیں ہر حال میں نگر کوٹ جا کر ایورسٹ پر طلوع آفتاب کا منظر دیکھنا چاہئے۔"

"وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی؟" یہ فاروق نے پوچھا۔

"کیوں؟" ہمشیرہ اس سوال جواب سے تنگ آ گئیں۔

"ذرا لوکل ٹیلنٹ ساتھ ہو تو ثقافت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔"

"تو کیا خیال ہے؟"

"کیوں تارڑ صاحب.... کیا خیال ہے؟" خالدہ گمشدہ جن کی موجودگی سے ہم غافل ہو چکے تھے ذرا غفلت کے انداز میں دھیرے سے چپکے سے بولیں۔

"ہم سب کل صبح نگر کوٹ جا رہے ہیں' کشور ہندوستان کی فصیل پر اُبھرتے آفتاب کا نظارہ کرنے.... یہ اس وفد کے بزرگ ترین ممبر کا فیصلہ ہے.... ایورسٹ ہیئر وی کم...." میں نے اعلان کر دیا۔

"لیکن سَر...." ملک صاحب سرکاری طور پر متوجہ ہو گئے "اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ اس نگر کوٹ سے نو بجے تک واپس کھٹمنڈو آ جائیں گے کیونکہ کل تو نہایت اہم اور حساس نوعیت کا اجلاس ہے"

"کل کے اجلاس میں کیا ہے جو اہم ہے اور حساس نوعیت کا ہے؟"

"کل ہم بحث کریں گے کہ نیتا کے بارے میں جو کتابچہ شائع کیا جائے وہ تین صفحے کا ہو گا یا چار صفحے کا.... اور وہ کس جانب سے کھلے گا.... اور اس کے ٹائٹل پر نیتا کی جو

تصویر ہوگی اُس میں اُس کی پونی ٹیل کا رنگ سیاہ ہوگیا یا براؤن.... اور اُس کا
طوطا مٹھو کتنی بار "ٹیں" کرے گا.... ہم سب کی موجودگی اشد ضروری ہے"

"تارڑ صاحب یہ تو طے ہے کہ ہم کل صبح بفضل خدا نگر نگر جائیں گے"
سرگوشی نے سرگوشی کی۔

"نگر نگر نہیں.... نگر کوٹ---"

"وہی.... میں جانتی ہوں.... جیسے ہمارے ہاں سیالکوٹ ہے' کوٹ ڈیجی ہے یا
کوٹ ہے جہاں اکبر پیدا ہوا تھا.... ایسے نگر کوٹ...."

"وہاں ایورسٹ پیدا ہوگی کل سویرے سویرے۔"

"لیکن اس سے پہلے میرا ایک مسئلہ بھی حل کر دیجئے۔" منہری بابا نے نہایت
عاجزی سے وفد کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا "میری مسلمانی کمزور اور ناتواں ہو رہی ہے۔
میری پٹھانیت مشکوک ہو رہی ہے۔ میں سبزیوں اور پھیکی دالوں سے عاجز آچکا ہوں۔
مجھے نمک منڈی پشاور کا کڑاہی گوشت چاہئے... باڑے کے شنواری تکے اور بختو پل کے
چپل کباب چاہئیں۔ لاہور کے گُردے کپورے اور چانپوں کی کھٹا کٹ کی موسیقی کو میں
ترس گیا ہوں.... میرا کچھ کرلیں...."

اور یہ کیفیت ہم سب کی تھی.... ہم سب کا اسلام خطرے میں تھا.... سُنا تھا کہ
نیپال میں پانچ فیصد مسلمان ہیں اور اس شہرِ کفار میں کہیں کسی کونے میں ایک دو ہوٹل
اُن کے بھی ہیں لیکن کہاں ہیں کوئی نہ جانتا تھا۔

ہماری زبانیں پژمردہ اور نڈھال ہوچکی تھیں اور اُن کے تنِ مُردہ میں صرف
پاکستانی سٹائل کا بھنا ہوا گوشت' مٹر قیمہ' گردے کپورے اور تنور کی روٹی ہی جان ڈال
سکتے تھے۔

مسلمان ہونے کا ایک فائدہ تو ایک خدا تھا لیکن سب سے بڑا نقصان کڑاہی
گوشت اور روسٹ چکن کا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں ضیاء صاحب ہم آج کھٹمنڈو میں کسی نہ کسی مسلم ریستوران
کا سراغ لگا کر ہی چھوڑیں گے.... اور ہم وہاں طرح طرح کے حلال گوشت کھائیں گے"

"ویسے آئی سی میں اُن کی کیا قیمت ہوگی؟" ضیاء صاحب رہ نہ سکے۔

ابھی خوراک کا مسئلہ حل ہو ہی رہا تھا کہ خالدہ سرگوشی نے ایک سازشی سرگوشی
کی "نہیں تارڑ صاحب---"

"مجھے کچھ سنائی دے تو میں سنوں.... ذرا بلند آواز میں بولیں۔"

وہ بلند آواز میں بھی بولیں تو ایسے بولیں جیسے کنویں میں گرا افیمی بولتا ہے۔ "سنا
ہے یہاں کہیں قریب ہی نیپالی پشمینے کی ایک فیکٹری ہے.... وہاں کھڈیاں لگی ہوئی ہیں اور
ہاتھ سے تیار ہوتا ہے۔ زبردست شاپنگ ہے... آپ نے سنا ہے؟"

"میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں اور سُنا
ہے کہ اُس کی باتوں سے پھول جھڑتے ہیں اگر یہ بات ہے تو بات کر کے دیکھتے ہیں اور
ستارے فلک سے اُتر کر دیکھتے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ دن کو اُسے تتلیاں ستاتی ہیں اور
رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں' ہم نے تو صرف اتنا سُنا ہے...."

سرگوشی نہایت سرگوشی ہو کر قدرے رُوٹھ گئیں "تارڑ صاحب میں تو اس سے
پیشتر آپ کی بہت عزت کرتی تھی.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ میں نہیں میرا ایک عزیز دوست احمد فراز کہہ رہا ہے.... جو کچھ اُس نے
غزل میں کہا ہے وہ میں نے نثر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"نہایت بیہودہ کوشش ہے"

"مجھے شدید اتفاق ہے تو پلیز آپ سنائیں کہ آپ نے اور کیا سُنا ہے"

"بس یہی کہ وہاں زبردست شاپنگ ہے تو اگر ہم کل اس نگر کوٹ میں صرف
ایورسٹ دیکھنے کے لئے ٹائم ضائع نہ کریں اور اُس فیکٹری کا کھوج لگائیں تو میرا خیال ہے
زیادہ بہتر ہوگا.... پلیز تارڑ صاحب۔ وہاں سے پشمینہ کی شال خریدیں گے۔"

"ہیں.... آپ ایورسٹ پر طلوع ہوتے آفتابی منظر پر ایک شال کو ترجیح دیتی
ہیں۔"

"ہاں.--" سرگوشی نے صرف ہاں کہا اور کارن فلیکس کھانے لگیں۔

میں بے حد شاکڈ ہوا "یعنی آپ مکمل سنجیدگی سے یہ "ہاں" کہہ رہی ہیں...."

"ہاں.... ایورسٹ کو آپ بعد میں اوڑھ تو نہیں سکتے...."

"خیالوں میں تو اوڑھ سکتے ہیں۔"

"پلیز گرو اَپ تارڑ صاحب...."

"میں جتنا گرو کر سکتا تھا کر چکا۔ اب مزید گنجائش نہیں" سب لوگ بہ
بے حد مایوس ہو رہے تھے.... میری ذہنی نشوونما کسی ایک مقام پر آ کر رُک گئی تھی
ارتقاء کی کسی ایک سیڑھی پر آ کر تھم گیا تھا صرف اس لئے کہ اس سے آگے حیرت
ہوتی تھی اور حقیقت شروع ہو جاتی تھی.... اس سے آگے ایک شال ایورسٹ سے
اہم ہو جاتی تھی۔

ریستوران سے باہر فوارے پر اب دھوپ پوری طرح اُتر چکی تھی۔ اُن
پانی ایسے اُبلتے تھے جیسے وصال کے پانی بے اختیار اُبلتے ہیں....

میں نے اُن حیرتوں کے بارے میں سوچا جن کے لئے میں نے زندگی گنوا
اُن حیرتوں نے بہت سارے خطوں پر پرواز کی.... کوہِ آرارات۔ جھیل جنیوا۔ قرطبہ
شاموں اور سویڈن کے جنگلوں.... روم۔ ارضِ روم۔ فرانس۔ ہرات۔ شاہ گوری
پربت اور جھیل کرومبر پر پرواز کی.... لیکن خواہشوں اور حیرتوں کے اس قمار خانے
مَیں ہمیشہ ایک ہارا ہوا جواری تھا۔

جو میں جیتنا چاہتا تھا وہ نہ جیت سکا....

اور جو ہارنا چاہتا تھا وہ نہ ہار سکا....

فوارے کے سارے پانی چھاؤں سے آزاد ہو کر تیز دھوپ میں آ چکے تھے۔

میرے ساتھیوں میں سے کون ہے جو میری ایک اور حیرت کا سامان بن
ہے.... میرا ساتھ دے سکتا ہے۔

اس قیدِ کھٹمنڈو سے رہا ہو کر کشورِ ہندستان تک میرے ساتھ مل سکتا ہے۔

سُنہری بابا.... اُنہوں نے بہرصورت اسلام آباد ٹیلی ویژن ہیڈ کوارٹر پہنچنا ہے
وہاں پہنچ کر وہی کرنا ہے جو حکومت وقت چاہتی ہے۔

حکومت وقت.... ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہے۔

وہ سیکولر ہو' سوشلسٹ ہو یا اسلامی.... وہ مکمل تابعداری اور اطاعت چاہتی
یوں اُن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا.... وہ کسی نہ کسی کا حق پامال کرتی
ان حقوق کو پامال کرنے کے لئے ہمیشہ میڈیا استعمال ہوتا ہے جس کا ایک پُرزہ ملنا

ہوں اور ایک کل پُرزہ سُنہری بابا بھی ہیں چنانچہ وہ بھی مجبور ہیں کہ کورنش بجا لائیں۔

فاروق کو اپنی صحافتی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔

سلمان اپنی بین الاقوامی حیثیت کی گرفت میں تھا۔

اور باقی رہ گئیں ہمشیرہ اور سرگوشی.... اور اُنہیں میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا کہ

نیں دی جاناں جھوک ایورسٹ دی نال میرے کوئی چلے....

میرے نال کوئی نہیں جا سکتا تھا۔

میری سنو جیکٹ اور جوگرز کے ساتھ جانے والا کوئی نہ تھا۔

جھوک ایورسٹ اور جھوک انا پورنا رانجھن کے دیس تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو
میرے ساتھ چل سکے۔

سب لوگ ارتقاء کی سیڑھی پر مجھ سے آگے جا چکے تھے اور میں وہیں رُکا ہوا تھا
جہاں سے حیرت فنا ہوتی تھی اور حقیقت جنم لیتی تھی۔

کانفرنس ہال میں میزوں پر کہنیاں جمائے کرسیوں سے ٹیک لگائے.... چھت کو
تکتے اپنے پیروں کو دیکھتے ہر شخص کی پسند ناپسند الگ الگ تھی۔

میری پسند تو وہی تین درخت تھے جن کے شگوفے فٹ پاتھ پر گر کر ایک تیز
تیزاب کی طرح اُس میں چھید ڈالتے تھے.... اور مجھ سے شکایت کرتے تھے۔

البتہ ہم سب.... یعنی نام کے مرد حضرات اُس نیپالی رُوپا جوشی دوشیزہ کو تکتے
جاتے تھے اور بہت دیر تک اُس کے برہنہ پیٹ اور کمر کو تکتے جاتے تھے اور اُس پر جو عمر
کی شکنیں تھیں وہ صرف تب نظر آتیں جب وہ پہلو بدلتی.... اور یہی شرمیلی رُوپا تھی جس
نے ہمشیرہ کو نگر کوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا.... اور یہ شرما دوشیزہ جب کبھی اپنی احتیاط سے
باہر آتی اور چہرے کو کسی اور رُخ پر کرتی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری عمر سے کچھ زیادہ
فاصلے پر نہیں ہے اور صرف تازہ ترین کاسمیٹک' شدید ورزش اور خوراک میں احتیاط نے
اُسے سنبھالا دیا ہوا ہے.... اور اس کے باوجود اُس کی کمر کی ہڈی' سیدھی اور دلکش تھی....
اور ناف ایسی تھی کہ چاندنی رات میں بھی وہ تاریک ہوتی ہوگی۔

کانفرنس میں اُنہی حساس اور نہایت اہم موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوئی جس کا

تذکرہ ملک نے ناشتے کی میز پر کیا تھا۔

نینا بروشر کے صفحے کتنے ہوں گے، تین ہوں گے یا چار ہوں گے، اور... جانب سے کھلے گا اور نینا کی پونی ٹیل کا رنگ کیا ہوگا.... اور طوطا مٹھو کتنی بار "... کرے گا۔

اور میں چونکہ توبہ تائب ہو چکا تھا اور اختلاف کو رد کر کے اتفاق پر ... تھا اس لئے میرے لئے کرسچن اور میری این کی جانب سے صرف مسکراہٹیں ... پُرشفقت ہمت افزائی اور نیٹو کے لئے صرف شاباش تھی۔

لیکن کانفرنس ہال کی اندھی کھڑکیوں کے پار میرے وہ تین دوست تھے ... میں دیکھ نہیں سکتا تھا....

وہی کسک اور محرومی تھی.... حیرت کی سیڑھی پر رُکے ہوئے میں پوچھتا تھا کہ یہاں کیا کر رہا ہوں؟

لنچ بریک ہوئی....

کرسچن نے اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کسی پرائمری سکول ٹیچر کی طرح اُنگلی اُٹھا کر ہم نادان بچوں کو ہدایت کی "پوسٹ لنچ سیشن پورے دو... شروع ہو جائے گا.... خبردار کوئی ڈیلی گیٹ دیر سے نہ آئے...."

میں گیس چیمبر سے فرار ہونے والے کسی یہودی کی طرح کانفرنس ہال سے... آیا اور ریستوران کی جانب رُخ کرنے کی بجائے پورچ میں آکر ایک گہرا سانس لیا....

ایک اور تھاپا نام کے ٹیکسی ڈرائیور سے گفت و شنید کی اور دھو کا دربار کی جا... روانہ ہوگیا....

دن کی روشنی میں وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

اُس کی پہچان سرِشام تھی۔

جیسے ایک شراب خانہ میں ملنے والی.... اُس سے مِس یونیورس دکھائی دیتی اور اگلی صبح پہچانی نہیں جاتی....

بسنت چوک دھوپ میں سفید ہو رہا تھا....

کماری کا مندر پنجاب کی تپتی ہوئی دوپہر میں کوئی ایمن آباد کی ہندو حویلی تھی

جس میں کوئی فریب، کوئی کشش نہ تھی، اُس کے اندر لونگ گاڈیس بھی اونگھ رہی ہوگی....

بسنت چوک کے پہلو میں جو بازار تھا.... جہاں میں نے ایک کھڑکی میں جھکتی مت الست دوشیزہ کو اپنے نیپالی بوائے فرینڈ کے سامنے چہرہ فروغِ مے سے گلنار کئے ہوئے دیکھا تھا اور ایک عمر رسیدہ نائٹ کی حیثیت میں "ہیلو" کہا تھا.... اُسی کھڑکی کے نیچے ایک ٹریول ایجنٹ کا بورڈ تھا.... "دیوتاؤں کی سلطنت میں آپ جہاں جانا چاہتے ہیں ہم وہاں آپ کو پہنچا سکتے ہیں...." میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا "ڈو یو سپیک انگلش؟"

منحنی نیپالی ٹریول ایجنٹ نے میرے گندمی رنگ کو دیکھ کر کہا "آئی سپیک ہندی آلو"

"آئی سپیک اُردو...."

"فرام انڈیا؟"

"نو.... فرام پاکستان۔"

"پاکستان۔ کا لفظ کچھ دیر کے لئے ہر نیپالی کو سناٹے میں لے جاتا تھا.... وہ بھی کچھ دیر اس سناٹے کے سکوت میں گیا اور پھر ہوشیار ہو کر کہنے لگا۔ "ایک ہی بات ہے۔"

"نہیں۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔"

"سوری...." اُس نے "سوری" صرف اس لئے کہا کہ اُس نے کاروبار کرنا تھا ورنہ وہ اب بھی مجھے ایک ہی بات سمجھتا تھا "میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں اس شہر سے نکلنا چاہتا ہوں.... تو کس جانب نکلوں؟"

اُس نے پاکورہ، نگر کوٹ اور بھگتاپور کے نام لئے....

"اور اِن سے پرے...."

"اِن سے پرے تو چیتن نیشنل پارک ہے۔ صرف چند گھنٹوں کا سفر ہے.... آپ کا قیام نہایت آرام دہ گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں ہوگا.... اگلی صبح آپ ہاتھیوں کو جھیل میں نہاتے ہوئے دیکھیں گے.... پھر آپ ہاتھیوں پر سوار ہو کر چیتن پارک کے قدِ آدم سرکنڈوں میں سفر کرتے سفید گینڈوں کو دیکھیں گے...."

"تقریباً کتنے گینڈے؟"

"جی سر...." وہ منحنی نیپالی شاید اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔

"سفید گینڈوں کی تعداد کتنی ہوگی؟"

"آپ کتنے گینڈے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"کم از کم درجن بھر گینڈے تو ہوں.... میں ایک مشہور شخص ہوں میرے لئے چار گینڈے کافی نہیں ہوں گے...."

"ہم اپنی بہترین کوشش کریں گے سر.... کل سویرے ہماری لگژری کوچ بسنت چوک سے روانہ ہوگی۔ آپ آجائیں۔ دو روز کے قیام اور سفر کے اخراجات‘ ہا کی سواری اور سفید گینڈوں کے لئے صرف چالیس ڈالر...."

واقعی صرف چالیس ڈالر میں اگر ایک ہی سفید گینڈا دیکھنے کو مل جائے تو یہ مہنگا نہ تھا.... "اور ایورسٹ؟"

"ایک گھنٹے کا ہوائی سفر بدھا ایئر لائن پر.... پھر چار روز کا ٹریک ایورسٹ دامن تک.... اور ان دنوں آپ کے بدن کو جوکیں بھی نہیں چمٹیں گی اور آپ کا نہیں پئیں گی کیونکہ ابھی برسات کا موسم نہیں ہے...."

"میرا خیال ہے کہ میں جوکوں کو مائنڈ نہیں کروں گا.... بے شک میری ٹانگوں چمٹ جائیں.... میں اُنہیں مائنڈ نہیں کروں گا...."

منحنی نیپالی نے حیرت کی اداکاری کی....

نصف صدی گزر چکی ہے۔

جب میری ستواں ناک‘ باریک ہونٹوں والی‘ دودھیا سفید رنگت والی‘ عمر ساتھ سکڑتی ہوئی.... روزانہ خود نلکا گیڑ کر نہا کر اپنے سفید بالوں میں سرسوں کا تیل لگا نہایت ستھری اور شفاف نانی جان کچے کوٹھے کے صحن میں دھریک کے درخت کے ایک چارپائی پر بیٹھی بال سنوارتی تھیں تو گلی میں سے.... کسی گرم دوپہر کی خاموشی ایک آواز آتی تھی....

"جوکاں.... لوا لو.... جوکاں...."

اور وہ مجھ سے کہتی تھیں "تتنی.... اس جوکاں والے بھائی کو بلا لو.... شاوا میرا سوہنا پتر" اور سوہنا پتر اپنی بے بے جی کو دھریک کے سائے میں چھوڑ کر گلی میں اور ڈڑکی لگاتا ہوا جوکاں والے بھائی کو مسجد کے قریب جا مخاطب کرتا.... سانس چڑھا

اور "بھائی تیرے پاس جوکیں ہیں؟"

"آہو۔" وہ کہتا.... اور وہ ایک عجیب پُراسرار سپیرا سا شخص ہوتا جس کی پگڑی اُس کی آنکھوں پر آئی ہوتی اور آنکھوں کے فوراً بعد اُس کی مونچھیں شروع ہو جاتیں‘ اور پگڑی پر ایک کپّا کُپّا سا اُٹھایا ہوتا جس کے گلے کو ایک ٹائی سے باندھا ہوتا جیسے مفلر باندھتے ہیں....

"تو آجا میرے بے بے جی تجھے بلاتے ہیں.... وہ دھریک والے نمبرداروں کے گھر میں...."

"اچھا...." وہ دیر تک سر ہلاتا اور اس کے ساتھ اُس کی پگڑی اور پگڑی پر براجمان کُپّا بھی ہلتا اور کُپّے کا مفلر ہوا میں لہراتا.... "نمبرداروں کے گھر سے آئے ہو ناں.... میں پہلے بھی چودھرانی کو جوکیں لگا چکا ہوں۔"

میرے بے بے جی کو سردیوں میں ہمیشہ پنڈلیوں پر بے پناہ خارش ہوتی اور وہ دھوپ میں بیٹھی اُن پر سرسوں کا تیل لگا کر اُن پر مالش کرتی رہتیں اور کبھی بے بس ہو کر اُنہیں اتنا کھجلاتیں کہ خون کی خراشیں نمودار ہو جاتیں.... حکیم کہتے تھے یہ چنبل ہے اور لاعلاج ہے۔

جوکاں والا بھائی دھریک والے ویہڑے میں داخل ہوتا تو نظریں جھکا کر کہتا "چودھرانی مکھن کا پیڑہ لے آؤ پورے کا پورا"

میری بڈھی نانی اماں خالی چاٹی میں سٹور شدہ مکھن نکال لاتیں اور پھر خود ہی اپنی پنڈلیوں پر اُس کا لیپ کرتیں‘ اس دوران وہ بھائی کُپّے کا منہ کھول کر اُس کا مفلر اُتار کر اُس میں ہاتھ ڈالتا اور ایک ربڑ نما لجلجی سی شے برآمد کر کے اُسے ایک سکاچ ٹیپ کی طرح کھینچ کر سیدھا کرتا اور بے بے جی کی پنڈلی پر چسپاں کر دیتا.... پھر ایک اور.... یہاں تک کہ بے بے جی کی پنڈلی پر تقریباً درجن بھر جوکیں چپک جاتیں....

وہ بھائی پوچھتا "بی بی حقہ ہے؟" بے بے جی کہتیں "اس گھر میں تو کوئی نہیں پیتا‘ ساتھ والے گھر میں بھائی جہان خان کے پاس ہے لیکن وہ کسی کو اپنے حقے کو منہ لگانے نہیں دیتا۔ تم جا کر کہنا بہن فاطمہ نے بھیجا ہے۔"

بھائی چلا جاتا.... اب میں ہوتا۔ بے بے جی کی پنڈلی پر چپکی جوکیں ہوتیں
سردیوں کی دھوپ ہوتی۔

آہستہ آہستہ وہ جوکیں خون چوس چوس کر پھولنے لگتیں۔ پھر پھول کر گر جاتیں اور آخر اُن کی دُموں میں سے خون رسنے لگتا.... بھائی حقے کا کش لگا کر واپس پھولی ہوئی جوکوں کو نہایت محبت سے دیکھتا اور کہتا "چودھرانی سارا گندا خون ... ہے.... اور اس کے ساتھ چنبل خارش بھی...." پھر وہ اپنی جوکوں کو احتیاط سے اُٹھا اُنہیں تھوڑا سا نچوڑتا اور اپنے کُجّے میں رکھ کر اُس کے گلے میں مفلر باندھ د... بے بے جی پچھلی کوٹھڑی کے کچے بھڑولے میں سے دو ٹوپے کنک نکال کر اُس کی ... ہوئی چادر میں اُنڈیل دیتیں اور وہ اُسے سمیٹ کر گٹھا سر پر رکھ کر خوشی خوشی چلا جا... فاسد خون اور مادے کے اخراج کا یہ ایک آسان اور بلا تکلیف نسخہ تھا.... بے بے ... پوری سردیاں پھر کھجلی کرنے اور سرسوں کے تیل کی مالش کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔

ان دنوں جب بے بے جی کو گذرے ہوئے صدیاں گزر چکیں.... موسم سرما ... آغاز میں میری پنڈلیوں پر بھی ہلکی خارش ہوتی ہے.... شاید یہ جینز کا تسلسل ہے.... جو... والے بھائیے کب کے پنجاب کی ثقافت سے معدوم ہو چکے.... جو کالیاں کے ایک چھپڑ سے گزرتے ہوئے بچپن میں ایک بار میری ٹانگوں کے ساتھ بھی جوکیں چمٹی تھیں.... صرف ایک ہلکی سی جلون تھی اور پتہ تب چلا جب سفید کھیس پر میرا خون رسنے لگا.... اب یہ منحنی نیپالی مجھے جوکوں سے ڈراتا تھا۔ بلکہ مجھے برسات کے دنوں میں ہی نیپال ... چاہئے تھا تاکہ میں اس کے جنگلوں میں پائی جانے والی جوکوں کو اپنی پنڈلیوں پر چپکا... کر کے اپنی خارش سے نجات حاصل کر سکتا....

نصف صدی گزر چکی تھی جب میرے بے بے جی نے مجھے بھائی جوکاں والے ... بلانے کے لئے بھیجا تھا....

منحنی نیپالی نے حیرت کی اداکاری کی تھی جب میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں جو... کو مائنڈ نہیں کروں گا....

"بہرحال.... کیا آپ مجھے کسی گروپ کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتے ہیں؟ جو ایورسٹ کے بیس کیمپ تک جا رہا ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں.... پرسوں ہمارا ایک کورین گروپ روانہ ہو رہا ہے.... آپ اُن کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں.... کل اخراجات.... اتنے ڈالر ہوں گے...."

میری جیب میں اس سے کہیں زیادہ ڈالر تھے....

ڈالر کوئی پرابلم نہ تھے.... لیکن میں پرابلم تھا.... میری عمر پرابلم تھی۔

میں عمر کے اُس حصے میں تھا جب گھر سے دور ہوٹل کے کسی کمرے میں تنہا سوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے.... رات کو کہیں کچھ ہو نہ جائے.... کابل کے اُس ہوٹل کی طرح جہاں ایک ہپی مر گیا تھا اور اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک اجنبی سرزمین کی انجانی تاریک وادیوں میں تنہا داخل ہوتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ساتھی کیسے ہوں گے.... یہ کورین کون ہوتے ہیں اور کونسی زبان بولتے ہیں.... میں اُن کا ساتھ دے سکوں گا یا نہیں.... غیر دوست بلندیوں پر اُن سے پیچھے رہ جاؤں گا تو وہ میرا انتظار تو نہیں کریں گے.... خوراک کیسی ہوگی.... رات کیسی ہوگی.... اور وطن سے دُور اگر بیمار پڑ جاؤں تو تیمارداری کون کرے گا....

اُس کھڑکی میں.... جس میں ایک سنہری بالوں والی حسینہ کا خمار زدہ چہرہ جھانکتا تھا اب کوئی نہ تھا.... دھوکا دربار کے ہنومان جی سورج کی تپش سے کچھ مرجھا چکے تھے اور اُن کی لازم میں وہ دَم خم نہ تھا.... جگن ناتھ مندر کے وہ اشتعال انگیز مجسمے جو سرِ شام گذشتہ زندگی کی پرچھائیاں لگتے تھے اب کڑی دھوپ میں مضحکہ خیز لگتے تھے۔

یہاں تک کہ کماری کے مندر کا دروازہ بھی مقفل تھا....

میرے اندر یہ خدشہ مسلسل تھا.... بلکہ یقین تھا کہ میں ایورسٹ کے بیس کیمپ تک نہیں جا سکوں گا.... لیکن میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا تھا کہ میں ارتقاء کی اُس منزل پر رُک گیا تھا جس کے آگے حقیقت کی سلطنت تھی.... میں نے حقیقت کی سلطنت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے "سوری میں ایورسٹ تک نہیں جا سکتا.... ممکن نہیں ہو گا.... کچھ اور کام ہیں جو ایورسٹ سے زیادہ ضروری ہیں۔"

میں نے منحنی نیپالی ٹریول ایجنٹ کے چہرے پر مایوسی کی جھلک کا آغاز دیکھا اور ایجنسی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

باہر ایک اور تھاپا ٹیکسی ڈرائیور تھا جو مجھے واپس ہوٹل سولتی ہالیڈے اِن لے گیا۔

کانفرنس ہال میں مندوبین نہایت گرم جوشی سے بحث کر رہے تھے کہ ب
بروشر تین صفحوں کا ہونا چاہئے یا چار صفحوں کا....

اگرچہ میں اس نیپا کردار کی برکت سے نیپال میں تھا لیکن اُس کی وجہ
کانفرنس ہال کی قید میں بھی تھا اور دُنیا کے بلند ترین مقام کے دامن کو چھونے کی آر
خاک کرتا تھا۔

میں اپنے سامنے رکھے آفیشل پیڈ پر حسب معمول طوطے چڑیاں بناتا ر
اُونگھتا رہا....

سُنہری بابا نے میری دل گرفتگی اور بجھے ہوئے چراغِ تمنا کے دھوئیں کو م
کیا اور مجھے تسلی دی "تارڑ صاحب رنجیدہ ہونے کا مقام نہیں ہے.... میں آج کی
آپ کو وشال مرگ لے کر جاؤں گا.... آپ خوشی سے نڈھال ہو جائیں گے"

"کیا یہ وشال مرگ.... مرگ ناگہانی قسم کی چیز ہے"

"یہ کھٹمنڈو کا جدید ترین ایریا ہے.... آپ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے.

"دھوکا دربار کے آس پاس ہے؟"

"نہیں جی.... اُن مندروں اور بھگوانوں سے پرے ایک ایسا زبردست علاقہ
کہ.... آپ دنگ رہ جائیں گے...."

چنانچہ میں نے سیمینار کی پُوری دوپہر.... اِس آس میں گزاری کہ شام کو
دنگ رہ جاؤں گا.... بالآخر شام ہوئی.... کانفرنس کے قیدی آزاد ہوئے اور نڈھال
اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے فریم میں وادیٔ کھٹمنڈو
تصویر جڑی تھی اُس میں ابھی تک کہیں کہیں دُھند تھی اور ایورسٹ تک پہنچنے کے
کے شیشے کی کرچیاں اُس دھند کی سفیدی میں مرتے ہوئے جگنوؤں کی طرح روشن
تھیں، ایک ایک کر کے بجھتی جاتی تھیں....

ان میں سے ہر کرچی ایک اُمید تھی جو بجھتی جاتی تھی۔

میں نے اپنے جاگرز پہنے۔ وہ ٹریک سوٹ پہنا جو میں ایورسٹ کے ٹریک
لئے خصوصی طور پر خرید کر لایا تھا اور اپنے آپ کو باتھ روم کے اُن آئینوں میں د

قد آدم تھے۔

گئے وقت ایسے بھی تھے جب یہ آئینے حیرت سے ہمیں دیکھتے تھے اور ہم دیکھتے
تھے کہ کونسا زاویۂ بدن ایسا ہے جس میں دل ربائی نہیں.... اور ایک بھی زاویہ ایسا نہ ہوتا
تھا اور اب ان وقتوں میں ہم آئینوں کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور اُنہیں کہتے ہیں کہ اے
آئینے تو جھوٹ بولتا ہے.... یہ جو ڈھلتے ہوئے بدن کا عجیب بے ڈھنگا اور بوڑھا شخص ہے
اس کا کوئی زاویۂ بدن ایسا نہیں جسے ایک بار دل پہ پتھر رکھ کر دیکھنے کے بعد دُوسری بار
دیکھنے کی تمنا کی جا سکے.... یہ میں تو ہرگز نہیں ہوں.... ٹریک سُوٹ کے ٹراؤزر بمشکل میرے
واپے پر ٹھہرتے تھے اور جیکٹ کی زِپ بے سروپا سراپے کو ڈھکنے سے انکاری ہو کر
الجھتی جاتی تھی.... یہ میں تو نہیں تھا۔

ایک زمانے میں ہم قد آدم آئینوں میں اپنے آپ کو ٹھہر کے دیکھتے تھے اور اب
آنکھ چُرا کر چپکے سے نکل جاتے تھے.... ہم جب خوش شکل تھے تو نرگسیت پسند ہونے
کے طعنوں کے باوجود کہتے تھے کہ ہاں ہم خوش شکل ہیں، اور اب اگر بدشکل ہو چکے ہیں تو
اس کا اقرار کرتے ہیں....

بدن کی اس شکستگی اور عمر کے موہنجوڈارو کھنڈر کے باوجود.... دل کو خبر تک نہیں
دل.... دِل گویا ہر انسان کے اندر جو ایک فریب ہے جو ایک بستی ہے اُسے خبر نہیں ہوتی
کہ باہر زمانے بدل گئے ہیں.... سکّہ تبدیل ہو چکا ہے.... اور اُس فریب اور بستی میں وقت
ٹھہرا رہتا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلتا.... وہاں ابھی تک یہی یقین ہے کہ فنا آئے گی تو مجھے
نہیں آئے گی ہر ایک کو اِس جہانِ فانی میں آئے گی مگر مجھے نہیں آئے گی.... وہ اُنہی
موسموں میں رہتا ہے جب ہر بطخ راج ہنس نظر آتی ہے اور ہر درخت اب بھی سرسبز نظر
آتا ہے.... اور اسی لئے اب بھی عمر کے اس زوال میں جب اختتام نزدیک آ جاتا ہے اور
آغاز بہت دور رہ جاتا ہے جب وہ کسی بھی راج ہنس کو دیکھتا ہے تو بدن کی شکستگی آڑے
نہیں آتی.... آرزو اور اشتیاق ہر درخت کو سرسبز دیکھتے ہیں اور اُن کی تمنا کرتے ہیں....

راج ہنسوں کی بھی، اور سرسبز درختوں کی بھی۔

چنانچہ میں نے قد آدم آئینے میں جو کچھ نظر آ رہا تھا اُس پر لعنت بھیجی اور عمر
کے کھنڈر سے نظریں چُرا کر اُس بستی کا باسی بن گیا جس میں وقت، ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اُس لمحے سُنہری بابا نے اپنے باتھ روم کے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر کیا پوچھا۔

فاروق کو کیا خیال آیا۔

اور ہمشیرہ صاحبہ کے بارے میں اس قسم کی انتہائی لغو بات سوچنا ہی گستاخی؛ لیکن گمشدہ سرگوشی نے یقیناً آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ہو گا آئینے اے آئینے میرے سندھی لباس کو نظر نہ لگا' صرف یہ بتا کہ کھٹمنڈو کی بہترین شاپنگ کہاں ہے؟....

"اناپورنا کے پجاری... بُدھ کے بیوپاری اور کھٹمنڈو کی گلیاں"

میں نے اپنے آپ کو جوگرز اور ٹریک سُوٹ کے فریب سے آزاد کیا اور ایک بین الاقوامی کانفرنس کے معزز مندوب کی طرح ایک باقاعدہ لباس پہنا اور کمرے سے نکل کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آگیا۔ قد آدم آئینوں نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا....

صادقین نے "نکلے تیری تلاش میں" کو مصور کرتے ہوئے مُجھے ایک رباعی لکھ کر دی تھی کہ اِن آئینوں میں کون ہے.... بس تُو ہی تُو ہے.... تو لابی کے اِن قد آدم کمینے آئینوں میں بس میں ہی میں تھا اور ایسا تھا جیسے گندم کی ایک اوور ویٹ بوری کو جین اور ٹی شرٹ پہنا دی جائے.... یہاں بھی ان جھوٹے اور مکار آئینوں پر میں نے اعتبار نہ کیا اور اُسی بستی پر اعتبار کیا جس میں وقت ٹھہرا ہوا تھا.... اور میں جھیل جنیوا کے کنارے' اُس کے جیٹ فوارے کی قربت میں ایک سوس سمر کی نرم دھوپ میں صرف ایک نیلی جین میں جیبوں میں ہاتھ اُڑسے کھڑا تھا اور میرا پیٹ یقیناً کسی بھی سنوٹائیگر کی نسبت جو وادی سوختر آباد میں کسی آبشار کی پھوار میں بھیگتی گھاس میں لوٹنیاں لگاتا تھا' زیادہ ہموار تھا.... بلکہ اُس نیپالی شرما حسینہ کے پیٹ سے کہیں زیادہ کسا ہوا تھا جس کی ننگی کمر کو اہل دانش حسرت ویاس سے تکتے تھے....

پیٹ سے مُجھے یاد آیا کہ اپنی ملکۂ ترنم نور جہاں ایک زمانے میں اپنے ہر گانے کا زمانہ پیٹ کے حوالے سے یاد رکھتی تھیں۔ مثلاً....

"جب میں نے 'آواز دے کہاں ہے.... گایا تھا تو اکبر میرے پیٹ میں تھا۔"

"منڈیا سیالکوٹیا.... گایا تو ماشاء اللہ اصغر میرے پیٹ میں تھا...."

"اور جب میں نے 'دل کا دیا جلایا میں نے.... گایا تھا تو ظلِ ہُما...."

اس پر بابا چشتی نے اپنا گنجِ گراں مایہ کھجا کر پُوچھا تھا اور صرف وہی پوچھ سکتے تھے کہ "میڈم کبھی آپ نے خالی پیٹ بھی گایا ہے؟"

ہوٹل سولتی کے لاؤنج میں بالائی منزلوں سے اُترتی لفٹوں کے منہ حیرت زدہ دریائی گھوڑوں کی طرح کھلتے گئے اور ان میں سے میرے ساتھی برآمد ہونے لگے۔

سب سے اوّل اوّل سُنہری بابا برآمد ہوئے.... اور سیدھے آئینوں کی جانب بڑھ گئے.... اُنہیں ہاؤ ڈو یُو ڈو کہا.... اور پھر اُن میں اپنی شبیہہ مبارک پہچان کر پشیمان ہو اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری جانب آ گئے۔

ملک برآمد ہوئے.... قدرے فکر مند' کچھ لاتعلق.... ایک ایسے روٹھے ہوئے بچے کی طرح جسے آئس کریم نہیں ملی تھی۔

کچھ لمحوں بعد ایک اور لفٹ نیچے آئی اُس کا منہ بھی حیرت زدہ دریائی گھوڑے کی مانند وا ہوا اور اُس میں سے گمشدہ برآمد ہو گئیں' ایک ڈیشنگ ڈریس اور اُس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی لپ سٹک میں....

سب سے آخر میں ہمشیرہ صاحبہ کا ورود ہوا.... براہ راست آئینوں تک چلتی گئیں اُنہیں دیکھ کر تادیر مسکراتی رہیں اور پھر یکدم سنجیدہ ہو کر اپنے بیگ میں سے ایک اور عینک نکالی جو بقول اُن کے زیادہ فیشن ایبل تھی.... اور کانفرنس اٹینڈ کرنے والی دقیانوسی عینک اُتار کر اُسے پہن لیا اور قدرے خوشنما سی ہو گئیں' "ہم نے ابھی تک دھوکا دربار متعدد بار دھوکا کھایا ہے جب کہ کھٹمنڈو میں پتن بھی ہے۔" اُنہوں نے اعلان کیا۔

"لنگھ آ جا پتن چنہاں دا او یار.... والا پتن...." فاروق جانے اپنے کمرے میں کیا کچھ پی کے آیا تھا۔

"نہیں بھئی.... نیپال بھر میں کوئی سوہنی ایسی سوہنی نہیں ہے جس کے لیے دریائے چناب پار کرنے کا خطرہ مول لیا جا سکے.... یہ پتن ایک اور ٹمپل کامپلیکس ہے"

ہم سمجھتے تھے کہ یہ کامپلیکس وغیرہ صرف سگمنڈ فرائڈ کے ہاں ہی پائے جاتے ہیں؟

اور ایڈیپس کامپلیکس کے بعد کسی اور نئے کامپلیکس کی گنجائش نہیں لیکن کھٹمنڈو میں آ کر تو ہم پتہ نہیں کن کن ہنومان کامپلیکس اور کماری کامپلیکس میں مبتلا ہو گئے تھے "نہ جی مزید مندر اور مزید بندر ہم نہیں دیکھیں گے.... صرف وشال مرگ.... آج کی شب...."

"اور آج کی شام بلکہ آج کی شب سازِ دلِ پُر درد نہ چھیڑ.... آج کی شب...." فاروق یقیناً ایک بلند موڈ میں تھا....

"فاروق آپ سازِ دلِ پُردرد کی دُھن پر جب آپ وشال بازار دیکھئے گا تو دنگ رہ جائیے گا کھٹمنڈو کا جدید ترین شاپنگ ایریا...." سُنہری بابا نے ایک معزز گوریلے کی طرح اپنے سینے پر ہلکا سا مکا مار کر کہا۔

"شاپنگ ایریا۔" گمشدہ ایسے بیدار ہوئیں جیسے اصحاب کہف صدیوں کی نیند کے بعد یکدم بیدار ہوئے تھے "وہیں چلتے ہیں تارڑ صاحب۔--۔"

اور گمشدہ جس نیند بھرے انداز میں "وہیں چلتے ہیں" کہتی تھیں تو جی چاہتا تھا کہ بس وہیں چلتے ہیں۔

"آپ راستہ تو جانتے ہیں ناں سُنہری بابا؟"

"مجھے پوچھ رہے ہیں کہ راستہ جانتے ہیں.... منہ زبانی یاد ہے جناب۔ اب آپ میرے پیچھے پیچھے چلتے آئیں میں آپ کو وشال بازار لے چلوں گا...."

"کہیں یہ دھوکا دربار کے قریب تو نہیں...." ہمشیرہ نے ایک مرتبہ پھر تشویش کا اظہار کیا۔

"کہاں دھوکا دربار اور کہاں وشال مرگ.... آپ کیا بات کرتی ہیں ہمشیرہ.... بس چلے آئیے"

جب ہم سب ایک معزز ریوڑ کی صورت میں ہوٹل کی لابی سے باہر آئے اور ہمیں گورکھا دربان نے بیسویں مرتبہ "نمستے" کہا تو ایک مرتبہ پھر ہمیں بہت رنج ہوا۔ بہت قلق ہوا کہ ہم بیوقوف ناقص عقل کے ہوموسیپین اس ہوٹل سولتی کے اندر کیا کر رہے تھے.... کیونکہ باہر جو ہوا تھی وہ یقیناً ایورسٹ اور اناپورنا سے لپٹ لپٹ کر آئی تھی اور اُس میں وہی برفانی کنوار پن تھا.... وہی عیسیٰ تھا جو عمر کے مُردہ کھنڈروں کو ایک پھونک سے زندہ کر دینے پر قادر تھا۔

باہر چرمی صوفوں پر دو تین سردار صاحبان دھرے تھے.... اس لئے کہ
خمارِ شب میں مبتلا وہاں بیٹھ تو گئے تھے اور ٹھنڈی ہوا لگنے سے مزید مسرور ہونے کے
باعث اُٹھنے سے اُٹھتے نہ تھے.... اور میں.... اپنی سردار سائیکی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کی
جانب لپکنے کو تھا کہ گمشدہ نے کہا "تارڑ صاحب.... آج کی شب سرداروں کو رہنے دیجئے
سردار بہت ہو گئے ہیں"

جیسے ایک محفل میں فریدہ خانم نے دخترِ اقبال منیرہ کی موجودگی کو باعثِ افتخار جانا
اور یکے بعد دیگرے نہایت خوبصورتی سے پلّو ڈھلکاتی اور پھر اُسے سنبھالتی کلامِ اقبال گاتی
چلی گئیں۔ عرصہ ذرا طویل ہوا تو منیرہ نے فریدہ سے کہا "فریدہ جی.... ابا جی بہت ہو گئے
ہیں، ہُن تُسی جتّی قصوری آوے نہ پُوری ہائے ربّا مینوں چلناں پیا.... سنا دیو"

چرمی صوفوں والے اوپن ایئر لاؤنج سے اُتر کر ہم اُس راہ پر ہوئے جہاں سُنہری
زیورات اور ہیروں کی چمک دمک والی دوکانیں تھیں اور ان کے راستے میں میرے تین
دوست کھڑے تھے....

اُن کے بدن گلابی اور سُرخ شگوفوں سے بھرے ہوئے تھے.... جیسے ایک زرد
بدن پر شہوت کے شگوفے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے برفوں پر پنک لپ سٹک کے نشان
ہوں.... جیسے ایک سفید سلک شرٹ بوسوں سے بچ نہ سکی ہو....

اور جونہی میں اُن کے سائے میں ہوا شاید ایک پنک شگوفہ میرے قدموں میں
گرا.... اُس کی لپ سٹک کا نشان فٹ پاتھ پر ثبت ہو گیا.... میں اُسے روند تو نہیں سکتا تھا
اس لئے اُس سے ذرا ہٹ کر نکل گیا۔

"بس آپ لوگ آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں.... میں آپ کو
وشال مرگ لے چلوں گا"

سُنہری بابا نے ایک ایسے پیگ پائپر کی طرح کہا جس کی دُھن پر چوہے کھنچے چلے
آتے ہیں، اُس کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں اور راہیِ ملکِ عدم ہوتے ہیں۔

"ویسے ضیاء صاحب مائنڈ نہ کیجئے گا اگر میں ایک عرض کروں۔" فاروق نے
عرض کیا۔

"جی فرمائیے۔"

"آپ میرے بزرگ ہیں.... بلکہ بزرگ تو نہیں کیونکہ میرے بزرگوں میں سے
کسی کی بھی داڑھی سُنہری نہیں تھی۔ بہرحال آپ میرے سینئر ہیں لیکن آپ کے پیچھے
پیچھے آنے میں کچھ تاریخی خدشات ہیں...."

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ آج تک جس ضیاء نے بھی ہم سے راہبری قبول کروائی ہے اُس
نے ہمیں کسی نہ کسی آفت میں ہی مبتلا کیا ہے۔"

"ہم اور قسم کے ضیاء ہیں۔" سُنہری بابا نے ذرا ناراضگی سے کہا۔

ہوٹل کی سٹیٹ سے باہر آ کر ہم نے حسبِ معمول دو ٹیکسیاں مول تول کر کے
حاصل کیں اور روانہ ہو گئے۔

ضیاء، ملک صاحب اور گمشدہ ہمارے پیچھے پیچھے ہارن بجاتے چلے آ رہے تھے اور
فاروق اور ہمشیرہ اُن کی ہدایات کے مطابق آگے آگے چلے جاتے تھے۔

کھٹمنڈو کی شام میں.... بھاگ متی اور وشنومتی دریاؤں کے پار ہم ایک اور قسم
کے ضیاء کی سربراہی میں اپنے تئیں منزل کو سفر کرتے تھے۔

جب ہماری ٹیکسی نے ایک پُل عبور کر کے جدید شہر سے منہ موڑا اور ایک
ڈھلوان پر ہونکتی ہوئی چڑھ کر کھٹمنڈو کی تنگ اور قدیم گلیوں میں مسلسل ہارن بجا کر اپنی
راہ اور ہٹو بچو ہٹو بچو کی پکار کی تو ہمشیرہ اپنی ٹرانس سے باہر آ گئیں "تارڑ صاحب.... یہ تو
ہمارا راستہ ہے"

"کونسا راستہ وہی ہے؟"

"جو دھوکا دربار کو جاتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی ایک سونڈھ والے بھگوان کو دیکھا
جسے ہم نے پرسوں بھی دیکھا تھا۔"

"بھگوان طرح طرح کی قسموں کے ہوتے ہیں ہمشیرہ.... ہو سکتا ہے اس بھگوان
کی سونڈھ اتنی لمبی نہ ہو جس بھگوان کی سونڈھ آپ نے پرسوں ملاحظہ کی تھی...."

"ابھی ابھی ایک ہولناک دیوی بھی گزری ہے جس کی چرنوں میں دیئے جلتے
تھے"

"کتنے دیئے جلتے تھے؟"

"پتہ نہیں آٹھ دس تو ہوں گے۔"

"تو پھر یہ دیوی بھی کوئی اور دیوی ہو گی...."

"مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے پرسوں بھی دیکھا تھا...."

"دیئوں کی تعداد میں یقیناً کمی بیشی ہوگی۔ ہر دیوی کے چرنوں اور ہر ولی ا قبر پر جلنے والے چراغوں کی تعداد اُن کے مرتبے کے مطابق نہیں ہوتی.... جس شہر ہیں اُس کے باسیوں کے گناہوں اور دولت کے مطابق ہوتی ہے.... اگر داتا صاحب کی بجائے چولستان کے صحرا میں کہیں دفن ہوتے تو اُن کے مزار کے گرد کروڑوں رو کا کمپلیکس تعمیر نہ ہوتا...."

"لیکن یہ وہی دیوی تھی جو میں نے پرسوں دیکھی تھی۔"

"ہمشیرہ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ دیوی دیوتاؤں کے بھی TWINS ہیں۔ اگر ضیاء صاحب نے وچن دیا ہے کہ ہم کسی مقام وشال مرگ کو جا رہے ہیں دھوکا دربار سے کہیں دُوری پر ایک مقام ہے تو آپ کیوں یقین نہیں کر لیتیں...."

"ضیاء جو بھی وچن دیتے ہیں اُس سے مکر جاتے ہیں.... چاہے وہ نوّے د اندر اندر انتخابات کا ہو یا وشال مرگ کا ہو۔"

تب اُس لمحے ٹیکسی پُرانے گھروں کی حیرت انگیز کھدائی والے بیل بوٹو پھول پتّوں والی کڑھائی کی کھڑکیوں تلے اس شب کی تازگی میں سانس لینے کے لئے نیپالی خواتین' مخدوش ٹورسٹ ہوٹلوں اور متعدد اوپن ایئر روشن صنم خانوں کو چھو نکلی تو مجھے بھی ذرا سا شک ہوا کہ یہ سب میرے دیکھے بھالے ہیں اور میں اس ر پہلے بھی آچکا ہوں۔

"بھئی میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ وہی راستہ ہے دھوکا دربار والا.... میں نے کر دیکھ لیا ہے" ہمشیرہ نے باقاعدہ شور مچا دیا۔

"آپ پلیز خاموش ہو جائیں ہمشیرہ" میں نے اُنہیں سختی سے ڈانٹا" را ہو سکتا ہے لیکن ہم بالآخر وہیں نکلیں گے جو ہماری منزل ہے.... کیا آپ کبھی ل ہیرا منڈی گئی ہیں؟"

"یہ کونسی منڈی ہے؟"

"یہ حُسن کی منڈی ہے.... عرف عام میں بازار حُسن ہے اور جاہل لوگ اِسے چکلا کہتے ہیں"

"لاحول ولا...." ہمشیرہ سخت خفا ہو گئیں....

"تو وہاں جانے کے لئے بھی مختلف راستے ہیں.... جو سب کے سب ایک سے لگتے ہیں.... ٹبی بازار کی جانب سے' نو گزے کی قبر کے پہلو میں جہاں تین سو تیرہ خاکساروں کے خُون کے چھینٹے اور اُن کی کدالوں کی گونج اب بھی موجود ہے۔ یا سُنہری مسجد سے بائیں جانب جہاں ایک ایسا بازار ہے جہاں پہلے طبلے اور ستار بنتے تھے اب ڈرم اور گٹار بنتے ہیں.... تو راستے بے شمار ہوتے ہیں لیکن ہمیں ایک سے لگتے ہیں.... اس لئے ہمشیرہ آپ فی الحال چُپ رہیں پلیز...."

اور ہمشیرہ چُپ ہو گئیں بلکہ دم سادھ لیا۔

لیکن جب ٹیکسی بالآخر رُکی تو وہی چوک تھا.... نیو روڈ کا.... روشن اور کھٹمنڈو کی رات میں جگمگاتا اُسے چکاچوند کرتا' جہاں ہم پہلی شب اُترے تھے۔

اور اُس کے بائیں جانب دھوکا دربار کا کمپلیکس تھا....

"اب آپ کیا کہتے ہیں تارڑ صاحب۔۔" ہمشیرہ نے فتح مندی کے احساس میں ڈوب کر مجھے مطعون کیا۔

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اور ضیاء پر ہم نے دوبارہ بھروسا کیا تو یہ لکھا گیا تھا کہ ہم ایک اور دھوکے میں مبتلا ہوں گے.... مومن اگر ایک سوراخ سے' دوبارہ ڈسا جاتا ہے تو یہ مومن کی بیوقوفی ہے"

"آپ اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں.... اگر ہم کسی بے نظیر قیادت پر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا دھوکا نہیں ہوتا...."

"نہیں.... کیونکہ یہ ایک ضیاء نہیں.... ایک بے نظیر دھوکا ہوتا ہے...."

اتنی دیر میں ضیاء صاحب کی ٹیکسی بھی پہنچ گئی وہ باہر آئے اور داڑھی پر ایک دھمکی آمیز ہاتھ پھیر کر بولے.... "آیئے حضرات۔"

"ہم صرف حضرات نہیں ہیں...." خالدہ گمشدہ نے ایک سرگوشی احتجاج کیا۔ "خواتین بھی ہیں.... ہر ضیاء یہ بھول جاتا ہے کہ خواتین بھی ہیں۔"

"بلکہ ماہ رمضان میں سحری کے وقت لاؤڈ سپیکرز پر اعلان کرتے مولوی حضرات
بھی خواتین کو بھول جاتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ حضرات اُٹھیے' سحری کی
تیاری کیجیے۔ کھانا تیار کیجیے.... روزہ شروع ہونے میں اتنے منٹ رہ گئے ہیں.... اگرچہ بر
صرف خواتین ہوتی ہیں جو بیدار ہو کر پراٹھے پکاتی ہیں اور خوراک کا اہتمام کرتی ہیں۔
اور اِسی طور افطار کی قربت میں جو اعلان ہوتے ہیں اُن میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ
حضرات روزہ افطار ہونے میں اِتنے منٹ رہ گئے ہیں افطار کی تیاری کیجیے۔ اور اُس وقت
حضرات تو نقاہت کے عالم میں کسی صوفے پر ڈھیر ہوتے ہیں اور خواتین کچن میں پکوڑے
تل رہی ہوتی ہیں.... چنانچہ خواتین کا حوالہ ایک شجر ممنوعہ ہے.... میں نے ایک مولوی
صاحب سے جو اِن دنوں علما اور شیوخ کے مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں پوچھا کہ آپ روزے
کے اعلان میں صرف حضرات ہی کو کیوں مخاطب کرتے ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا۔
"اس لئے کہ وہ نامحرم ہیں.... اور ہم نہیں جانتے کہ وہ کس حالت میں ہیں' ناپاکی میں ہیں
یا پاکیزگی کی حالت میں ہیں تو.... منبر سے صرف مردوں کو ہی مخاطب کیا جاسکتا ہے"۔
اور جب خالدہ سرگوشی نے احتجاج کیا کہ ہر ضیاء بھول جاتا ہے کہ خواتین بھی
ہیں تو ہمارے ضیاء نے فوری طور پر اعتراف کرلیا کہ سوری نہ صرف حضرات بلکہ
خواتین.... ہم اب وشال مرگ چلتے ہیں....
"ٹھہریئے ضیاء صاحب۔" ہمشیرہ جیسے تلوار سونت کر میدان میں آگئیں" یہ آپ
نے ہمیں کہاں لاکھڑا کیا ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گذرے تھے ہم جہاں سے.... بائیں جانب
دھوکا دربار کے ہنومان جی دکھائی نہیں دے رہے کیا.... اور آپ کہتے تھے وشال مرگ
بالکل کسی اور سمت میں ہے اور مختلف جگہ ہے۔"
"ہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔" ضیاء صاحب نے بالآخر اقرار کرلیا "دراصل میں
کافی برس پیشتر اِدھر آیا تھا چنانچہ جغرافیہ اِدھر اُدھر ہوگیا ہے۔"
"ہم پاکستانی جغرافیے کو اِدھر اُدھر کرنے کے ماہر ہیں جناب عالی.... آپ نے دیکھا
کہ کانفرنس میں بنگلہ دیش کا وفد جو ہمارے جغرافیے کا حصہ تھا وہ بھی ذرا اِدھر اُدھر ہوگیا
ہے اور ہم نے اِن کو اُدھر کرکے کہ اِدھر ہم اور اُدھر تم ایک نیا پاکستان بنا لیا تھا اور ابھی
پچھلے دنوں اُس پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کیسی ڈھٹائی اور نابینائی سے مناتے تھے.... اگرچہ

اس پاکستان کی چھبیسویں سالگرہ تھی۔"
"تارڑ صاحب۔" ملک نے اپنی ٹائی کی ڈھیلی ناٹ کو اُس کے نتھنوں سے دبا کر
ٹھیک کیا "آپ ہمیشہ تصویر کا تاریک رُخ ہی کیوں دیکھتے ہیں؟"
"اس لئے کہ میں ابھی اُس تاریک رُخ کی تاریکی میں ہوں۔"
"ویسے جہاں میں آپ کو لایا ہوں یہ بھی ایک اور رُخ ہے۔" ضیاء صاحب نے
اناؤنس کیا۔
"وہی رُخ ہے ضیاء صاحب...." ہمشیرہ نے پھر وار کیا" آپ ہمیں وہیں لے
آئے ہیں.... ذرا دیکھیے چوک کے پار وہی دوکان نہیں ہے جہاں سے تارڑ صاحب نے تیز
مرچوں والے آلو کے سموسے خریدے تھے' ہندوؤں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے...."
"بے شک وہی دوکان ہے۔ وہی نیو روڈ ہے اور میرا جغرافیہ اِدھر اُدھر ہوگیا
ہے میں اقرار کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں لیکن اس کے باوجود.... وشال مرگ اِدھر
ہی اُدھر ہے سڑک کے پار۔ ذرا سڑک کے پار چلتے ہیں۔"
وہاں سڑک کے پار ہوئے تو ایک پانچ منزلہ سپر سٹور تھا.... جس کے خودکار زینے
ٹک ٹک کرچلتے تھے اور اُن پر بدھ بھکشو اپنے کیسری لبادوں میں لپٹے اُن شوروموں کو تکتے
تھے جن میں یورپ اور امریکہ کے معروف فیشن گھروں کی چمکتی دمکتی مصنوعات سجی
تھیں.... ڈیزائنرز واچز' بریسلٹ' لباس' شوز' زیورات اور کیمرے اور یہ بھکشو اُنہیں دیکھ
رہے تھے مہاتما بدھ سے قدرے بدگمان ہوتے تھے جس نے دُنیا کو ترک کردینے کی صلاح دی
تھی.... اور وہاں ایسے جین مت کے پیرکار تھے جو ہوا میں نظر نہ آنے والے کیڑوں
مکوڑوں کو سانس کے ساتھ نگل کر اُن کے قتل کے مرتکب نہ ہونا چاہتے تھے اور مُنہ اور
ناک پر ایک نقاب سا باندھے پھرتے تھے اور اس کے باوجود کارٹیئر کے زیورات اور
گھڑیوں اور پیئر کارڈن کے ملبوسات پر ایک ایسی نظر ڈالتے تھے جو کہتی تھی کہ ہم کتنے
کیڑے مکوڑے نگلیں تو ہمیں یہ گھڑی.... یہ لباس مل سکتا ہے....
میرا نیپالی جوش اور ولولہ وصال کے بعد کی حالت کی طرح یکدم ٹھنڈا اور
بے روح ہوگیا.... میں اِس نوعیت کے کئی سٹور بلکہ اس سے بہتر گھر چھوڑ کر آیا تھا.... تو
مجھے نئے تردد کی کیا ضرورت تھی.... اور جب میں ٹھنڈا اور لاتعلق ہوتا ہوں تو خود بھی نہیں

سمجھ سکتا کہ میں اتنا ٹھنڈا اور لاتعلق کیوں ہو گیا ہوں۔

سُنہری بابا جانے کونسی منزل پر تھے.... اپنے بچوں کے لئے اِمپورٹڈ کھلونوں کی تلاش میں.... گمشدہ کو جب آخری بار دیکھا گیا تھا تو بینکاک ہیئر کلپس اور ہنڈ چُوڑیوں کی ایک دوکان میں مسحور کھڑی تھیں....

ملک اور فاروق شاید کسی مشن امپاسیبل کی مار پر نکلے ہوئے تھے....

میرا موڈ سخت آف ہو گیا۔

کیا کھٹمنڈو کی شام صرف اس لئے ہے کہ ہم اُسے کسی ایسے سٹور میں گزار دیں جو دُنیا کے کسی تختے پر بھی ہو سکتا تھا اور وہاں نہ گذاریں جو صرف کھٹمنڈو میں ہو سکتا تھا۔

جب مسجد قرطبہ کے مرکز کو مسمار کر کے وہاں ایک کلیسا تعمیر کر دیا گیا تھا تو ایک پادری نے کہا تھا کہ تم نے ایک ایسی شے تعمیر کی ہے جو کہیں بھی تعمیر کی جاسکتی تھی اور ایک ایسی شے کو ڈھا دیا ہے جو کہیں بھی تعمیر نہیں ہو سکتی....

تو میرے لئے آج کی کھٹمنڈو شام ڈھے گئی تھی.... اور اُس کی جگہ یہ سُپر سٹور جو کہیں بھی ہو سکتا تھا.... اس لئے میرا موڈ سخت آف تھا....

میں اور ہمشیرہ گرلی گائیڈ نہایت غمناک' رنجیدہ اِس شام کی بربادی پر ذاکروں کی طرح نوحہ کناں اور اس شام غریباں پر کفِ افسوس ملتے سٹور کے مرکز میں اور گند مرکز میں ایک سخت بنچ پر پہلو بدلتے اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتے اور وقت کی ریت کے ذروں کو اپنی مٹھیوں میں سے گرتے محسوس کرتے اذیت میں تھے کہ ہر ذرے پر کوئی ایک خوشنما بالکونی' کوئی مندر' سرد ہمالیائی ہوا کا ایک جھونکا' کوئی من موہنا چہرہ نقش تھا جو ہماری گرفت سے باہر نکل کر زیاں کی اس شام میں گُم ہوتا جاتا تھا....

ہم بار بار نیچے آتے خودکار زینوں کو دیکھتے کہ شاید ہجوم میں کوئی شناسا چہرہ ابھرے جس کے ہم منتظر تھے۔ بالآخر ہمشیرہ بور ہو کر اُٹھیں اور کہنے لگیں "یہ سامنے کارٹیئرز کی جیولری شاپ ہے ذرا جھانک لیں کہ ان کے پاس سستا ترین زیور یا گھڑی کس دام کی ہیں"

ہمشیرہ اُٹھ کر گئیں اور اُنہی قدموں پر لوٹ آئیں" سب سے کم قیمت گھڑی

صرف ستر ہزار روپے کی ہے۔"

ہم پھر اُس لایعنی شام میں سخت بنچ پر پہلو بدلتے ساتھیوں کے منتظر ہوئے۔

لیکن اس انتظار کا ایک فائدہ ہوا.... یہیں پر بیٹھے ہوئے میرے دل میں سے ایک کانٹا نکلا' ایک خلش رفع ہوئی.... جب سے میں اس شہر کھٹمنڈو میں آیا تھا وادیٔ نیپال میں قدم رکھا تھا یہاں کوئی ایک شے تھی یا نہیں تھی جو مجھے بے آرام کرتی تھی.... وہ کیا تھی؟ میں نے اُس سپر سٹور میں جہاں دنیا بھر کے فیشن گھروں کی لاکھوں ڈالر مالیت کی مصنوعات شوکیسوں میں سجی تھیں وہاں اُن کی حفاظت کے لئے میں نے ایک بیزار سا چوکیدار دیکھا جو اپنی بوسیدہ وردی میں ناتواں بدن میں صرف ایک ڈنڈے میں ملبوس ان مصنوعات کی "حفاظت" کر رہا تھا۔

بس یہی خلش تھی....

....یہی بے آرامی تھی....

....کہ میں نے نیپال میں اب تک کوئی ایک کلاشنکوف نہ دیکھی تھی.... کوئی ایک کاربین' ماؤزر یا آٹومیٹک رائفل نہیں دیکھی تھی' ہلاکت کا کوئی سامان نہ دیکھا تھا....

ان لوگوں کے دلوں پر واقعی قفل پڑے ہوئے تھے۔ سینکڑوں خداؤں کے سامنے جھکتے تھے' شرک کے مرتکب ہوتے تھے اور اس کے باوجود اُنہیں کسی کلاشنکوف کی ضرورت نہ تھی.... افغان جہاد کے ثمرات یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔

اور میں.... اپنے پیارے وطن میں ایک کلاشنکوف کے بغیر زندگی ادھوری سمجھتا تھا.... بے شک یہ میرے ذاتی گارڈ کی ہو۔ کتابوں کی دوکان کے باہر پہرا دیتے محافظ کی ہو۔ کسی تعلیمی ادارے کے ہونہار بروا کے ہاتھوں میں ہو.... یا ایک مذہبی شخصیت کے ٹرک پر سوار درجنوں کارکنوں کے لبادوں اور داڑھیوں میں سے جنم لینے والی اپنے سیاسی اور مذہبی عقیدے کی مدافعت کے لئے اور ذرا اختلاف کرنے والوں کو ٹھنڈا کر دینے والی کلاشنکوف ہو.... پس یہ ثابت ہوا کہ نیپال ایک نہایت بے دین ملک ہے کہ اُس میں دین کی حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار نہ تھا.... اور نہ ہی مندروں میں پوجا پاٹ کرنے والوں کی جانیں بچانے کے لئے کوئی مناسب بندوبست تھا.... نہایت بے رُوح معاشرہ تھا۔

ضیاء صاحب ایک وسط ایشیائی مغل فاتح کے انداز میں اکڑوں کھڑے عوام پر

ایک نظر حقارت ڈالتے خودکار زینے پر کھڑے نیچے آرہے تھے' اُن کے ہاتھوں میں
بہت بڑا گتے کا ڈبہ تھا جو ایک چوکور تابوت کی شکل کا تھا۔

"سر میں نے سومنگ پُول خرید لیا ہے۔"

"آپ کتنے دنوں سے نہیں نہائے تھے کہ آپ کو دو چار بالٹیوں کی بجائے پورا
سومنگ پُول کی حاجت ہوگئی۔"

"سر یہ سومنگ پُول پلاسٹک کا ہے۔" وہ بہت زیادہ پُرجوش ہو رہے تھے "
مجھے ایک عرصہ سے اس کی تلاش تھی.... اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچہ
نہیں ہے۔"

"کس کا بچہ؟"

"کسی کا بھی بچہ.... کیونکہ یہ احتیاط کی گئی ہے کہ اس میں صرف اتنا پانی
جاسکے جس میں اگر بچہ گر بھی جائے تو دو چار غوطے کھا کر باہر آجائے...."

"تو اس میں آپ بچے نہلائیں گے اور فی بچہ دس روپے وصول کر کے ا
آمدن کا بندوبست کریں گے۔"

"اس میں مَیں اپنے بچوں کو نہلاؤں گا.... اور بچے بابا کو' یعنی مجھ کو دعائیں د
گے"

گمشدہ اپنے بالوں میں بینکاک کے ہیئر کلپ سجائے اور بازوؤں میں ہندو
چوڑیاں کھنکاتی دانت نکالتی پہنچ گئی۔

ملک اور فاروق.... جدھر بھی گئے تھے' ناکام لوٹے تھے....

میرا دل جلا ہوا تھا' مُوڈ آف تھا اور میں بیزاری کی بادشاہت کے مرتبے پر
ہو چکا تھا "ضیاء صاحب قصور میرا ہے۔ میں نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا تھا اور ا
مرتبہ پھر آپ پر بھروسہ کر لیا تھا تو اب آپ کیا فرماتے ہیں؟"

"کہاں چلنا ہے ضیاء صاحب؟" گمشدہ نے بھی سوال کیا۔

"میں نے تو اپنا سومنگ پُول خرید لیا ہے اب کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کہاں
ہیں.... بس چلتے ہیں"

وشال بازار کے باہر جو فٹ پاتھ تھے اُن پر ایسے ایسے کردار تھے جو ہوٹل

کے جدید علاقوں میں نہ ملتے تھے صرف ادھر ملتے تھے.... بُھٹے بیچنے والے' آلو کے قتلے اور
سموسے اور آم کا اچار فروخت کرنے والے.... سستی جیولری' دھارمک تصویریں....
پلاسٹک کے برتن' چرس کا دھواں' شراب کی بُو.... اور ٹریفک اور ٹریفک.... سائیکل رکشا
گھنٹیاں بجاتے اور ہم اپنے آپ کو اُن سے بچاتے.... چلتے گئے۔

دائیں جانب شہر لاہور کی تنگ گلیوں میں سے ایک گلی ایک دراڑ کی طرح
عمارتوں کے اندر جا رہی تھی...." ضیاء صاحب.... اگر اجازت ہو تو ہم بے مہار اونٹوں کی
طرح بے مقصد چلتے جانے کی بجائے اس گلی میں نہ چلے جائیں؟"

"اس گلی میں کیا ہوگا؟"

"اگر میرے اندر کا قطب نما ابھی تک کام کر رہا ہے تو یہ گلی دھوکا بازار کے ٹل
چوک میں جا کھلے گی...."

"جہاں وہی رگھو ناتھ کی پشمینے والی دوکان ہے" گمشدہ سیدھی ہوگئی۔

یہ ایک ویسی ہی گلی تھی جیسی لاہور شہر کی گلیاں ہوتی ہیں لیکن تقریباً.... یہاں پر
خشک پھل' مرچ مصالحوں اور نیپالی مٹھائیوں کے تھوک کے بیوپاری بیٹھے تھے لیکن ان
کے سوا گلی پر جھکتی کھڑکیوں میں کچھ مخدوش قسم کی نیپالی حسینائیں بھی بیٹھی تھیں.... اس
لئے تقریباً.... اور تب ہم اُس مقام پر برآمد ہوئے اور ایک ست ماہے بچے کی طرح برآمد
ہوئے جہاں دھوکا دربار کے اختتام پر ٹل چوک تھا.... لیکن اس وقت زیادہ پُررونق نہیں
تھا....

بازار بند ہو چکا تھا.... اور صد شکر کہ رگھو ناتھ کی پشمینے کی دوکان کے آگے بھی
شٹر گرا ہوا تھا.... اور اسے بند دیکھ کر گمشدہ نے نہایت بے چارگی اور مایوسی سے اپنی پلکوں
کے شٹر متعدد بار اُٹھائے اور گرائے....

ہمیں بھوک بہت ستاتی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں...." سُنہری بابا نے پھر تسلی دی "یہاں کچھ دور دربار مرگ
ہے جہاں ایک انڈین فاسٹ فوڈ جوئنٹ ہے اور وہاں برگر ملیں گے۔ کلب سینڈوچ اور
آئس کریم سوڈا ملے گا.... آپ چلتے جائیں...."

چنانچہ ہم بوریت کے اُس لمحے میں تھے جب سپاہی ہتھیار ڈال دیتا ہے اور

خواہش کرتا ہے کہ اب جو کچھ ہونا ہے ہو جائے.... چنانچہ ہم چلتے گئے' اور یہ ایک پُر
اور پُر طلسم چال تھی۔

ہم کھٹمنڈو شہر کی قدامت کے اندر تک قدم رکھتے چلتے تھے' شب کی نیم تاری
میں ہم بھٹک بھٹک کر چلتے تھے.... شہر کے باشندے اپنے تنگ کمروں اور قیام گاہوں سے
نکل کر آزادی سے گھومتے تھے کہ دن کے وقت یہاں سیاحوں کا راج ہوتا تھا....

ایک ڈربہ نما کوٹھڑی میں طبلے اور ہارمونیم پر جھکے کچھ لوگ گاتے تھے' بجا
تھے اور جھوم جھوم جاتے تھے.... یہ بھجن گانے والوں کی قوال پارٹی تھی.... کوٹھڑی کی شکستہ
اینٹوں پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹس چسپاں تھا "ڈیووشنل سانگز.... وَن ڈالر اونلی"....ایک
ڈالر میں ایک بھجن مہنگا سودا نہ تھا۔ فی الحال اُنہیں سننے والا کوئی سیاح نہ تھا البتہ چند نیپا
ماتھوں پر تلک لگائے انہیں سنتے تھے اور حالت وجد کی قربت میں تھے۔ میں انہیں دیکھ
رُکا تو ہارمونیم کی کیز پر چلتی اُنگلیاں بھی رُک گئیں اور اپنے ماتھے کو سُرخرو کئے ساز
نہایت آشتی سے بولا "سر آپ ڈیووشنل سانگز سنیں گے؟"

"کتنے پیسے؟"

"اَونلی وَن ڈالر وَن سانگ...."

میرا جی چاہتا تھا کہ اس کوٹھڑی میں بیٹھ کر ایک دو بھجن سنوں ذرا لوکل ٹچ کے
لئے.... لیکن میرے ساتھی بہت آگے نکل گئے تھے "سم اَدر ٹائم...."

مسلسل چلنے کی وجہ سے بھوک ہمیں نڈھال کرتی تھی اور آنکھوں کے سامنے
چُرمرے سے ناچتے تھے.... ہم نے ایک مرتبہ پھر سُنہری بابا پر چڑھائی کر دی "ضیاء
صاحب...."

وہ نروس ہو کر مقدس قسمیں کھانے لگے اور ہمیں یقین دلانے لگے کہ دربار
مرگ اب دُور نہیں اور وہاں پہنچ کر ہماری ساری کلفتیں دُور ہو جائیں گی اور وہاں پہنچتے
ہی ہمارے سامنے ایسے بلند و بالا کلب سینڈوچ رکھ دیئے جائیں گے جو پیسا کے مینار کی
طرح قدرے جھکے ہوئے ہوں گے اور ان کی تہوں میں سے چکن' سلاد اور مایونیز
جھانک جھانک کر اپنے آپ کو کھا جانے کی دعوت دیں گے۔

گلی کوچوں کی روشنیاں بے حد مدھم تھیں۔ دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔

گھنٹی کی صدا سُنائی دے جاتی جو دیر تک میری عُمر کے موہنجوڈارو پر گونجتی رہتی....
لکڑی کی بوسیدہ کھڑکیوں کے کواڑ ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ ہمارے بدن دُکھتے
تھے' پاؤں رُکتے تھے.... ویسے سب سے کم میرے پاؤں دُکھتے تھے کہ میں جاگرز میں تھا اور
یہ مخلوق معزز پاپوشی میں جکڑی ہوئی تھی.... ہم چونکہ بھٹک بھٹک کر چلتے تھے اور سرگوشی
بھی اٹک اٹک کر چلتی تھی اس لئے ہمیں خبر بھی نہ ہوئی جب ایک لمحہ وہ وہاں تھی اور
دوسرے لمحے وہ وہاں نہیں تھی اور حسب روایت گُم ہو چکی تھی۔ میں ذرا پریشانی میں
مبتلا ہو گیا "ضیاء صاحب رات ہو گئی ہے اور خالدہ پھر گمشدہ...."

"میرا خیال ہے کہ وہ کسی نیپالی زیورات کی دوکان میں محو ہو گی اور کسی جھمکے پر
جھکی ہو گی اور اتنی دیر تک جھکی رہی ہو گی کہ دوکاندار کو دوکان بند کرتے ہوئے شائبہ بھی
نہ ہوا ہو گا کہ اُس نے ایک پاکستانی صحافی خاتون کو اندر مقفل کر دیا ہے۔"

"ہائے ہائے۔" نہایت پُر تشویش ہوتی ہمشیرہ نے دوہائی دی" وہاں تو اُس کا دم
گھٹ جائے گا۔"

"وہ اُس جھمکے سے نظر اُٹھائے گی تو اُس کا دم گھٹے گا ناں۔"

"اب کیا کریں؟" قافلہ رُک گیا۔

"بھئی یہ نیپالی اس قسم کی گمشدہ دوشیزاؤں کو اغوا وغیرہ تو نہیں کر لیتے؟"

"لو اُنہیں اپنے بھگوانوں سے فرصت ملے تو عورتوں کی طرف دیکھیں۔" ہمشیرہ
نے اپنی جانب نیپالیوں کی بے اعتنائی کا بدلہ لے لیا.... اُنہیں بے حد صدمہ تھا کہ یہ لوگ
خواتین کو گھورتے ہی نہیں.... خواتین کو گھورنا بے شک ایک معیوب عمل ہے لیکن اس
میں کشش کا اقرار تو ہے جو صنف نازک کو عام طور پر گراں نہیں گزرتا۔

"ویسے اگر ہم اپنے آپ کو گنتے ہیں تارڑ صاحب تو آپ ہیں۔ ہمشیرہ ہیں'
فاروقی ہیں' تین لوگ ہیں۔" ضیاء صاحب کہنے لگے....

"اگر آپ اپنے آپ کو بھی شمار کر لیں تو چار لوگ ہیں۔"

"ہاں میں اپنے آپ کو بھول ہی گیا تھا" وہ ایک سُنہری ریش ہنسی ہنسے "تو
ہمارے ساتھ اُس حسینہ گُم گشتہ کے علاوہ ملک صاحب بھی نہیں پائے جاتے۔ جس کا
مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں ہم سے بچھڑ گئے ہیں۔ یا آگے چلے گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے

ہیں.... وہ اگر اکٹھے ہیں تو گمشدہ محفوظ ہیں اغوا وغیرہ کے امکانات نہیں ہیں۔"

"اور اگر وہ الگ الگ ہیں اور سلمان کسی دیوی کے بت کے سامنے رُوٹھا ہو

کہ تم مجھ پر مرکیوں نہیں مٹیں اور گمشدہ کہیں اور ہے تو...."

"تو ہم انتظار کرتے ہیں۔۔۔"

اور ہم نے تادیر انتظار کیا.... اور جب تادیر.... تا نادیر ہوگئی تو ہم نے ا

ذہنوں کی سکرین پر تلاشِ گمشدہ میں دکھائی جانے والی تصاویر میں ملک اور گمشدہ کو

کیا' اپنے فون نمبر درج کئے کہ مندرجہ بالا گمشدہ افراد ذہنی طور پر معذور ہیں....

روٹھ جانے پر مجبور ہے اور دُوسرا شاپنگ فتور کا معذور ہے اگر کہیں دستیاب ہو

فوری طور پر ان ٹیلی فون نمبروں پر اطلاع کریں لیکن.... کسی فون کی گھنٹی نہ بجی.... اور

وہاں کھڑے کھڑے بھوک اور تھکاوٹ سے سُوکھتے رہے۔

"بھئی یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دونوں گمشدہ نہ ہوں.... ہم چاروں ہوں۔"

"یعنی۔"

"یعنی یہ کہ وہ راہ راست پر ہوں اور ہم بھٹک چکے ہوں اور وہ پریشان ہوں ہمیں تلاش کرتے ہوں۔"

"ہم اگرچہ ایک بھٹکی ہوئی قوم میں سے ہیں لیکن یہ ایک طے شدہ بات ہے ہم آگے تھے اور وہ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں یا واپس ہوٹل چلے گئے ہیں.... وہ ہم سے آگے نہیں.... پیچھے ہوتے تو اب تک آچکے ہوتے چنانچہ ہم چلتے ہیں۔"

چنانچہ ہم چلتے تھے....

دائیں جانب ایک شب کی سیاہی والے شکستہ مگر نہایت دل فریب مندر کی

منزل پر چار کھڑکیاں کھلی تھیں اور روشن تھیں....

تین کے وجود مورتیوں اور سُنہری نقوش والی دیویوں سے بھرے جھلملاتے

اور چوتھی کھڑکی میں ایک عینک والا پجاری منڈیر پر جھکا دیئے جلاتا تھا۔

اور نیچے مندر کے اندر ایک آہنی جنگلے میں کوئی خدا قید تھا جو تاریکی کی وجہ

شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا.... ویسے بھی پتہ نہیں تھا کہ پتہ نہیں کون اور کس کا خدا

آئے.... اور جنگلے کے اندر ایک پجاری ایک نہایت کالے کلوٹے مہاتما بُدھ کو رگڑ

چمکاتا چلا جاتا تھا.... چنانچہ مہاتما کا آدھا بدن.... لبادہ اور ماتھا چمک چکا تھا اور بقیہ مہاتما زنگ رگڑ کا منتظر تھا....

ہم جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے اور مہاتما کی اوورہالنگ کا منظر دیکھنے لگے۔

پجاری نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اپنے بُدھ کو چمکاتا رہا....

"ہیلو...."

اُس نے ایک ناراض نظر اُٹھا کر ہمیں جنگلے پر جھکا دیکھا۔۔۔ "ہیلو۔" وہ ہاتھ باندہ کر ذرا جھکا اور پھر سے اپنے مہاتما جی کو پالش کرنے میں مشغول ہوگیا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اگلے پانچ چھ روز تک فارغ نہیں ہوگا کیونکہ اُس کے سامنے درجنوں زنگ آلود کالے کلوٹے مجسمے قطار لگائے اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔

ہر شخص سے تعارف پر اُس کے نام کے بعد اُس کا پروفیشن پُوچھا جاتا ہے کہ آپ کرتے کیا ہیں؟.... جیسے شنید ہے کہ کراچی کی ایک دعوت میں ایک میمن سیٹھ نے فیض صاحب سے پُوچھا تھا کہ آپ کیا کرتا ہے؟

تو فیض صاحب نے سگرٹ کا سُوٹا لگا کر اُس کے ساتھ جو امپوٹنٹ راکھ گرنے کو تھی اُسے جھاڑ کر کہا تھا "ہم شاعری کرتا ہے۔"

سیٹھ صاحب نے خفا ہو کر کہا تھا "بابا شاعری ماری تو کرتا ہے پر دھندہ کیا کرتا ہے؟"

فیض صاحب بے چارگی سے بولے "بھئی.... وہ یوں ہے کہ.... ہم کتابیں لکھتا ہے۔" اس پر سیٹھ صاحب نے فوراً آفر لگا دی کہ بابا بوری دو بوری اپن کو بھیج دو.... بکوا دے گا۔

تو اگر ہم اس پجاری سے پُوچھتے ہیں کہ بابا آپ پجاری تو ہے پر دھندہ کیا کرتا ہے؟.... تو یہ جواب دیتا کہ ہم مہاتما کا مجسمہ چمکاتا ہے.... یہ دھندہ کرتا ہے.... لیکن ہم مہاتما کے بتوں کی بوری دو بوری نہیں خرید سکتے تھے.... کیونکہ شاکیہ منی نے تو ایک سلطنت ٹھکرا دی تھی' ایسے لوگ برائے فروخت کیسے ہوسکتے تھے....

ویسے مہاتما بُدھ کے مجسّمے چمکانا بھی کیا یونیک اور زبردست پروفیشن تھا....

ہم مزید چلے.... اور جب سکت مزید کم ہوئی تو فاروق کہنے لگا "تارڑ صاحب!...
مجھے بھوک سے مرنا ہے تو اپنے اسلام آباد میں اسلامی طریقے سے کیوں نہ مروں.... یہ
کھٹمنڈو میں سورگباشی کیوں ہو جاؤں.... ٹیکسی تلاش کر کے واپس ہوٹل چلتے ہیں اور کمرے
میں جا کر پیٹ پوجا کرتے ہیں...."

"ساتھیو، مجاہدو.... جاگ اُٹھا ہے سارا وطن.... میرا مطلب ہے ساتھیو اب ہوٹل
دُور نہیں.... چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی۔" یہ ضیاء صاحب کا فرمان تھا....

ہم اپنے اُن پاؤں کو بمشکل اُٹھانے لگے جو آئرش خچروں کی طرح بھاری ہو چکے
تھے.... اور یاد رہے کہ یہ مثال.... یعنی پاؤں بھاری ہونا صرف مرد حضرات کے لئے استعمال
کی گئی ہے۔

اگر ہم غور کرتے تو اس کھٹمنڈو نائٹ میں کوچۂ وبازار میں ایک ایسی سیر...
دوران جس کے ہم خواہاں نہ تھے.... اُس کی چاہت نہ رکھتے تھے مجبوری سے چلتے تھے
اس کے دوران حیرانی کے بہت سے سبب تھے.... اور اُس میں سے ایک یہ تھا کہ اس...
چلاؤ کے دوران کسی ایک فقیر نے بھی ہمارا دامن نہ تھاما.... کہ سخیا دے جاشیوا کے
پر.... رام بھلی کرے گا.... نہ کسی نیپالی نے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے راستہ روکا
تم کون ہو.... اور نہ کسی دیوی یا دیوتا نے آنکھ اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا کہ اگر تم ہم
ماننے والے نہیں ہو تو نصف شب کی قربت میں ان نیم تاریک گلیوں میں کیوں چلتے ہو
ہم بھوکے تھے اور تھکے ہوئے تھے....

ضیاء صاحب اگر اُس لمحے ریفرنڈم کرواتے تو یقیناً ہم نہ ہوتے جو اُنہیں
دیتے.... اور تب ایک اور مترنم گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں آئی.... اور کانوں سے...
میرے بدن میں دستک دینے لگی.... اس کی دستک سے بہت دروازے کھلے....
دروازے بھی جن کے قبضے زنگ آلود ہو چکے تھے کہ اُنہیں کھلے مدتیں ہو چکی تھیں
گھنٹی کی صدا ان دروازوں میں سے گذر کر انگلستان کے سرد سمندر کی رات میں...
لگی.... سمندر کی لہروں میں، سرد شب کے اندھیروں میں تیرتی ہوئی ایک تناسب...
بدن.... اور سفید اور سُنہری ٹراؤٹ کے چکیلے بدن کی شفاف جلد والی لڑکی.... ایسے تیرتی...
کہ اُس کے سُنہری بال پانی میں ڈوبتے تھے تو اُس کا پچھلا دھڑ تاریکی میں اُبھ...

ہتابوں کی طرح قوس ہوتا تھا.... میں کنارے پر بیٹھا اپنے سومنگ کاسٹیوم میں ٹھٹھرتا اور
اُس کی بنائی ہوئی گرم کافی کو حلق سے اُتارتا تھا اور اُسے انگلستان کے سرد سمندر میں
ایک سُنہری ٹراؤٹ کی طرح تیرتے دیکھتا تھا اور اُس کے سُنہری بال پانی میں ڈوبتے دور
ہوتے تھے اور اُس کا پچھلا دھڑ جب پانی سے باہر آتا تھا تو دو مہتابوں کی طرح قوس ہوتا
تھا....

گھنٹی کی صدا اتنے در کیوں کھولتی تھی؟

اس لئے کہ وہاں ایک چاند کی چودھویں کے بدن والی دیوی.... دودھیا اور بدنی
تناسب سے بھری ہوئی بیٹھی تھی اور یہ اُس کے مندر کی گھنٹی کی آواز تھی جو مجھے سُنہری
ٹراؤٹ تک لے گئی تھی....

ایک اور مندر تھا....

ایک اور دیوی چاند کی چودھویں کے بدن والی سفید ماہتاب دیوی آہنی جنگلے کے
پیچھے براجمان تھی.... اُس کے مندر کے باہر وہ گھنٹی لٹکتی تھی اور جو کوئی بھی اُدھر سے
گذرتا تھا وہ پہلے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا تھا اور پھر اُس کی آہنی زبان کو تھام کر اُسے حرکت
دیتا تھا اور سر جھکا کر گذر جاتا تھا۔

ایک سائیکل پر سوار دو نیپالی آئے.... پہلے ڈنڈے پر بیٹھے ہوئے نیپالی نے اُسے
چھوا اور پھر سائیکل کی گدی پر براجمان بندے نے ہینڈل کو چھوڑ کر اُسے سلام کیا.... گھنٹی
کو حرکت دی اور پھر آگے گئے....

جو کوئی بھی گھنٹی کے نیچے سے گذرتا تھا سر جھکا کر سلام کر کے اُسے بجا کر گذرتا
تھا۔

"کس کا مندر ہے؟" میں نے ایک عقیدت مند سے دریافت کیا جو بُت بنا ہاتھ
باندھے دیوی کے سامنے کھڑا تھا....

"نہیں جانتے؟"

"نہیں جانتا۔"

"نہیں پہچانتے؟"

"نہیں پہچانتا"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پاکستان سے۔"

"تبھی.... یہ اناپُورنا دیوی کا مندر ہے.... اناپُورنا...."

میں سفید اور برفپوش اور بے داغ برفانی لبادوں میں ڈھکی چوٹی اناپُورنا سے نا واقف تھا.... دُنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک .... لیکن اس نام کی دیوی سے میرا تعارف نہ تھا....

دیوی کی کوئی واضح شکل نہ تھی.... لیکن وہ سراسر سفید تھی.... زرد پھولوں سے لدی۔ پگھلتی موم کے جھماکوں میں اُس کا بدن گورا اور روشن تھا۔ گذرنے والے اُس کی سفیدی اور روشنی کے لئے کچھ نہ کچھ بھینٹ کرتے اور گھڑیال بجا کر اُسے خبر کرتے کہ دیوی مجھے یاد رکھنا۔ کہ میں ادھر سے گذرا تو تجھے پرنام کرکے گذرا....

اناپُورنا کے مندر میں کوئی تاریکی کوئی بھید کوئی طلسم نہ تھا.... وہ اتنی روشن تھی کہ اُسے دیکھنے سے آنکھیں دُکھتی تھیں.... یہ کھٹمنڈو کی پہلی دیوی تھی جسے پرنام کرنے کو میرا بھی جی چاہا.... میں آگے بڑھا اور اُس کے مندر کی گھنٹی کو تھام کر اُسے حرکت دی....
عُمر کے موہنجو ڈارو پر تیرتی اُس کی آواز ایک مرتبہ پھر وہاں تک گئی جہاں سرد سمندر میں ایک سفید جل پری کا بدن ڈوبتا اُبھرتا تھا اور قوسوں کے دو ماہتاب پانیوں میں غروب ہو کر طلوع ہوتے تھے....

"تارڑ صاحب.... یہ آپ کیا کر رہے ہیں.... میں نے پہلے بھی آپ کو منع کیا تھا۔" سُنہری بابا پھر ہراساں ہوگئے "یہ لوگ مائنڈ کریں گے۔ ان کی دیویوں کی گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ ان کے پرائیویٹ پارٹس کو ہاتھ لگاتے ہیں.... یہ ہتک اناپُورنا کا کیس کر دیں گے"

"میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اگر ہم گھنٹیاں نہیں بجائیں گے تب وہ ہم پر شک کریں گے اور مائنڈ کریں گے۔"

"لیکن آپ اس گھنٹی کو بجا کر کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں" ہمشیرہ نے بھی احتجاج کیا "پتھر کے بتوں کو پرنام کر رہے ہیں۔"

"ہمشیرہ.... میں اپنی زندگی میں بے شمار پتھر کے بتوں کے سامنے جھک چکا ہوں

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے۔ اور یوں بھی اگر جھکا ہوں تو صرف اس کی سفیدی اور روشنی کے سامنے.... جو میرے لئے ایک بلند کوہسار ہے.... اور یہ عمل تو میں پاکستانی شمال میں بھی کرتا ہوں"

"پاکستان ماشاء اللہ سے اسلامی ملک ہے...." ہمشیرہ نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا "وہاں کونسے بت ہیں' کونسی دیویاں ہیں؟"

"وہاں نانگا پربت بھی تو ایک دیوی ہے جس کا مندر فیری میڈو ہے.... راکاپوشی کا برفانی بت ہے جس کا میں ریگولر پجاری ہوں۔ شاہ گوری ہے.... اناپُورنا سے زیادہ گوری ہے اور اُس کے بدن پر جو نیل ہیں وہ میرے بوسوں کے نشان ہیں...."

"Indeed" ضیاء صاحب نے داڑھی کھجلا کر میری عقل پر ماتم کیا۔

اور اس دوران ہمشیرہ اور فاروق اناپُورنا کے سامنے بھجن گانے والی ایک پجارن کی آواز پر کان دھرے کھڑے تھے اور مبہوت کھڑے تھے....

"ویسے سَر ایک راز کی بات بتائیں...." میں نے سُنہری بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پُوچھا اور گمشدہ کے سرگوشی انداز میں پُوچھا۔

"جی فرمایئے"

"کسی مندر کی گھنٹی کی آواز سُن کر آپ کے اندر جو ہندو ہے وہ نہیں جاگتا؟"

"لاحول ولا...." ضیاء صاحب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اپنے ایمان کو مستحکم کیا۔

"آپ کی آستینوں میں بُت نہیں ہیں؟"

"لاحول ولا...."

"سَر ذرا یہ گھنٹی بجا کر دیکھیں.... اگر ایمان ڈگمگا نہ جائے تو پیسے واپس...."

"کیا اس گھنٹی میں بجلی کا کرنٹ ہے؟"

"ہے...."

"تو پھر میں اِسے ہاتھ لگانے کا رِسک نہیں لے سکتا.... اور پلیز راستہ کھوٹا نہ کریں اور اس قسم کی کھوٹی دیویوں سے ذرا پہلو تہی کرتے جائیں ورنہ ہم دربار مرگ تک پہنچ سکیں گے جہاں کلب سینڈوچ' برگر اور فرینچ فرائز ہمارا انتظار کر رہے ہیں"

میں اعتراف کرتا ہوں کہ ذائقے دار خوراک کی اس تفصیل نے مجھے نویدِ مسرت دی کہ اناپورنا کا تمام تر طلسم زائل ہوگیا.... ہم پھر سے چلنے لگے۔

ایک دوراہا آیا....

ہم رُک گئے.... کس راستے پر سفر کریں.... اس طرف یا اُس جانب.... ہم میں پڑ گئے....

سکینۃ اولیا میں آیا ہے کہ ایک درویش بابا اور اُن کا ایک نوجوان چیلا جنگل سفر کرتے تھے تو اُن کے سامنے ایک دوراہا آگیا۔ چیلا رُک گیا اور پُوچھا بابا ان دو راستوں میں سے کس راستے پر چلیں؟ اس پر درویش بابا تاؤ میں آگئے اور اُنہوں اپنے چہیتے چیلے کی ذرا گوشمالی کی اور پھر اُس کے لبادے کی تلاشی لی.... لبادے کی جیب میں سے ایک عدد چونی برآمد ہوگئی' باباجی نے اُس چونی کو جنگل کی تاریکی میں اُ دیا اور پھر چیلے سے پُوچھا "اب وہی سوال دریافت کرو کہ کونسے راستے کا چناؤ کرنا ہے شاگرد نے کان لپیٹ کر کہا "بس اُس چونی کی وجہ سے جھجکتا تھا کہ اُسے راہزن لُوٹ لیں.... اب دونوں راستے ایک جیسے ہیں...." درویش بابا جان گئے تھے کہ اس کے پلّے مال ہے جو اِسے خوفزدہ کرتا ہے....

ہمارے پلّے صرف ایک چونی نہ تھی بلکہ ڈالر اور سینکڑوں ڈالر کھنکتے تھے....ا لئے ہم بھی جھجکتے تھے کہ کونسا راستہ اختیار کریں۔

چنانچہ بائیں جانب والا راستہ جدھر روشنی ذرا زیادہ تھی اور کچھ نیون سائن دمکتے تھے ہم نے محفوظ سمجھ کر اختیار کرلیا۔

اب تو یُوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم پیدائش کے بعد جونہی ہمارے کانوں میں اذا دی گئی ہے ہم ادھر کھٹمنڈو آ نکلے ہیں اور تب سے چلتے جا رہے ہیں۔

"یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ ہم اُس موئے دربارِ مرگ میں ہی جا کر سینڈوچ کھائیں۔ اگر راستے میں کوئی مناسب طعام گاہ نظر آگئی تو وہیں طعام کرلیں گے ہمشیرہ دل و جان سے ہم سے اور بھوک سے عاجز آچکی تھیں۔

اور عین اُسی لمحے ایک مندر نما عمارت کے باہر "کھٹمنڈو کچن" کا سائن دکھ دیا۔

"تارڑ صاحب ذرا معلومات حاصل کریں کہ ان نیپالیوں نے اپنے باورچی خانے میں کیا پکایا ہے اور آئی سی میں کتنے کا ہے؟"

"کھٹمنڈو کچن" کے بورڈ تلے ایک مخدوش اور شک بھرا دروازہ تھا....

جیسے کسی بوڑھی طوائف کے گھر کا دروازہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اندر آ جاؤ میں نہیں اپنے تجربے کی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دوں گی۔

میں اُس کے اندر گیا تو کواڑ کے پیچھے پوشیدہ ایک دربان نمودار ہوگیا.... پتہ نہیں کس زبان میں کیا کہا اور مجھے اُوپر جانے کا اشارہ کیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک نیچی چھت کا مختصر سا ریستوران تھا جیسے ہمالیہ کی برفوں کے نزدیک شرپا لوگوں کے سرد موسموں کا سر جھکا کر مقابلہ کرنے والے گھر ہوتے ہیں.... چند گورا لوگ نیپالی موسیقی کی ٹوں ٹوں میں گم بیئر پیتے تھے اور پتہ نہیں کیا الا بلا کھاتے تھے.... ویسے وہ خوش بہت تھے.... جس قسم اور جیسے بدنوں کی لڑکیاں وہاں بیٹھی تھیں میں بھی بہت خوش ہوتا۔ میں نے کاؤنٹر کے پیچھے ہمہ وقت مسکراتے نیپالی سے پُوچھا۔

"ادھر کھانے کو ملے گا؟"

"ملے گا۔"

"کیا کیا ملے گا؟"

"نیپالی فوڈ ہوگا سَر...." اور اس کے بعد اُس نے اُنہی الا بلا کھانوں کے نام لئے جو گورا لوگ رغبت سے کھاتے تھے اور جو میرے سر سے گذر گئے۔

"ہاؤ مچ...."

"فکسڈ ریٹ ہے سَر.... گیارہ ڈالر.... سات کورس کا ڈنر اور ایک بوتل بیئر...."

"گیارہ ڈالر.... یعنی تقریباً پانچ سو پاکستانی روپے۔"

"پاکستان؟" وہ قطعی طور پر اس لفظ کے لئے تیار نہ تھا "آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں دو چار روز پیشتر آئے تھے.... بھائی آپ کے پاس لاکارٹ مینیو یا سستا والا فوڈ نہیں ہے...."

"سوری سَر.... فکسڈ ڈنر.... فکسڈ پرائس' اور بیئر...."

لیکن جب میں اس "کھٹمنڈو کچن" کے ریستوران سے نیچے آ رہا تھا.... نیم تاریک سیڑھیوں میں یہاں سے گزرنے والے اور ہمالیہ کی بلندیوں سے لوٹنے والے کوہ نوردوں کی تصویریں دیواروں پر چسپاں دیکھتا تھا.... جیسے کے ٹو موٹل سکردو کے برآمدوں میں کوہ پیماؤں اور کوہ نوردوں کے پوسٹر ہیں۔ کارڈ ہیں اور وہ مناظر ہیں جو خوف اور خطرے کی روپوش ایسی وادیوں میں ہیں جہاں صرف وہ پہنچے تھے.... تو میں سوچتا تھا کہ اگر میرے ہمراہ سُنہری بابا اور ہمشیرہ صاحبہ کی بجائے کوئی نانگا پربت 'کوئی شاہ گوری کوئی راکاپوشی ہوتی تو میں اُس کی برف سفیدی کے ساتھ قیام کے لئے اسی مقام کا چناؤ کرتا.... ایک شب تو بسر گذارتا۔

"تبت کے شاہ جی اور مغل شاہ زادی... نئے چراغ نئے گلے"

"ہاں جی۔" میرے ساتھی فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔

"بہت مہنگا ہے.... اور یوں بھی نیپالی فوڈ میں تیل کی بُو ہو گی...."

"حلال بھی نہیں ہو گی؟" ہمشیرہ نے عینک درست کرتے ہوئے ناک چڑھائی۔

"یقیناً نہیں۔"

"تو پھر آگے چلتے ہیں۔"

آگے ایک اور سنگم آ گیا.... گئی رات میں کچھ ریستورانوں اور مے خانوں کے نیون سائن اب بھی روشن تھے اور وہاں سے موسیقی نیچے اُتر کر ہماری آس پاس فٹ پاتھ پھیلتی تھی اور پھر سڑک کے پاس جاتی تھی جہاں تاریکی میں ڈوبتا' روپوش ہوتا ایک سی جھیل کے پھیلاؤ جتنا ایک تالاب تھا.... اور اُس کے عین درمیان میں کسی دیوی کا منور تھا جس میں چراغ جلتے تھے.... موسیقی کی دھمک شاید اُن تک بھی پہنچتی تھی کہ اُن کی لو تھرتھراتی تھی....

"یہاں تھوڑی دیر ٹھہرتے ہیں.... شاید گمشدہ اور ملک مل ہی جائیں۔"

ہم وہاں تھوڑی دیر ٹھہرے.... اور جب وہ تھوڑی دیر اختتام کو پہنچی تو ہم ایک اور تھوڑی دیر ٹھہرے اور جب وہ بھی ختم ہو گئی تو ہم چلنے لگے.... سامنے فٹ پاتھ پر ایک ہاتھ تھامے دو حضرات چلے آ رہے تھے۔ میں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُنہیں روکا

اور پوچھا.... ”ادھر سے دربار مرگ کتنی دور ہے؟“

”ابھی قریب ہے۔“

اور میں یہ فقرہ بہت سُن چکا تھا کہ ابھی قریب ہے۔ کوہ نوردی کے دوران ہر
گائیڈ ہمیشہ یہی خوش خبری سُناتا تھا کہ صاحب.... فلاں وادی.... فلاں چوٹی.... ابھی ذرا
ہے۔ دُور نہیں.... آگے میدان ہے۔ راستہ آسان ہے.... دور نہیں.... اور ہم اکثر اوقات
اُس ”ابھی قریب ہے“ تک تین دنوں کی مسافت کے بعد پہنچتے تھے۔

ابھی میں اسی کشمکش میں تھا کہ ان کا اعتبار کروں یا نہ کروں جب اُن میں سے
ایک میرے چہرے کے اتنا قریب آگیا کہ میں نے اُسے ایک ”گے“ سمجھا اور بلا جھجک میرا
پُورا نام پکار کر بولا' آپ وہ تو نہیں ہیں؟

”ہم وہی ہیں لیکن آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”صاحب ہم کشمیر سے آئے ہیں۔ اُدھر گڑ بڑ ہے تو ہمارا لوگ کلکتہ' بنگلور'
مدراس وغیرہ کاروبار کے لئے نکل جاتا ہے۔ کچھ اُدھر نیپال میں آجاتا ہے اور کشمیری
دستکاری کا کام کرتا ہے.... ہم اُدھر سرینگر میں تھا تو ٹیلی ویژن پر آپ کا پروگرام دیکھتا تھا
تو آپ ادھر کدھر آگئے؟“

”یہ ایک درد ناک اور بھوکی داستان ہے کشمیری بھائی.... کہ ہم ادھر کدھر
آگئے.... ہم بھوکے اور فاقہ زدہ ہیں آپ ہم پر صرف یہ احسان کرو کہ ہمیں بتاؤ کہ ا
کہیں کھانا ملے گا یا نہیں؟“

”صاحب اُدھر جائیں“ کشمیری برادر نے اندھیرے میں گم تالاب کی طرف اشارہ
کیا“ اُدھر پہلے کشمیری مسجد آئے گی۔ پھر نیپالی مسجد آئے گی.... اور وہیں مسلم ہوٹل ہے
تاج ہوٹل.... بسم اللہ ہوٹل....“

”بسم اللہ۔“ ہمشیرہ نے خوش ہو کر زیر لب دوہرایا۔

”وہاں گوشت تو حلال ہوگا ناں؟“ سُنہری بابا نے ایک فضول سوال کیا۔

”مسلمانوں کے ہوٹل میں جھٹکا گوشت تو نہیں ہوتا صاحب۔“

”Indeed“ سُنہری بابا نے فوراً سر ہلایا ”کیسے ہو سکتا ہے؟“

”خالدہ اور سلمان کہاں ہو سکتے ہیں....“ فاروق اپنے دوست کے لئے فکر مند

تھا۔ ”وہ بے شک اس تالاب میں ڈوب چکے ہوں' ہمیں اُن سے کیا....“ میں نے
جل کر کہا ”جناب ہمارے سامنے نیپال کے قیام کے دوران ایک ایسا وقت آیا ہے کہ ہم
حلال گوشت کھا سکتے ہیں اور آپ اس لمحے پوچھتے ہیں کہ حسینہ گمشدہ اور روٹھ جانے والا
ملک کہاں ہے.... آجائیں۔“

ہم سب آگئے۔

ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ تالاب والی دیوی کے مندر میں جلتے چراغوں کی
روشنی یہاں تک نہ پہنچتی تھی.... کشمیری مسجد کے مینار اور محراب نظر آئے تو ہم سب پھر
سے مسلمان ہوگئے.... کم از کم میں تو اناپورنا کا پجاری ہو چکا تھا اب تو بہ تائب ہوا اور پھر
سے ایمان لے آیا.... من اپنا پُرانا پاپی تھا اور اگرچہ برسوں میں نمازی بن نہ سکا تھا لیکن
کسی بھی مسجد کو دیکھ کر ہمیشہ یُوں لگا جیسے بھٹکا ہوا آہو تھا اور گھر آگیا ہوں.... مسجد قرطبہ
کے باہر لبنانی ناژلا سعد تھی جو رات کی آخری ٹرین سے میڈرڈ جا رہی تھی اور اندر....
اُس کے ہجوم نخیل ستونوں میں گھر تھا....

کشمیری مسجد کے دروازے میں سے چند نمازی باہر آ رہے تھے....

ہم نے ایک نہایت پُرجوش سلام دعا کی تو وہ حیرت میں آگئے اور از حد جذباتی ہو
کر ہمیں گلے لگانے لگے' ہمشیرہ از راہ احتیاط ذرا پرے ہوگئیں۔

اُس سے آگے ”تاج ہوٹل“ کا بوسیدہ بورڈ مسجد کے پہلو میں آویزاں تھا۔

ایک آہنی جنگلے کے برابر میں سے چند سیڑھیاں اُترتی تھیں۔

آہنی جنگلے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا گیٹ تھا اور اُس لمحے ہم نہیں جانتے
تھے کہ یہ کس آزاد رُوح کو قید کرتا ہے.... وہاں خاک میں کونسی صورت ہے جو پنہاں ہے۔

ہم نہیں جانتے تھے۔

اندھیری سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے ہم نیچے گئے اور پھر ایک ہال نما
کمرے میں داخل ہوئے جس میں گندم کی خوشبو تھی اور اُن ذائقوں کی مہک تھی جن
کے لئے ہم ترسے ہوئے تھے....

یہی ”تاج ہوٹل“ تھا۔

ری سیپشن ڈیسک کے اُوپر پُوری دیوار کو ڈھکتا ہوا خانہ کعبہ کا ایک جہازی پوسٹر
تھا.... یہ کھٹمنڈو کی دُنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا تھا۔

ہال نما ریستوران کے آخر میں تازہ اور گرم روٹی کی خوشبو جنم لیتی تھی اور یہ
مہک ایسے اُٹھتی تھی کہ ہمیں اس جہان سے اُٹھاتی تھی' ایک بڑی میز کے گرد کھائی جانے
والی خوراک کے چکنائی سے ٹھنڈے ہوتے برتنوں اور پلیٹوں کے سامنے چند نیپالی اپنی
ٹوپیاں بار بار درست کرتے جانے کسی موضوع پر گرم گرم بحث کر رہے تھے....

ریستوران کا مالک ایک مڈل ایج سیاہ مونچھوں اور قدرے چپٹی ناک والا شخص
تھا.... مین نے اپنی پارٹی کا تعارف کروایا اور اُس سے پُوچھا کہ وہ کون ہے....

"مسلمان ہے الحمد للہ...."

میں نے اُس سے یہ پُوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ کونسا مسلمان ہے.... شیعہ ہے
سنّی ہے' وہابی ہے' دیوبندی ہے.... اور کیا وہ رفع یزدین کہتا ہے یا نہیں.... "آپ کہاں
ہے؟"

"صاحب میں تبت کا مسلمان ہوں.... سید امان نام ہے۔ ادھر نیپالی مسجد کے ایک
کونے میں یہ ہوٹل بناتا ہوں۔ کشمیری بھائیوں سے کھانا پکانا سیکھتا ہوں.... تنور لگایا ہے اور
گرم گرم روٹی بناتا ہوں.... لیکن ادھر پاکستانی بھائی تو نہیں ہوتا.... جو ہوتا ہے وہ ادھر کچھ
مال لاتا ہے اچھا نہیں ہوتا تو آپ کدھر سے آگیا؟"

"شاہ جی۔ ہم کفر اور الحاد اور جھٹکے کی مُرغیوں اور حرام گوشت سے تنگ آکر
ادھر آگیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کھانے کو کیا ملے گا؟"

"صاحب مُجھے تو اتنا خوشی ہے کہ میرے پاس بھائی آیا ہے۔ بہن آیا ہے' آپ
مجھ پر اعتبار کرو جو کھلائے گا انشاء اللہ اچھا کھلائے گا...." وہ تبتی سید شکل سے ایک بلتی
بھی ہو سکتا تھا.... مانسہرہ وادی کا باشندہ بھی ہو سکتا تھا.... "آپ مجھ پر اعتبار کریں"

"کرلیا...." سُنہری بابا نے کہا۔ "لیکن آپ کا فوڈ کتنی آئی سی کا ہو گا؟"

"آپ بھُول جاؤ صاحب.... زیادہ نہیں ہو گا۔"

"پھر بھی کیا کھلائے گا؟" اور یہ سوال قطعی طور پر بیہودہ تھا کیونکہ ہم بھوک کی
اُس حالت میں تھے کہ وہ اگر کہتا کہ صاحب لحم سگاں ہے.... کوفتہ ہائے بلیاں ہے تب بھی

ہم درگذر کرتے' اور کہتے کہ لے آؤ....

"صاحب تندوری چکن تو ختم ہو گیا.... آپ بہت دیر سے آئے ہو.... دال مکھن
ہو گا' آلو قیمہ ہو گا' چکن کشمیری ہو گا.... گوشت بھنا ہوا ہو گا.... تندور کا روٹی ہو گا...."

اور جُوں جُوں وہ تبتی شاہ صاحب ان خوراکوں کا نام لیتے تھے تُوں تُوں ہر شخص
کے گلے میں اُس خوراک کے ذائقے کا ایک ایک گھونٹ اُترتا تھا۔

تندور کی روٹی ہم تک گرم پہنچتی تھی.... ایسے کہ ایک نیپالی مسلمان بچہ اپنی
دونوں ہتھیلیاں پھیلائے روٹی اُن پر رکھے اُس کی جلن سے بچنے کے لئے اُسے اُچھالتا ہوا
ہماری میز تک آتا تھا اور پھر لوٹ جاتا تھا.... پیاز اور سبز مرچیں بھی تھیں۔ کوئی تبتی چٹنی
بھی تھی۔ سفید چاول بھی تھے.... اور تمام ڈشز جن کے لئے ہم نے تبتی شاہ صاحب پر
اعتبار کیا تھا ایسی خوش ذائقہ اور مزیدار تھیں کہ ہم سولتی ہوٹل کی خوراک کی ساری
بدمزگی بھُول گئے.... ہم نے سیر ہو کر کھایا.... بلکہ مختصر سیر نہیں ہم سب ایک لمبی سیر پر نکل
گئے۔

"تارڑ صاحب.... میں آج پشاور کی نمک منڈی کے شنواری تکوں اور بخشو کے
کبابوں کو بھُول گیا ہوں۔"

"اور میں میکلوڈ روڈ کی چانپوں اور گُردوں کپوروں کو فراموش کرگیا ہوں۔"

"اور تارڑ صاحب.... میں تو کھٹمنڈو شہر کی تمامتر شاپنگ کو بھُول گئی ہوں۔"

اور ہم سراسر ایک اچانک گھبراہٹ اور تعجب میں آگئے کہ خالدہ گمشدہ بھی ہم
میں ہیں۔ اور وہ تھی.... اور ملک صاحب بھی تھے۔

جب ہم نیپالی مسجد کی جانب اپنے کشمیری بھائیوں کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے
تھے تو سامنے سے نیم تاریکی میں سے دو افراد ٹہلتے ہوئے نمودار ہوئے۔

"آپ کہاں گُم ہو گئے تھے؟" اُنہوں نے ہم سے.... یعنی ہم سے دریافت کیا تھا۔

"تارڑ صاحب ہم تو بہت پریشان ہو گئے تھے" خالدہ گمشدہ نے سرگوشی کی اور
گلاب کے درمیان دیوی کے مندر کے بجھتے دیوں کے عین سامنے کی "آپ ہمارے
گروپ میں سب سے برگزیدہ.... پتہ نہیں یہ لفظ صحیح بھی ہے یا نہیں.... یا شاید بزرگ
شخصیت کہنا چاہئے تو ہم آپ کے بارے میں فکر مند تھے کہ کہیں خدانخواستہ.... کسی دیوں

وغیرہ کو دیکھ کر آپ کو کچھ ہو نہ گیا ہو.... کہاں تھے آپ....."

"جہاں فاروق، ہمشیرہ صاحبہ اور سُنہری بابا تھے....."

"اُن کو بھی آپ نے اپنے ساتھ گُم کر لیا۔" گمشدہ نے سادگی سے کہا۔ اور اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا.... "انا پورنا کے مندر کے بعد ایک دوراہا آیا تھا.... تو کچھ دیر کھڑے رہے کہ پتہ نہیں آپ نے کونسا راستہ اختیار کیا ہے اور پھر دائیں جانب چلے گئے....."

"اِن کو اُدھر ایک نیپالی گڑیوں کی دوکان نظر آگئی تھی...." ملک صاحب بے چارگی سے بولے۔ "پھر ہم چلتے چلتے گئے اور یہ تالاب نظر آیا تو اس کے کنارے کنارے چلتے گئے تو آپ سامنے سے آگئے...."

چنانچہ گمشدہ اور ملک صاحب اب ہمارے درمیان موجود تھے۔

اس مسلمان خوراک نے ہمیں عجیب مست کر دیا بلکہ تھوڑا سا الست بھی کر دیا.... اگرچہ نصرت فتح علی خان تو یہی الاپتا تھا کہ یہ جو ہلکا ہلکا سا سرور ہے' یہ تری نظر کا قصور ہے.... لیکن ہمارے تن بدن میں جو اُس شام سرور تھا یہ تبتی شاہ جی کی خوراک کا قصور تھا....

اس سرور سے میں ایک مرتبہ پھر فلیش بیک میں چلا گیا....

جب انگلستان میں پُورا ہفتہ میں اپنی لینڈلیڈی کی بنائی ہوئی.... ایپل پائی' روسٹ بیف' کڈنی پائی اور یارکشائر پڈنگ کھا کھا کر موجود محبتوں سے بھی بیزار ہو جاتا تھا اور ویک اینڈ پر لنڈن کا ٹکٹ کٹا لیتا تھا۔ پکاڈلی سرکس کی قربت میں ایک پاکستانی ریستوران "کوہ نُور" نام کا ہوا کرتا تھا.... میں وہاں ناشتے کے بغیر' لنچ کے بغیر تقریباً تین بجے پہنچتا اور اپنا مختصر آرڈر ویٹر کے گوش گذار کر دیتا.... دو تندوری چکن پراٹھے' ایک ڈش مٹر پلاؤ، ایک قیمہ' بھنا گوشت اور دال ماش.... سلاد اور مشروبات کے علاوہ.... پہلی بار ویٹر نے جب کچھ تاخیر کر دی تو میرے سرزنش کرنے پر بولا "صاحب آپ کا دوسرا گیسٹ آجائے گا تو گرم گرم لے آئے گا" اس پر میں نے بولا "میں واحد گیسٹ ہوں۔ لے آؤ" یہ پاکستانی خوراک کھانے کے بعد جب میں لنڈن کی شام میں نکلتا تو ایک مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا نکلتا.... راہ گیر یہی سمجھتے کہ میں مکمل طور پر "ٹُن" ہوں....

تو آج بھی اُسی کیفیت کا ایکشن ری پلے ہو رہا تھا۔

ہم نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہماری زندگی ہے۔ ہم نیپال میں قیام پذیر ہیں.... جب تک ہم اِس ہوٹل تاج کے پجاری رہیں گے....

کھانے کے بعد قہوہ آیا اور اُس سے فارغ ہو کر جب پُوری ٹیم اُونگھنے کے مُوڈ میں تھی میں نے تبتی سیّد کو بلایا اور ذرا ہولے سے پُوچھا "سیّد بادشاہ یقین کیجئے کہ آج سے پیشتر مجھے کبھی شائبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ تبت میں بھی سیّد ہوتے ہیں.... تو یہاں کھٹمنڈو میں.... کہیں مغل شہزادی حضرت محل کی قبر ہے.... آپ جانتے ہیں کہ کہاں ہے؟...."

سیّد بادشاہ میرا خیال ہے اُونچا سنتے تھے.... کان پر ہاتھ رکھ کر بولے "ہاں جی ہم یہاں بہت خوش ہیں.... مسلمان ادھر نیپال میں صرف پانچ فیصد ہیں لیکن امن آشتی سے رہتے ہیں.... پچھلے برس تھوڑا سا ہندو مسلم فساد ہوا تھا لیکن حکومت نے بہت سختی سے اپنے لوگوں کو دبا دیا.... اب دیکھیں ناں ادھر اس روڈ پر دو مسجدیں ہیں.... نیپالی اور کشمیری.... لیکن کبھی بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ ان کے سامنے یا پہلو میں کوئی مندر بنایا جائے.... حکومت نے بھی منع کر رکھا ہے کہ یہ مسلمان لوگوں کا علاقہ ہے ان کو اپنے خدا کی پرستش کرنے دو.... یہ نیپالی لوگ امن اور آشتی سے رہتے ہیں جناب...."

"ہم بھی رہتے ہیں...." میں نے فوراً کہا "صرف یہ ہے کہ ہم ننکانہ صاحب میں گوردوارہ جنم استھان کے عین سامنے.... جہاں سکھوں کے بابا نانک کا جنم ہوا تھا اُس کے سامنے...."

"تارڑ صاحب ایک تو ہم آپ کے اس سکھ کامپلیکس سے بہت عاجز آ چکے ہیں...." ہمشیرہ نے نہایت ناپسندیدگی سے کہا۔ حالانکہ موصوفہ میرے حصے کی مکھن دال بھی نوش کر چکی تھیں۔

"میری بات تو سُن لیجئے ہمشیرہ۔"

"سنتے ہیں۔" اُنہوں نے بیزار ہو کر کہا۔

"تو ہم اُس گوردوارے کے عین سامنے جہاں اُن کے پیغمبر کا ورود ہوا تھا ایک عالی شان مسجد ضرور تعمیر کرتے ہیں تاکہ اُن کافروں کے کانوں تک پیغام توحید ضرور پہنچے۔"

"تو پہنچتا ہے؟"

"نہیں۔"

"لاؤڈ سپیکر کے بغیر پہنچاتے ہوں گے۔"

"نہیں...."

"تو پھر کیوں نہیں پہنچتا؟"

"کیونکہ وہ ہماری نسبت کہیں زیادہ توحید پرست ہیں.... بلکہ اس معاملے میں اتنے بنیاد پرست واقع ہوتے ہیں کہ اپنی عبادت گاہ میں سوائے ایک گرنتھ صاحب کے کوئی بت' کوئی تصویر کوئی شبیہہ نہیں رکھتے۔"

"واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"اس لئے کہ آپ اپنے بیچ سے باہر نکل کر کبھی یہ نہیں کہتیں کہ ذرا ادھر بھی جھانک لیتے ہیں۔"

تبتی شاہ جی ذرا پریشان ہوگئے کہ ہم کدھر سے کدھر نکل گئے ہیں۔

تو میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال بہ آوازِ بلند دوہرایا "ادھر کہیں اِس شہر میں ایک مغل شہزادی کی قبر ہے.... حضرت محل.... جس نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی.... آپ جانتے ہیں کہ کہاں ہے؟"

"اچھا شہزادی صاحبہ کی قبر...." شاہ جی نے سر ہلایا "آپ جن سیڑھیوں سے اُتر کر ہوٹل میں آئے ہیں وہاں دُوسری سیڑھی کے برابر میں ایک آہنی جنگلا ہے.... اُس کے اندر ہے.... شہزادی صاحبہ نے جنگ لڑی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے قہوے کا آخری گھونٹ بھرا۔ ایک سگریٹ پیا اور اُٹھ کھڑا ہوا.... کسی نے بھی یہ نہ پُوچھا کہ کدھر جاتے ہو....

باہر تاج ہوٹل کی سیڑھیوں کے برابر میں ایک لوہے کا گیٹ رات کی تاریکی میں بمشکل دکھائی دیتا تھا۔

نائیلون کی ایک بوسیدہ رسّی اُسے بند رہنے پر مجبور کرتی تھی۔

کھٹمنڈو کی سیاہ رات میں.... جو اُس مہاتما بُدھ کے بدن کی طرح سیاہ تھی جسے ایک پجاری ریگ مال سے چمکاتا تھا۔ دھوکا دربار اور لونگ گاڈیس کی نگری میں۔ جگن

ناتھ مندر کے چوبی مجسموں کی اُس ہوا میں جس میں وہ جنسی سانس لیتے تھے.... جہاں کوئی امکان نہ تھا آلِ تیمور کے خاک ہونے کا.... شب کی تاریکی میں.... ایک نائیلون کی رسّی کو میں نے کھولا.... آہنی ہینڈل کو زور لگا کر آزاد کیا تو وہ دروازہ یُوں آہستگی سے کھلا جیسے بڑے ہی لمس کا منتظر تھا۔

یہاں اس لئے شب کی سیاہی تھی کہ شب تھی۔ بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے.... مزار کے اُوپر ایک بلند دیوار اُٹھتی تھی۔

دیوار پر ایک ہیئر ڈریسر.... ایک بیوٹی سیلون اور ایک ٹریول ایجنسی کے بورڈ اعلان کرتے تھے.... بیسٹ ہیئر ڈریسنگ اِن کھٹمنڈو.... بیوٹی فائی یور سیلف.... ٹریول اِن نیپال....

اور اُن کے نیچے.... جب آہنی دروازہ وا ہوا اور میں اندر گیا تو صرف ایک قبر تھی.... کھٹمنڈو نائٹ میں گھری ہوئی....

اُس کے گرد دو چبوترے تھے اُس کا احاطہ کرتے ہوئے جن پر وِنکا روزیا یعنی سدا بہار کے پودوں کے گملے دھرے تھے.... پژمردہ اور بے رُوح.... سدا بہار کا پھول دراصل پھول کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ یہ بہار کا ایک بہانہ ہے ایک مفاہمت ہے.... پھول ہمیشہ وہی خوبصورت ہوتا ہے جس کی زندگی چند روزہ ہو.... قبر کے سرہانے ایک کتبہ بھی تھا جو تاریکی میں کم دکھتا تھا اور اُس پر جو کچھ درج تھا وہ مٹ چکا تھا.... پڑھا نہیں جاتا تھا.... حضرت محل کی قبر دیکھ کر مجھے افسوس نہیں ہوا.... کیونکہ میں بہت سی ایسی قبریں دیکھ چکا تھا جو اپنی عظمت اور جلال کا اعلان نہیں کرتیں.... بلکہ پوشیدہ رہنا چاہتی ہیں۔ دمشق میں صلاح الدین ایوبی کی قبر.... جامع اُمیہ کے پہلو میں نہایت سادہ اور گوشہ نشیں ہے.... دمشق ہی کے قبرستان باب الصغیر میں حضرت بلال حبشی ایک سادہ آرام گاہ میں خاک نشیں ہیں' وہاں اُمت المومنین کے مدفن بھی ہیں اور کربلا کے شہداء کے بھی.... فلارنس میں مَیں مائیکل انجلو کی قبر پر انجانے میں بیٹھ گیا تھا۔ دارا شکوہ کی بیگم نادرہ بیگم حضرت میاں میر کے مزار کے سامنے دفن ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔ کابل میں بابر کی قبر کی کوئی توقیر نہیں....

لیکن اس کے باوجود.... آپ بے شک دُنیا کے بہترین ماہر تعمیرات سے عالی شان مقبرہ تعمیر کروالیں.... تاریخ کا ایک اپنا مقبرہ ہوتا ہے....

هر خاک نشیں کا حساب کتاب ہوتا رہتا ہے۔
وہ بے شک کسی تاج محل میں دفن ہو جائے یا کھٹمنڈو کے تاج ہوٹل کے ایک
کونے میں' اُس کا حساب کتاب تاریخ کرتی رہتی ہے.... اُس کے کھاتے میں نفع نقصان
اندراج ہوتا رہتا ہے۔ قبروں کی عظمت یا سادگی یا گمشدگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا.... کو
جانتا ہے کہ ارسطو کہاں ہے.... ہومر کی قبر کہاں ہے.... اور قلوپطرہ کہاں دفن ہے....
اردو ادب کے ایک معتبر نقاد مظفر علی سید نے کھٹمنڈو یاترا سے پیشتر... اپنے کینسر
زدہ بدن سے مختصر سانس کھینچتے ہوئے کہا تھا.... تم حضرت محل کی قبر پر ضرور جانا....
تو میں نے عرض کیا تھا.... شاہ جی اگر میں وہاں تک پہنچتا ہوں تو وہی دیکھوں گا جو
دُوسرے دیکھتے ہیں' ایک قبر کے سوا کیا دیکھوں گا۔
تو اُن کی شرارت بھری آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی تھی.... مجھے یقین ہے
کہ تم کچھ اور دیکھو گے....
اور وہ کچھ اور کیا تھا....
حضرت محل کی قبر کے درمیانی مستطیل کچے حصے میں سے اُبھرتا ہوا ایک ناقابل
یقین حد تک نیپال نگری کی رات میں بلند ہوتا ہوا سرو کا ایک درخت....
ٹیڑھا اور قدرے خشک ٹہنیوں والا سرو کا درخت....
کسی بھی قبر کی مٹی میں سدا بہار کے بے معنی پھول لگائے جاسکتے ہیں.... اُس کی
کچی مٹی جب بارشوں سے بیٹھتی ہے تو کسی بھی قبر پر خودرو بدنما گھاس سر اُٹھا سکتی ہے۔
نامعلوم جھاڑیوں کے بیج پھوٹ سکتے ہیں.... ببول کے پودے اُگ سکتے ہیں لیکن.... ایک
سرو کا درخت وہاں کیسے اُگ آیا.... حضرت محل کے سینے میں جڑیں پھیلائے اور یہ جڑیں
فرغانہ تک جاتی تھیں ایک سرو کا ٹیڑھا ترچھا درخت تھا جو کھٹمنڈو کی ملگجی شب میں.... جس
میں ایک پجاری مہاتما بُدھ کے مجسّمے چمکاتا تھا اور اناپورنا دیوی کے مندر کی گھنٹیاں بجتی
تھیں اور حضرت محل کی قبر کے پار سڑک کے دُوسرے کنارے سے وہ تالاب شروع ہوتا
تھا جس میں نامعلوم دیوی کے چرنوں میں چراغ جلتے تھے اور ادھر نئے چراغ.... وہ سرو
یوں بلند ہوتا تھا جیسے عرش پر دستک دینے کو جاتا ہے.... فریاد کرتا ہے کہ میں تجھ تک پہنچ
نہیں سکتا کہ میرے راستے کو ایک ہیئر ڈریسر' ایک بیوٹی سیلون اور ایک ٹریول ایجنسی کے

پہنچنے سے روکتے ہیں۔ میں جس کے نسوانی ڈھانچے میں جڑیں پھیلائے بلند ہوتا ہوں اُس نے
جنگِ آزادی میں انگریزوں کا سامنا بے جگری سے کیا تھا.... اُن کے آگے ہتھیار نہیں
ڈالے تھے اور لڑتی ہوئی لکھنؤ سے نیپال کے ترائی کے جنگلوں میں اُتر گئی تھی.... اور
ہے خدا نے میری لاج رکھ لی تھی اور وطن سے دُور مارا تھا....
سڑک کے پاس تالاب کی دیوی کے چرنوں میں چراغ جلتے تھے.... اور اِدھر لکھنؤ
کی شہزادی کی قبر پر.... نئے چراغ.... نئے گلے.... بس ایک سرو کا درخت....
تاریکی میں ہمشیرہ اور گمشدہ بھی میرے برابر میں آکھڑی ہوئیں اور فاتحہ کے لئے
ہاتھ بلند کئے.... جو اُس سرو سے بلند نہیں ہوسکتے تھے جو حضرت محل کے سینے میں سے بلند
ہوا تھا....
خاک میں جو صورتیں تھیں وہ لالہ و گل میں نہیں ایک سرو کے قد میں نمایاں ہو
گئی تھیں....

"دربار مرگ... شراب حاضر کباب غائب"

الیگزانڈر سولژے نتسن کا ناولٹ "اے ڈے اِن دی لائف آف آئیوان ڈینسوچ" مجھے بے حد پسند ہے.... اور میں نے اسے بنیاد بنا کر ایک کہانی "غلام دین عرف آئیون ڈینسوچ" بھی تحریر کی تھی....

یہ ایک اوپن ایئر قید خانے میں بند ایک قیدی کا روزنامچہ ہے کہ صبح بیدار ہو کر رات سونے تک وہ کن کٹھن کلفتوں میں سے گذرتا ہے.... اور یہ ناولٹ مجھے پسند اس لئے ہے کہ آئیون کا شیڈیول اور روزمرہ کی زندگی ہوبہو وہی ہے جو ہمارے معاشرے میں کسی بھی حلال کی روزی کمانے والے شخص کی ہوتی ہے۔ وہ بھی خاندان' روزی روزگار اور معاشرے کے اصولوں کی قید میں ہوتا ہے' وہ اس خاص شیڈیول کے مطابق جکڑا ہوا زندگی بسر کرتا چلا جاتا ہے۔

کھٹمنڈو کانفرنس بھی ایک ایسا ہی قید خانہ تھا اگرچہ ہوٹل سولتی کی دُنیا کی بہترین سہولتوں میں تھا جس میں ہم ایک لگے بندھے شیڈیول کے مطابق زندگی بسر کرتے چلے جاتے تھے....

نیپالی سفید کمر والی چیتا حسینہ رُوپا گورے آقاؤں سے بڑھ بڑھ کر گوری ہو رہی تھی....

میری این.... حسب سابق اپنے حنوط شدہ چہرے کے ساتھ.... بلا بلا.... بولے چلے جا رہی تھی....

کرپچن.... جس کا بھید ہم جان چکے تھے' کوئی ایک نظر اُس پر کرتا تھا' جو تیری ہے کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ' نظر ہوتی تھی۔

دیپتی' اُوشا اور پرکاش نہایت اَن تھک اور اپنے اپنے عجیب لہجوں میں انگریزی مسلسل بولتے تھے....

مسعود.... طالبان کے افغانستان کا مسعود اپنی نوجوان ریش میں ملبوس اپنے ایمان کو سلامت رکھنے کے لئے خواتین کی جانب آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

بنگلہ دیشی خواتین اپنے سر جوڑے.... سرگوشیاں کرتی تھیں.... بلکہ سروں کے جوڑے جوڑے سرگوشیاں کرتی تھیں....

پونی ٹیل والا نیپالی کیمرہ مین اور ہدایت کار.... دینپدرہ گاوچن اپنے مستقبل کے رزق کے لئے کرپچن کو متاثر کرنے کی کوشش میں تھا۔

اور وہاں ایک خاتون.... نیپال میں ہی تعینات تھیں.... شاید امریکن تھیں.... این سکاٹ وِٹ نام کی تھیں.... نہایت بے ضرر اور نفیس خاتون تھیں لیکن گھوڑا خاتون تھیں.... میں بدتمیزی اور بے ادبی کو بُرا سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں کہ میرا مشاہدہ ہے' ہم میں سے بیشتر لوگ اگر ہم غور کریں تو کسی نہ کسی جانور سے مشابہت رکھتے ہیں.... یہ مشابہت بہت خفیف بھی ہوسکتی ہے اور روشن اور چونکا دینے والی بھی.... مثلاً میں ان دنوں آئینے میں اپنی شکل پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک غصیلے بُل ڈوگ کو دیکھ رہا ہوں.... "کاماسترا" کے مصنف واتسیایانہ نے ہزاروں برس پیشتر عورتوں کی تین اقسام گنوائی تھیں.... ہرنی عورتیں' ہتھنی عورتیں اور گھوڑی عورتیں.... اگر آج وہ این سکاٹ وِٹ کو دیکھ لیتا تو اُن میں گھوڑا عورتیں کی ایک قسم بھی شامل کر لیتا.... میں بہت شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اُس کی جانب دیکھتا تھا تو وہ مجھے ہنہناتی ہوئی لگتی تھی....

اور پاکستانی وفد کیا کر رہا تھا اس نیپالی پرزن کیمپ میں....

ملک صاحب ہم سب پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ ہم شرافت اور گوری تہذیب کے دائرے میں رہیں اور تنقید سے پرہیز کریں۔

فاروق.... مونچھیں سنوارتا تھا.... اور تب زیادہ سنوارتا تھا جب وہ چیتا خاتون رُوپا

بولتی تھی.... ہمشیرہ بہت دیر تک اپنا نکتہ نظر بیان کرنے کی کوشش اور اجازت میں ایک ناتواں سا ہاتھ بلند کرتی تھیں اور ہیڈ ماسٹر کرپچن یہ سمجھتا تھا کہ وہ پہلو بدل رہی ہیں۔ ہمشیرہ کو بولنے کا موقع نہ ملا تو وہ باقاعدہ خفا ہو گئیں....

میں بھی بہت دیر تک.... ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے.... چُپ بیٹھا تماشہ دیکھتا رہا تو جانے ہیڈ ماسٹر کو میرا خیال کیسے آگیا "مسٹر تارڑ آپ کیوں نہیں بول رہے؟"

"ہر کانفرنس میں کم از کم ایک صابر و شاکر سامع بھی تو ہونا چاہئے اور وہ میں ہوں.... آپ لوگ چُپ کریں گے تو میں بولوں گا ناں...."

خالدہ سرگوشی.... گمشدہ ہو چکی تھیں.... وہ چپکے سے کھسک گئی تھیں اور جانے کہاں بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔

اگرچہ آغاز سے اب تک ایک غیر تحریری اصول کے مطابق کانفرنس ہال میں "نو سموکنگ" پر عمل درآمد ہو رہا تھا لیکن میں نے.... صرف اپنی سرکشی کے مظاہرے کے طور پر ایک سگریٹ سلگایا اور اُس کا دھواں دُور تک پھیلایا تاکہ دیگر مندوبین "غیر متحرک سگریٹ نوشی" کی زد میں آکر بھلے کینسر کا شکار ہو جائیں۔

فاروق نے میری جانب مسکرا کر تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی جیب میں سے اُس پیکٹ کو آزاد کیا جو قید تنہائی سے تنگ آچکا تھا....

میری این نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور میں نے اُسی سرکشی کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ جو کرنا ہے کر لو.... لیکن وہ کیا کر سکتی تھی.... اگر وہ مُجھے تنہا اور برہنہ کسی تاریک بارشوں والے گھنے جنگل میں بھی مل جاتی تو میں اُس کی بجائے کسی نزدیک ترین درخت کے تنے کو آغوش میں لے لیتا....

اور کانفرنس ہال کے باہر وینیشن بلائنڈز کے پار میرے وہ تینوں دوست سُرخ اور سفید لپ سٹک کے بوسوں سے لتھڑے ہوئے چیری کے درخت مجھ پر لعن طعن کرتے تھے.... مجھ پر تبرا بھیجتے تھے....

مجھ آئیون ڈےنسوچ کو فرار ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

سیشن کا اختتام ہوا....

قیدیوں نے اپنی کلائیوں میں جکڑی ہوئی تہذیب اور شائستگی کی بیڑیوں سے اپنے آپ کو آزاد کیا.... اپنے پَر کھولے.... جو بدنوں سے چپک چکے تھے.... پرندے جو اپنی اُڑان بھول چکے تھے.... اپنا آسمان بھول چکے تھے....

جو کھٹمنڈو کے اُن گوشوں پر اُترنے کے لئے بے چین تھے جو اب تک اُن کی اُڑان سے باہر تھے....

سُنہری بابا.... ایک احتیاط پسند پرندہ تھے.... جو آفیشل اُڑان کرتے تھے اور اَن آفیشلی بہت کچھ کر گزرتے تھے....

فاروق.... لہو گرم کرنے کا ہے اِک بہانہ والے پرندے تھے....

ہمشیرہ صاحبہ.... ایک نہایت مدبر.... اندر سے ہوشیار اور کائیاں.... ایک بار بار آنکھیں جھپکنے والا پرندہ تھیں۔

ملک.... گوروں کے جال میں جکڑے ہوئے ایک برڈ تھے.... جو بے بس اور روٹھے ہوئے تھے۔ اور گمشدہ.... ایک ایسی بلبل جو صرف اُس ٹہنی پر بیٹھتی تھیں جہاں اطمینان سے "راگ شاپنگ" گا سکے....

اور ان کے سوا مَیں.... جو اپنی راکھ میں جل کر ققنس نہیں ہو سکتا تھا.... راکھ ہی ہوتا تھا۔ جس کے پر جھڑ چکے تھے اور اُس میں ہوس ہی ہوس تھی.... زندگی کی.... شاہ لوری کی اور اناپُورنا کی.... اُس کی چونچ ڈھیلی ہو چکی تھی اور اس کے باوجود وہ چگنا چاہتا تھا.... اُسے معلوم تھا کہ وہ دن قریب آرہے ہیں جب وہ ایک ایسی جھیل کا رُخ کرے گا جہاں پرندے مرنے کے لئے آجاتے ہیں۔

اور پاروشنی اُس کے مُردہ بدن کو اُٹھا کر کہے گی' اور اُس کی چونچ میں پانی ڈالتے ہوئے کہے گی "تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لئے آگئے ہو....؟"

پرندہ کوئی جواب نہ دے گا' وہ مر چکا ہو گا....

میں' وہی پرندہ تھا۔

شام کے لئے منصوبہ بندی ہو رہی تھی....

"تارڑ صاحب.... نکل چلیں" گمشدہ نے ایک پیاسی اور خوفزدہ فاختہ کی طرح

فریاد کی....

"ذرا باہر جھانک لینے میں کیا حرج ہے...." ہمشیرہ صاحبہ گویا ہوگئیں۔

"شاہ جی...." فاروق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا.... اور اُس کی آنکھیں ہمیشہ فروغِ مے سے چراغاں لگتی تھیں "بلکہ سَر جی جوانی بوسیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے تو ذرا کھٹمنڈو بائی نائٹ ہی دکھا دیں۔"

"کیوں میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کھٹمنڈو بائی نائٹ دکھانے کا.... میں بھی آپ کی طرح پہلی بار یہاں آیا ہوں...."

"لیکن سَر جی تجربہ بڑی چیز ہے.... آپ ہمارے گروپ کے گُرگ بزرگ ہیں ہمیں راستہ دکھائیں بابا جی...."

میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سکول ایج کے زمانے میں' ٹین ایج کے دنوں میں.... میرے جو کلاس فیلو تھے وہ اگر تب ذی شعور اور دانا تھے تو اب بزرگ ہو کر اُن کی دانائی مستحکم ہو گئی تھی۔ اور اگر تب وہ احمق اور اُلو کے پٹھے تھے تو ایک دو استثنا کے علاوہ بزرگی تک پہنچ کر وہ جوں کے توں تھے عُمر اور تجربہ اُنہیں بگاڑ نہیں سکا تھا تو بہت سارے بزرگوں نے شدید "مائنڈ" کیا تھا.... تو یہ بزرگی بھی ایک عجیب لبادہ ہے جس میں آپ کی تمام تر حماقت اور کم علمی پوشیدہ ہو جاتی ہے.... اور آپ کو صرف سفید بالوں کی وجہ سے وعظ کرنے کا حق مل جاتا ہے....

میں اگرچہ گُرگ بزرگ ہو چکا تھا.... لیکن.... مجھے تجربے نے نہیں.... صرف عُمر نے بزرگ کر دیا تھا۔

"سَر جی...." فاروق کہہ رہا تھا "پتہ نہیں اس کھٹمنڈو نائٹ میں ہمارے لئے کیا کیا تحفے ہیں جو خوبصورت لباسوں میں بند ہیں اور ہم بند قبا کھول نہیں رہے آپ نے وہ شعر تو سُنا ہو گا کہ....

تھی حیا مانع فقط بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا.... ایسا کھلا

ظاہر ہے فاروق نے یہ شعر.... ایک ایسی سرگوشی میں بیان کیا جو برابر میں بیٹھی گمشدہ سرگوشی کے کانوں تک نہ پہنچا....

"جی تو تارڑ صاحب.... کدھر چلنا ہے...." سُنہری بابا اپنی داڑھی سنوارنے لگے "میں ذرا موقع محل کی مناسبت سے مناسب ڈریس زیب تن کر آؤں...."

"ابھی پٹن باقی رہ گیا ہے جو دھوکا دربار کے بعد کھٹمنڈو کا سب سے بڑا ٹیمپل کمپلیکس ہے۔"

"وہ پھر کبھی دیکھ لیں گے "ہمشیرہ نہایت بیزار ہو کر بولیں" مندر وغیرہ بہت ہو چکے۔"

"تو پھر ہم ٹورسٹوں کے گڑھ.... کھٹمنڈو کے سب سے رونقی علاقے تھمل میں چلتے ہیں۔"

"یہ.... حمل کیا جگہ ہے...." سُنہری بابا نے خواتین کی موجودگی کا ذرہ بھر احساس نہ کیا۔

"سَر یہ تھمل ہے.... حمل نہیں...."

"Indeed...." اُنہوں نے کہا....

"لیکن ابھی ہم کانفرنس سے فارغ ہوئے ہیں.... تھکے ہوئے ہیں' تو آج کی آوارہ گردی تو منحصر ہے اس بات پر کہ آپ اپنے اپنے کمروں میں جا کر کتنی دیر کے بعد فریش ہو کر نکلتے ہیں...."

"کس کے ساتھ فریش ہو کر...." فاروق ہنسنے لگا.... اور پھر ہمشیرہ کی قہر آلود نظروں کی تاب نہ لا کر لبوں کو بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

"پلیز آپ زیادہ فریش نہ ہوں...." میں نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی "دراصل آج کے پروگرام کا انحصار ہے آپ کے بننے سنورنے اور پھر لابی میں اُترنے کے وقت پر...."

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے تارڑ صاحب...." تھکی ہوئی گمشدہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اپنی بھاری پلکیں بھی نہیں اُٹھا سکتی تھی....

"میرا تو یہ خیال ہے کہ ہم باہر نکلیں.... زیادہ سامان اُٹھانے کی ضرورت نہیں صرف ایک ایک ٹوتھ بُرش جیب میں ڈالیں.... ڈالر تو ہماری جیبوں میں پہلے سے موجود ہیں اور دو ٹیکسیوں میں سوار ہو کر نگر کوٹ کے لئے روانہ ہو جائیں' ڈیڑھ گھنٹے میں ہم

وہاں ہوں گے.... کسی نیپالی ہوٹل میں قیام کریں' آج کی شب نگر کوٹ کے پہاڑی بازار میں دیگر سیاحوں کے ہمراہ چہل قدمی کریں اور کل سویرے.... طلوع آفتاب اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں ماؤنٹ ایورسٹ پر.... اناپورنا اور کشور ہندوستان کی برفانی زنجیر پر اور ناشتے کے فوراً بعد ہم نو بجے تک اِس عقوبت خانے میں لوٹ آئیں.... کیا خیال ہے؟"

"تارڑ صاحب ہاتھ ملائیں...." ہمشیرہ کی نہ صرف آنکھیں چمکیں بلکہ عینک کے شیشے بھی جگمگانے لگے "بلکہ ہاتھ نہ ملائیں.... لیکن کیا زبردست آئیڈیا پیش کیا ہے.... میں چلی اپنا ٹوتھ برش لانے...."

"سر جی آپ بے شک مجھ سے ہاتھ ملائیں" فاروق جذباتی ہو گیا "بس جی ڈِنر ہوگیا.... ڈنر بھی نگر کوٹ میں ہی کریں گے...."

"وہاں کوئی شاپنگ ہوگی۔" گمشدہ نے ذرا افسردگی سے اور ذرا سہم کر پُوچھا۔

"وہاں ایورسٹ ہوگی خریدنے کے لئے۔ اناپورنا کی برفوں کا سودا بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے بیزار ہو کر کہا....

"ناراض کیوں ہوتے ہیں میں نے تو یُونہی پُوچھا تھا.... ٹھیک ہے نگر کوٹ چلتے ہیں"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ملک پتہ نہیں کہاں کس سوچ میں تھا یکدم بیدار ہو کر ہوشیار ہوگیا۔

"ہم نے کانفرنس بھگتا لی ہے بلکہ بُھگت لی ہے اب یہ شام ہماری ہے ہم جہاں جی چاہے جائیں.... کل نو بجے واپس پہنچ جائیں گے"

"نہیں سر آج شام تو آپ کہیں نہیں جاسکتے.... پُورے سات بجے یونیسف کے یورپی ڈائریکٹر کی جانب سے معزز مندوبین کے اعزاز میں ایک ریسپشن ہے.... ہمیں اٹینڈ کرنا ہے"

"آپ کو کرنا ہے۔" میں ذرا گرمی کھا گیا "ہمارا آپ کا معاہدہ صرف کانفرنس اٹینڈ کرنے کا ہے' دیگر لوازمات میں شریک ہونے کا نہیں ہے۔ یوں بھی اگر ہم اُس ریسپشن میں نہیں شامل ہوتے تو کون دیکھے گا۔"

"سر پلیز...." ملک نے اپنے بال درست کئے "آپ سب کا ہونا بے حد ضروری

ہے.... تارڑ صاحب پلیز آپ بقیہ ڈیلی گیشن کو قصے کہانیاں سُنا کر بدگمان نہ کریں.... اگر مجھ سے پوچھ لیا گیا کہ پاکستان وفد کہاں ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔"

"آپ کہہ دیجئے گا کہ وہ نگر کوٹ گئے ہیں ایورسٹ پر طلوع آفتاب دیکھنے...."

"پلیز سر.... ایسا نہ کریں میری جواب طلبی ہو جائے گی"

ہم سمجھتے تھے کہ ابھی ہم آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کو ہیں لیکن ملک کے دھیمے اور گذارشانہ لہجے نے ہمارے پَر کاٹ دیئے تھے.... اور اس کے ساتھ ہی ایورسٹ اور اناپورنا پر سورج کی پہلی کرنیں خواب ہوگئیں۔

اور جب پَر کٹ جائیں تو پرندہ پرواز کے قابل نہیں رہتا.... صرف پھڑک سکتا ہے۔

چنانچہ ہم پھڑکنے لگے "کیا ریسپشن پُورے سات بجے شروع ہو جائے گا.... خوشگوار گفتگو کا دورانیہ کتنا ہوگا اور کیا کھانا فوری طور پر شروع ہو جائے گا اور ہم اُس کے بعد نگر کوٹ نہ سہی کھٹمنڈو کی رات میں تو جاسکتے ہیں ناں؟"

"کیوں نہیں...." ملک نے نہایت یقین سے کہا "آپ لوگ آٹھ بجے تک فارغ ہو جائیں گے.... ویسے تارڑ صاحب کرپچن اور میری این کچھ دیر کے لئے اپنے آفس جا رہے ہیں کوئی میٹنگ وغیرہ کرنے کے لئے...."

"یہ آپ نے میٹنگ کہا ہے یا میٹنگ کہا ہے؟"

"میٹنگ سر...." ملک نے نہایت بھولپن سے جواب دیا "اگر آپ پسند کریں تو وہ آپ کو ساتھ لے جاسکتے ہیں اور دربار مرگ میں اُتار دیں گے.... ایک گھنٹے کے بعد پھر پک کرلیں گے اور ریسپشن کے وقت تک واپس لے آئیں گے"

"یہ دربار مرگ کیا ہے" میں نے پوچھا.... اور پوچھتے ہی افسوس ہوا اور میں نادم ہوا کیونکہ پچھلی شب ہم اِسی مرگ ناگہانی کے لئے خجل خوار ہوئے تھے۔

"کرپچن...." سلمان اپنے نیپالی باس سے ذرا فرینڈلی ہو کر مخاطب ہوا.... اور یہ کرپچن اس کانفرنس کے دوران یا تو میری این کو دیکھتا تھا اور یا یہ تذکرہ کرتا تھا کہ وہ "سیسمی سٹریٹ" ایسے لازوال ٹیلی ویژن پروگرام کے ساتھ متعلق رہ چکا ہے.... کس حیثیت میں؟ اس کی تفصیل سے وہ گریز کرتا تھا.... شاید تخلیقی سطح پر.... یا کیا پتہ ایک لائٹ

مین کی حیثیت سے.... "کرپجن.... یہ دربار مرگ کیا ہے؟"

"بیسٹ پیلس اِن ٹاؤن۔" اُس نے صرف اتنا کہا اور میری این کی طرف دیکھا.... میری این اُس کے دیکھنے سے کمپیوٹر کے رُوپ میں سے نکل کر فوراً عورت ہوگئی....

چنانچہ ہم تینوں کو.... خواتین اپنے اپنے کمروں کو جاچکی تھیں' اس لئے ہم تینوں کو.... دربار مرگ میں ڈراپ کر دیا گیا صرف ڈیڑھ گھنٹے کے لئے.... کہ آپ قیدی حضرات ذرا گھوم پھر لیں پھر آپ کو پک کر کے واپس ریسپشن اٹینڈ کرنے کے لئے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا....

ہمیں بہت حیرت ہوئی جب میری این کو بھی ہمارے ہمراہ اُتار دیا گیا۔ شاید میٹنگ کا پروگرام مؤخر کر دیا گیا تھا۔ اُس کے باوجود ہم تین ہی تھے.... مَیں' فاروق اور سُنہری بابا کیونکہ میری این سپر سپیشی تھی اور ہم میں شمار نہیں ہو سکتی تھی۔

دربار مرگ اس لئے دربار مرگ تھی کہ اس کے اختتام پر شاہ نیپال کا دربار نہیں پیلس تھا....

"میں نے یہاں ایک ونڈر فل بوتیک دریافت کی ہے" میری این ہم پر مہربان ہوگئی "میں نے اُسے چند ڈریسز کا آرڈر دیا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اُس کے ڈیزائن بہت مارولس ہیں"

وہ اب بھی کانفرنس ہال کی طرح ایک کمپیوٹر کی طرح اطلاعات فراہم کرتی تھی۔

"اور اِس بوتیک کے ریٹس کیسے ہیں؟"

"نیویارک کے مقابلے میں.... ڈرٹ چیپ...."

اگرچہ ایک اجنبی وادی میں پھیلے شہر میں.... ایورسٹ اور اناپورنا کے پہلے قدم کے شہر میں دربار مرگ میں جو شام اُترتی تھی.... شاہِ نیپال کا محل دُھند میں گُم ہوتا تھا اور "یاک اینڈ ییٹی ہوٹل" کے قمار خانے میں رونق اور روشنیاں تھیں اور یہ ایک ایسا ماحول تھا جس میں کسی بھی بت پرست کے لئے کالی دیوی کی پرستش بھی جائز ٹھہرتی تھی لیکن اس کے باوجود اس ماحول میں بھی مجال ہے کہ میری این کے چہرے پر کشش کی ایک کرن بھی پھوٹی ہو....

"تو آپ اُس بوتیک سے ہو کر آئیں ہم ذرا دربار مرگ کے اِس فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے ہیں اور رونق میلہ دیکھتے ہیں۔"

"شیور۔" اُس نے بھی ہم تینوں سے پیچھا چھڑانا مناسب جانا.... اگرچہ اُس کے "پیچھے" میں بھی کوئی دل کشی نہ تھی.... اُسے بھی کھٹمنڈو کی اس شب میں دربار مرگ کی اس دھندلاتی شام میں ہم تینوں کے چہرے ایک رندے ہوئے شہتیر کی طرح بے جان اور بے دل لگ رہے تھے.... وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم سے اِسی سپاٹ پر حاضر ہونے کا وعدہ لے کر چلی گئی۔

دربار مرگ میں شانتی بہت تھی....

جیسے یورپ کا باسی کراچی آتا ہے تو اُسے ہر شے.... سُست اور ٹھہری ہوئی لگتی ہے۔ کراچی کا رہنے والا لاہور آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ حرکت کیوں نہیں کرتے.... اسی طرح لاہور کا لہوریا جب دربار مرگ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے چار چفیرے نگاہ ڈالتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر جانب ایک خوابناک ٹھہراؤ ہے.... نہ ہارن چیختے ہیں' نہ لوگ غل مچاتے ہیں۔ نہ کوئی خواتین پر آوازیں کستا ہے اور نہ کسی نے کہیں جانا ہے اور نہ کسی نے کہیں سے آنا ہے.... ایک عجیب پُرامن یوسٹی سا ماحول ہے۔

اسی لئے دربار مرگ میں شانتی بہت تھی....

فاروق اور سُنہری بابا ایک ہینڈی کرافٹ کی دوکان میں گھس گئے اور میں ایک تنہا کیفیت کا لطف لینے کے لئے بے مقصد گھومنے لگا....

شاندار اور مہنگے ہوٹل' ایئر لائنز کے دفاتر.... بوتیکس' کورین' جاپانی' چینی اور تبتی ریستوران.... شراب خانے لیکن سب کے سب ایک ٹھہراؤ اور شانتی کے سکوت میں کوئی ہنگامہ نہیں.... کوئی شور وغل نہیں....

میں ایک ریستوران کم بار میں چلا گیا اور اُونچے سٹول پر بیٹھ کر ایک سرد مشروب کا آرڈر دیا.... دربار مرگ کا سارا منظر شیشوں کے پار دِکھتا تھا اور فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے ایک خاموش فلم کی طرح چلتے جاتے تھے' ویٹرس جس نے میرا آرڈر لیا سکرٹ اور بو ٹائی میں ملبوس ایک نیپالی خاتون تھی اور ایسی منحنی اور واجبی تھی کہ اُسے فراموشی رکھ کر بھی نہیں چھیڑا جا سکتا تھا۔

"انڈین پنجابی؟" اُس نے مشروب میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے پُوچھا۔

"نہیں.... پاکستانی پنجابی۔"

"پاکستانی؟" اُسے اتنی زیادہ حیرت نہ ہوئی جتنی حیرت کا اُس نے اظہار کیا "آپ پاکستان میں کہاں سے آئے ہیں؟"

"لاہور...."

"مجھے اِس شہر کا نہیں پتہ.... کراچی.... اسلام آباد.... میں صرف یہ جانتی ہوں۔"

ہم اپنی اپنی جنم بھومی میں کتنے گم اور پُر تکبر ہوتے ہیں۔ دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب.... لکھنؤ کی نزاکت.... پشاور کی قصہ خوانی اور لاہور کی زندہ دِلی.... فلارنس.... کُوفہ.... ٹمبکٹو.... ریو ڈی جنیرو.... شیراز.... بنارس.... کو بے.... کاشغر.... کتنے بے شمار شہر ہیں جن کے باسی اپنے آپ کو اُس بستی کی نسبت سے یکتا گردانتے ہیں.... اور دُنیا کو اُن کے نام کا بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ بستیاں بھی ہیں.... جیسے اس زمین کا محور چھوڑ جانے والا خلا باز جب مریخ کی جانب سفر کرتا ہے تو بے انت سیارے اور زمینیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور جب وہ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے تو لاکھوں روشن چمکتے جگنوؤں میں سے کوئی ایک اُس کی زمین ہے.... اور تب اُسے احساس ہوتا ہے کہ کسی ایک زمین کے ساتھ اُس کی وابستگی کتنی سطحی اور بے معنی تھی....

چنانچہ جب اُس نیپالی ویٹرس نے یہ کہا کہ مجھے اِس شہر.... لاہور کا نہیں پتہ.... تو میں نے بھی یہی محسوس کیا.... کسی ایک شہر یا بستی کے ساتھ وابستگی کتنی سطحی اور بے معنی ہوتی ہے.... اور شاید کسی ایک ملک کے ساتھ بھی!

اس بار کے عقب میں ایک صحن تھا.... جس میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک اوپن ایئر ریسٹوران تھا جو ابھی رات کی رونق کا منتظر تھا۔

دربار مرگ.... موت سے.... مرگ سے.... بہت پہلے دیکھنے کی چیز تھا اور میں پہلی قُربت مرگ میں آیا تھا....

تب آتا.... جب جھیل جنیوا کے کنارے نیلی جین میں کسا ہوا میرا چیتا بدن نیپالی ردپا کی کمر کو شرماتا تھا.... تب کوئی اور داستان ہوتی۔

اور اب کوئی داستان نہ تھی۔

ہوٹل سولتی ہالیڈے اِن کے ریسپشن ہال میں ہم اگرچہ تاخیر سے پہنچے لیکن کسی نے بھی نوٹ نہ کیا کہ ہم پہلے وہاں نہیں تھے اور اگر اب ہیں تو اس سے فرق تو پڑتا نہیں ہوئی۔

اس قسم کی پارٹیوں کا ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے' نہایت قرینے سے اپنے آپ کو حرکت میں رکھنا پڑتا ہے.... خصوصی پوز یہ ہے کہ آپ اپنے شام کے بہترین لباس میں دن بار بار ٹائی کی گرہ درست کریں' اگر تو آپ نے سسپینڈرز یا گیلس کے ذریعے اپنی پتلون کو سہارا دے رکھا ہے تو آپ بے فکر ہیں کہ یہ آپ کے موٹاپے سے کھسک کر قدموں پر نہیں آگرے گی اور اگر آپ نے اُس پر بیلٹ لپیٹی ہوئی ہے تو اُس کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ گلاس آپ کے ہاتھ میں ہے اور اُس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سادہ پانی بھی ہو سکتا ہے اور واڈکا اور جن بھی ہو سکتے ہیں۔ ایپل جوس اور سکاچ کا رنگ بھی ایک جیسا ہوتا ہے چنانچہ ایک شخص نے اگر بہت بے دلی سے پچھلے ایک گھنٹے میں اپنے گلاس کا صرف مشروب پیا ہے تو وہ پانی یا جوس ہے.... اور اگر وہ قریب سے گزرنے والے ہر طشتری بردار ویٹر کی طشتری پر اپنا خالی گلاس رکھ کر ایک اور گلاس اُٹھاتا ہے تو جان لیجئے کہ بڑی رُوسیاہ ہے جس کو مے سے قطعی طور پر نشاط وغیرہ کی غرض نہیں ہے.... چنانچہ آپ گلاس ہاتھ میں تھامے مختلف گروپس میں "ہیلو.... آئی ایم...." کہہ کر شامل ہوتے ہیں' کچھ دیر خوشگوار گفتگو کرتے ہیں اور پھر.... "ایکس کیوز می" کہہ کر کسی اور جانب چلے جاتے ہیں۔

ہم جب ریسپشن میں داخل ہوئے تو یہی کچھ ہو رہا تھا....

البتہ بیشتر خواتین دیوار کے ساتھ لگی آرام دہ کرسیوں اور صوفوں پر براجمان تماشائے اہلِ کرم دیکھتی تھیں۔

ملک صاحب نے مؤدب ہو کر ایک بزرگ و برتر ہستی سے میرا تعارف کروایا جو یورپ میں یونیسف کا ٹاپ مین تھا۔

ٹاپ مین متعدد کاک ٹیلز اُنڈیلنے کے بعد ٹاپ فارم میں تھا۔

طشتری بردار ویٹرز مشروباتِ کفر کی نمائش کرتے ہم سب کو دعوت خمار دیتے

تھے۔ ایک ایسے ہی ویٹر نے جب صوفے پر بیٹھی نہایت غصیلی حالت میں بیٹھی ہمشیرہ کے
سامنے جھک کر یہ مشروبات پیش کئے تو ہمشیرہ نے صرف ایک لفظ کہا "دفع...."
ہم ظاہر ہے اتنے بدتمیز نہ ہوسکتے تھے۔

ان ساقی گری کی شرم رکھنے والے ویٹرز کے علاوہ کچھ اور ویٹرز تھے جو انواع
خوراک کی طشتریاں اُٹھائے ہوئے تھے جو عام حالت میں نہایت عامیانہ لگتی ہے لیکن
حالت خمار میں نہایت دیدہ زیب لگتی ہے.... سرکے میں بھگوئے ہوئے زیتون، سالم پنیر
اور کھیروں کے سینڈوچ، نیپالی سموسے اور پتہ نہیں کیا کیا الابلا....

ٹاپ مین سکینڈے نیویا کے کسی ملک کا رہنے والا تھا اور ایک ایسا شخص تھا جو
شکل سے ایک ایماندار آئرش دہقان لگتا تھا جو سارا دن گھوڑوں کی مدد سے اپنا کھیت ہل
کرتا ہے اور شام کو مقامی شراب خانے میں جا کر جی بھر کے بیئر پیتا ہے اور پھر "جب
آئرش آنکھیں مسکراتی ہیں" گاتا ہوا اپنے فارم پر چلا جاتا ہے۔ اُس میں انگریزوں
امریکیوں کا کوئی احساس برتری نہ تھا....

"مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ایک فرانسیسی
نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں جانور اور پرندے گفتگو کرتے تھے، کیا یہ ناقابل یقین نہیں
ہے؟"

"نہیں ہے" میں بھی قریب ہی کھڑا تھا "سینکڑوں برس پیشتر مشرق میں کلیلہ دمنہ
لکھی گئی.... فرید الدین عطار کی "منطق الطیر" میں پرندے گفتگو کرتے ہیں...."

"واقعی؟" اُس نے بے حد حیرت سے کہا "میں نہیں جانتا"

"اس لئے کہ ہم تو مغرب کو جانتے ہیں لیکن مغرب ہم کو.... مشرق کو نہیں
جانتا۔"

رُوپا جوشی نے آج کی شام کے لئے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ اُس نے ایک ایسا
بلاؤز پہن رکھا تھا جو لہو گرم کرنے کا اِک بہانہ تھا.... اگرچہ فرنٹ کچھ ڈھکا ہوا تھا لیکن
پُشت اور کمر پر اُس کے کوئی آثار نہ تھے اور اُس کی چیتا کمر اتنی زندہ تھی کہ گمان ہوتا تھا
کہ رُوپا یہیں سے بولتی ہوگی....

بنگلہ دیشی خواتین بسکٹ نہایت رغبت سے کھا رہی تھیں اور اورنج جُوس کو بھی

ہاتھ نہ لگاتی تھیں.... البتہ ہندوستانی وفد کی ایک دو خواتین ایسی تھیں جو سر جھٹکتی تھیں تو
ذرا جھومتی بھی تھیں۔

اگرچہ ہمشیرگان کا برادران کو اشارے کرنا ذرا معیوب فعل ہے لیکن ہماری
ڈنرکہ ہمشیرہ ایک صوفے پر براجمان مجھے نہایت غصیلے اشارے کر رہی تھیں، میں اُن کے
قریب چلا گیا "جی فرمایئے"

"بھئی یہ لوگ ہمیں اب شراب ہی پلاتے رہیں گے یا کچھ کھانے کا بندوبست
بھی کریں گے؟"

"ہمشیرہ.... آپ بھی؟"

"لاحول ولا...." اُنہوں نے سخت ناگواری سے کہا اور اُن کی ناگواری کی دھند
اُن کی عینک کے شیشوں کو بھی دھندلا گئی۔ "یہ موئے بسکٹ اور پنیر کے منحنی سینڈوچ کھا
کھا کر طبیعت مقدر ہوگئی ہے"

"جی میں سلمان سے پوچھتا ہوں" میں ملک کی جانب کُوچ کر گیا "سلمان، ہمشیرہ
دریافت کر رہی ہیں کہ یہ لوگ ہمیں شراب ہی پلاتے رہیں گے یا کھانے کا بھی کوئی
بندوبست ہے...."

"تارڑ صاحب میں کچھ نہیں کہہ سکتا...." اُس نے فوراً سرکاری احتیاطی لہجہ
اختیار کر لیا "لیکن ڈائریکٹر جنرل آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے کہ یہ جو بھی شخص ہے
ویل انفارمڈ ہے اور انگریزی اچھی بولتا ہے۔"

"میں ویل انفارمڈ اس لئے ہوں کہ یہ میرا پروفیشن ہے اور اگر وہ میری انگریزی
کی تعریف کر رہا ہے تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس کی انگریزی کیسی ہوگی...."
میں واپس ہمشیرہ کی طرف چلا گیا "ہمشیرہ.... سلمان فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں
ہے کہ اس کے بعد کھانا ملے گا یا نہیں.... لیکن آپ اب تک کیا کرتی رہی ہیں؟"

"یہ نگوڑے اورنج جُوس کا کوئی سولھواں گلاس ہے.... میرے اندر تو مچل فروٹ
ٹرم اُٹھنے کو ہے۔"

"تو پھر؟"

"یہ پھر یہ کہ ہم سب نے بڑی حماقت کی جو یہاں آگئے.... ہم اس وقت نگر کوٹ

میں ہوتے.... یہ سب آپ کا قصور ہے.... اگر آپ تھوڑے سے اور بدتمیز ہو جاتے سکھوں کے ساتھ تو ہم سب اس وقت نگر کوٹ میں ہوتے....''

مسعود مسلسل زیر مونچھ مسکرا رہا تھا اور خوش تھا اور باقاعدہ اپنا گلاس ذرا بلند کر کے رکھتا تھا تاکہ جو تصویریں دھڑا دھڑ اُتر رہی تھیں اُن میں یہ صاف نظر آئے کہ طالبان کا یہ نمائندہ صرف اورنج جوس پی رہا ہے حالانکہ اُس میں سفید واڈکا کی آمیزش بھی ہو سکتی تھی جو کہ اگرچہ نہیں تھی۔

''اچھا تو خواتین و حضرات۔'' پارٹی کے چیف گیسٹ نے مندوبین کو مخاطب کیا اور ہم جیسے خوراک کے شیدائی فوراً متوجہ ہو گئے کہ اب ڈنر کا اعلان ہو گا لیکن اُنھوں نے جھک کر نہایت باوقار انداز میں ہمارا روایتی شکریہ ادا کیا اور رُخصت ہو گئے.... چنانچہ یہ کھلا کہ صرف پینے کا بندوبست تھا' کھانے کا نہیں۔ شاید اُنھوں نے ہمیں ایک ارفع مقام پر پہنچایا تھا کیونکہ یورپی تہذیب کے ایک سیانے نے کہا تھا کہ کھاتے تو جانور بھی ہیں لیکن انسان میں یہ خوبی ہے کہ وہ پیتا بھی ہے.... انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچنے کے باوجود ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔

''تارڑ صاحب.... اب کیا کریں؟'' گمشدہ بھی خوراک کی نایابی کے باعث نڈھال ہو رہی تھی اور اس قحط کی وجہ سے شاپنگ کو فراموش کر چکی تھی۔

''اب تھمل چلتے ہیں۔''

''حمل....'' سُنہری بابا نے پھر لغوبات کر دی۔

''تھمل....''

''Indeed....'' وہ فوراً شرمندہ اور معذرت طلب ہو گئے....

''چلیں گمشدہ؟''

''ہاں.... ابھی چلیں.... میں نے سُنا ہے کہ وہاں تبت کے بنے ہوئے کھیس اور بیگ بھی ملتے ہیں''

''کیوں فاروق؟''

''خدا کے واسطے کہیں تو چلیں....''

''ہمشیرہ؟''

''ذرا جھانک لینے میں کیا حرج ہے....''

''تھمل میں حمل... لارڈ بُدھا اونلی فائو ہنڈرڈ...''

باہر.... وہی خنک ہوا تھی جو اناپورنا اور ایورسٹ سے آتی تھی....

میرے دوست درخت شاید خوابیدہ ہونے کو تھے لیکن میرے قدموں کی چاپ سن کر اُن کے شگوفے کھلنے لگے اور وہ نیم تاریکی میں ہونے کے باوجود ایسے روشن ہوئے کہ میری جرأت نہ ہوتی تھی کہ میں اُنہیں چھوڑ کر آگے چلا جاؤں....

وہ اُس لمحے کھٹمنڈو کی رات میں.... ایسے برگد تھے جن کے نیچے تین مہاتما بُدھ بیٹھ کر دُنیا کو بھول سکتے تھے....

دُنیا میں کوئی شخص چاہے وہ کتنا ہی عام اور اَن پڑھ کیوں نہ ہو.... شہروں کی تہذیب سے دُور ویرانوں' صحراؤں اور کھیتوں میں مشقت کرنے والا کیوں نہ ہو.... جو یہ بھی نہ جانتا ہو کہ آج کیا تاریخ ہے.... اس ملک کا حکمران کون ہے.... اور میرے کنوئیں سے پرے دُنیا بھر میں کوئی اور کنواں نہیں.... پر یقین رکھتا ہو.... اُس کا بھی کوئی نہ کوئی برگد ضرور ہوتا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ نروان حاصل کرتا ہے....

وہ بے شک ایک کیکر ہو....

ریت کا ایک ٹیلہ ہو....

ایک پتھر ہو....

گندم کا ایک خوشہ ہو۔ ٹوبے کا گدلا پانی ہو.... دیسی تمباکو کا ایک کش ہو.... ستو کا گھونٹ ہو.... نسوار کی ایک چٹکی ہو.... سردیوں کی صبح میں جامنی رنگ کا ایک شلغم ہو....

بھینس کے دودھ کی ایک دھار ہو.... مضبوط پُشت پر اُچھلتا ایک پراندہ ہو.... یہی اُس
وہ برگد ہوتے ہیں جو اُسے نروان سے آشنا کرتے ہیں....

اور جُوں جُوں علم بڑھتا جاتا ہے یہ طے نہیں ہوتا کہ کس برگد کے نیچے زمین
رمائیں تو نروان حاصل ہو گا....

اسی لئے میں نے ان تینوں دوست درختوں سے اجتناب کیا اور آگے چلا گیا۔

اور جب ہم دو ٹیکسیوں میں لد کر دربار چوک میں اَن لوڈ ہوئے۔ اُترے.... اور نیپالی بادشاہ کے وسیع محل کے باہر جو آہنی ریلنگ احاطہ کرتی تھی اُس کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتے اور پھر تھمل کی روشنیوں میں آئے تو مجھے ایک مرتبہ پھر شاہ شمس اور مولانا رُوم کی پہلی ملاقات یاد آئی کہ.... یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے....

اور تھمل وہ تھا جسے ہم نہیں جانتے تھے....

پورا کھٹمنڈو چُپ اور نیم تاریک تھا لیکن تھمل میں وہ رونقیں تھیں جو صرف فقیروں کے ڈیروں پر ہوتی ہیں۔

اور یہاں دُنیا بھر کے فقیر جمع تھے.... آوارہ گرد اور فقیر میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا، دونوں اپنی اپنی دُنیا اور اپنے سچ تیاگ کر نکلتے ہیں۔

یہ وہ گلی کُوچے تھے جن میں جو شکل نظر آئی.... تصویر نظر آئی....

اور ماحول ایسا تھا کہ اگر میری این کا چھلا ہوا سفید بے رنگ چہرہ بھی یہاں نظر آتا تو تصویر نظر آتا....

یہ ایک ایسا دیار تھا جس کے بغیر کھٹمنڈو کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ ہم بہت بد قسمت ہوتے اگر تھمل نہ دیکھتے۔

اگرچہ زیورات کی پہلی دوکان پر ہی گمشدہ لٹو ہو گئیں اور شوکیسز پر گھومتی چلی گئیں۔ باہر نکلنے کا نام نہ لیتی تھیں اور ہم حدِ ادب کی وجہ سے موصوفہ کو کھینچ کر بھی باہر نہیں نکال سکتے تھے....

"ہائے تارڑ صاحب...." وہ کسی ایک بُندے پر فدا ہو جاتیں....

"ہائے ہائے تارڑ صاحب۔" وہ انگوٹھیوں میں جڑے پتھروں پر واری ہوتی چلی جاتیں....

ویسے میں نے اُنہیں سختی سے منع کیا کہ بی بی آپ جب "ہائے تارڑ صاحب" کہتی ہیں تو میرے ذہن میں عجیب سی تصویریں آتی ہیں آپ اس سے اجتناب کریں.... البتہ گمشدہ کا میں بے حد شکر گزار بھی ہوں کہ اُس نے عینی اور میمونہ کے لئے متعدد زیورات تجویز کیے جو وطن واپسی پر میری نیک نامی کا سبب بنے۔

زیورات کی دوکانوں کے برابر میں ایک پُل تھا جس کے پار اصل تھمل بازار شروع ہوتا تھا.... یہ ایک اور بازارِ مصر تھا جہاں ہر شے فروخت ہو رہی تھی.... وہاں جتنی بھی دوکانیں تھیں، ریستوران اور جگمگاتے کوزی سے خانے تھے اُن میں ایک عمر گذاری جا سکتی تھی....

ان کی جاذبیت ان کے مختصر اور زندگی کے رنگوں میں رنگے ہونے کی وجہ سے تھی۔

تھمل کا بازار لاہور کا ڈبّی بازار یا سُوہا بازار بھی ہو سکتا تھا لیکن یہاں صرف نالے پراندے اور زیورات نہیں بکتے تھے بلکہ اور بہت کچھ بھی برائے فروخت تھا جو وہاں موجود تھا....

یہاں ایک بوسیدہ محاورے کے مطابق کھوے سے کھوا چھلتا تھا.... اور ایسے ایسے لوگ ہوتے تھے کہ اُن کا کیا بیان ہو.... یہاں ہر رنگت اور ہر نسل کا کھوا تھا۔ سکھ سردار بھی تھے اور سویڈش لڑکیاں بھی.... اور لڑکے بھی تھے جو ہمیں لڑکیاں لگ رہے تھے کیونکہ ہم ایسے خطوں میں سے آئے تھے جہاں پشاور بھی تھا اور غلمانوں کی نوید بھی دی گئی تھی.... یورپی اور جاپانی سیاح.... امریکی بے فکرے کوہ پیما اور کوہ نورد.... تبتی قالین، نیپالی ہینڈی کرافٹس، میڈونا کی آواز پر سُپر ہوتی آشا بھوسلے اور نصرت فتح علی خان کے الاپ.... مے خانوں کے در کھلے.... کھڑکیاں روشن.... دیس دیس کی خوراکیں اور ایک کوہ نورد ہوٹل جسے ہم نے نظر میں رکھا کہ واپسی پر ادھر سے چکن تکّہ اور نان کھائیں گے....

دُنیا بھر میں جہاں بھی سیاح پہنچتے ہیں وہاں اپنی ثقافت اور خواہش کے مطابق کوئی نہ کوئی بازار تخلیق کر لیتے ہیں.... وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ مقامی لوگ اُن کی نبض پہچانتے ہیں اور اُن کے ذوق اور شوق کے مطابق اپنی مقامی ثقافت کو ڈھال لیتے ہیں....

...یہ ایک زمانے کا کابل کا بازارِ مُرغ ہو یا تہران کا شارع امیر کبیر... ہرات کا پوستینوں کا بازار ہو یا فلارنس میں دریائے آرنو کا پل... ہسپانیہ کا کوئی ساحلی مقام ہو یا انگلستان کا ساؤتھ اینڈ... یہ سب ایک بین الاقوامی مہک لئے ہوتے ہیں... ان کی ردھم ایک ہی ہوتی ہے... سیّاح یہاں پہنچ کر محفوظ محسوس کرتا ہے اور قدرے بے باک ہو جاتا ہے... تھمل کے بازار میں بھی ایک لاپرواہ دھڑکن تھی جو اُس میں داخل ہونے والے ہر بدن پر اثر کرتی تھی۔ سیّاح اُن پیاسے اونٹوں کی طرح گردنیں اُٹھائے پُرمسرت ہوتے تھے جو صحرا کے طویل سفر کے بعد کسی ٹمبکٹو کے نخلستان میں آ نکلے ہوں۔

ایک چوک نُما مقام آیا جہاں سے تھمل کا بازار نوّے درجے کے زاویئے پر بائیں جانب چلا جاتا تھا...

ادھر ہر آوارہ گرد رُکتا تھا... اُس کے چہرے کو نیون سائنز کی لائٹس گلنار کرتی تھیں اور تیز دُھنیں اُس کا راستہ روکتی تھیں اور ہر زبان کی رنگینی اُسے رنگتی تھی... اگرچہ اُس چوک نُما سے کوئی اور راستہ نہ نکلتا تھا پھر بھی ہر آوارہ گرد رُک کر سوچتا تھا کہ اب کدھر جاؤں...

یہاں ہم بھی رُکے...

گمشدہ فوراً صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی مالاؤں میں دلچسپی لینے لگی۔

فاروق دوکانوں کے اُوپر جو اوپن ایئر ریستوران تھے اُن کے جھولتے قمقموں میں سے موسیقی اور رقص کی جو آوازیں اُترتی تھیں صرف اُن کو سُنتا تھا اور مجھے "چلیں تارڑ صاحب" نظروں سے دیکھتا تھا۔

ہمشیرہ ہر شے کا معائنہ کرتی تھیں لیکن ایک لاتعلق سائنسی نقطۂ نظر سے اور نہایت پُرمسرت ہوتیں چہل قدمی فرما رہی تھیں۔

اور ضیاء صاحب اپنی سُنہری ریش کو سنوارتے نہ تھکتے تھے...

تھمل کی اُس شب میں اُس چوک نُما میں ایک آٹھ دس برس کا گھاگ بچّہ ایک ایسے بُدھا کو تھامے ہوئے میرے پاس آیا جو ہانگ کانگ میں لاکھوں کی تعداد میں پلاسٹک سے بنتے ہیں لیکن نہایت قدیم اور پُروقار لگتے ہیں۔ بچّہ خوبصورت تھا لیکن غلمان نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نیپالی مردوں میں غلمان بننے کی ہرگز صلاحیت نہیں ہے۔

"لارڈ بُدھا... اونلی فائیو ہنڈرڈ نیپالی... آئی گو یُو گڈ پرائس..."

"نہیں..."

میں اس قسم کے گھاگ بچّہ لوگ سے بخوبی واقف تھا... وہ اپنے تجربے کی وجہ سے فرائڈ سے بڑے نفسیات دان ہوتے ہیں... ٹورسٹ کو گھیر کر ایسی جگہ پر جا مارنا جہاں پانی نہ مانگے اُن کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ سکندریہ کی بندرگاہ سے شہر آتے ہوئے مجھے اسی قسم کے شاطر بچّے سے پالا پڑا تھا جو ہمیں کہانیاں سُنا سُنا کر ڈالر وصول کر لیتا

"لارڈ بُدھا... ویری چیپ۔"

"نہیں۔" میں نے اُسے جھڑک کر کہا۔

چوک سے آگے تھمل میں سے بہت سی گلیاں نکلتی تھیں اور ہر گلی ساجن کی گلی ...نی تھی... کوچۂ یار کی طرح بُلاتی تھی لیکن ہم کس کس گلی میں جاتے... اس لئے ...رہے چلتے گئے۔

"لارڈ بُدھا... اونلی فور ہنڈرڈ نیپالی... آئی گو یُو گڈ پرائس"

"گُم ہو جاؤ بچّے..."

"میں گُم نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے وطن میں ہوں۔" میں یہ فقرہ پہلے بھی سُن چکا ...ا دھوکا دربار کے پرکاش کی زبان سے... چونکہ دن میں درجنوں بار وہ یہ فقرہ عاجز آئے ...ے سیّاحوں سے سُنتے ہیں اس لئے اُن کے پاس گھڑے گھڑائے جواب ہوتے ہیں جو آپ کو لاجواب کر دیتے ہیں۔

"باباجی کھانا کہاں کھانا ہے؟" سُنہری بابا نے ایسی تمکنت سے پُوچھا جیسے وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوں اور میں اُن کا ذاتی بیٹ مین ہوں...

"یہ سامنے والے کوریائی ریستوران میں..."

"حلال فوڈ ہو گی؟"

"ہاں... بندر بھی حلال ہوں گے اور مینڈک بھی..."

سُنہری بابا سخت خفا ہو گئے کہ اُنھوں نے ابھی یہ بھی پُوچھنا تھا کہ بندر کتنے آئی [illegible] ہو گا۔

تھمل کے بازار میں جہاں تک نظر جاتی تھی.... وہاں تک ایک شے تھی جو کھٹ
کی رات میں سُرخ روشنی سے جھلملاتی تھی اور پھندنے والی تھی اور سخت اورینٹل لگ
دیتی تھی۔ ایک سُرخ چینی طرز کی لالٹین.... اگر وہ زرد ہوتی تو میں اُسے ایک پاکت
املتاس کا جُون کے مہینے کا ایک زرد لٹکتا پھُولوں کا گچھا جانتا.... یا ایک ایسی زرد شہزادی جا
جو مُدتوں سے میری منتظر تھی.... لیکن یہ ایک سُرخ لالٹین تھی۔

میں دوکان کے اندر چلا گیا۔

"سَر یہ ٹریڈیشنل نیپالی کاغذ سے بنائی گئی لالٹینیں ہیں۔" دوکاندار لپک کر
"رائس پیپر...."

"کونسی رائس.... باسمتی یا دیسی رائس.... یا موٹا بنگالی چاول سے...."

"یُو انڈین؟" وہ رُک گیا۔

"میں پاکستانی.... ویری پاکستانی...."

"ویلکم...." اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میں ہندو.... اینڈ نیپالی.... وِئی اَ
پاکستان...."

"تھینک یُو...."

"آپ اردو سمجھتا ہے؟"

"سمجھتا ہے.... لیکن بولتا کم ہے کیونکہ یار لوگ ہماری اُردو میں غلطیاں نکالتا
ہے.... تم بولو۔"

"سر یہ لالٹین دراصل لوٹکا کی چھال سے بنتا ہے۔ اور یہ نصرف نیپال میں اور
بہت دُور کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔"

"لکڑی کا لالٹین ہے تو جل نہیں جاتا۔"

"نہیں صاحب.... لوٹکا کے جنگلوں میں آگ نہیں لگتا اس لئے کہ اس کا چھال
آگ نہیں پکڑتا...."

یہ عجیب منطق تھی کہ لکڑی بھی ہے اور آگ بھی نہیں پکڑتی....

"ہمارے پاس لالٹین بہت ہے' ہر رنگ اور ہر سائز میں ہے۔ اور لوٹکا کی چھال
کا ڈائری اور نوٹ بکس بھی ہے" وہ آنکھیں میچ کر میرے قریب آگیا کہ دوکان میں جتنی

روشنی تھی وہ لالٹینوں کی تھی اور بہت ناکافی تھی "سَر آپ کون ہیں؟"

"میں تو آج تک اس سوال کا جواب نہیں دے سکا کہ میں کون ہوں؟"

"سَر میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"میں پہلی مرتبہ نیپال میں آیا ہوں۔"

"تارڑ صاحب...." سرگوشی نے نہایت زور دار سرگوشی کی "پلیز آپ اپنا
تعارف کروادیں' اگر یہ آپ کو پہچان گیا ہے تو لالٹینوں کی قیمت کم کر دے گا...."

"اور اگر نہیں پہچانتا؟"

"پھر بھی رعب تو پڑ جائے گا کہ آپ ٹیلی ویژن پر آتے ہیں۔"

میں نے ایک بازاری طوائف کی طرح اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ میں فلاں فلاں
ہوں....

جانے مُجھے وہ جانتا تھا بھی یا نہیں.... شاید اُس نے ترس کھا کر اُن کاغذی لالٹینوں
کی قیمت حیرت انگیز حد تک گھٹا دی....

یہ سُرخ لیمپ شیڈ.... چینی طرز کی لالٹین سیاہ پھندنے لٹکائے لاہور کی راتوں
میں میرے لونگ رُوم میں تھمل بازار کی یاد دلاتی ہے اور نہ اس کا کاغذ بھورا ہوا ہے نہ
اس کو آگ لگی ہے بلکہ ہر روز اس کی روشنی میں شفق کی سُرخی نمایاں ہو کر میرے گھر
کی دیواروں پر نیپال کی شبیہیں بناتی ہے۔ صرف ایک مسئلہ ہے کہ اُس پر جو نامعلوم سی
مہاتما بُدھ کی شکلیں ہیں اُن کی وجہ سے میری ساس صاحبہ اُس کمرے میں نماز نہیں
پڑھتیں۔

اِسی رائس پیپر شاپ کے پہلو میں کشمیری ہینڈی کرافٹس کی ایک منحنی سی دوکان
تھی.... ایک فاقہ زدہ کشمیری کی طرح.... اور اُس میں پیپر ماشے کا کام تھا جو پاکستان میں اس
سے کہیں بڑھیا ہوتا ہے اور چمڑے کے کچھ بیگ اور پرس تھے جن پر میں اور گمشدہ باہم
لٹو ہوگئے.... لیکن قیمت ہماری جیب میں سوراخ کرتی تھی' اگرچہ ہم نے اُس کشمیری
مسلمان برادر کو اُن کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اپنی غیر مشروط مدد کا حوالہ دیا.... اُن
قراردادوں کا تذکرہ کیا جو وہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتیں اور یو این او کی قرار دادوں کی یاد دلائی
لیکن وہ کشمیری برادرِ عزیز مسکراتا رہا.... اُس کے کانوں پر اگر ہم ایک خوردبین بھی فٹ

کرتے تو ایک بھی جوں رینگتی نظر نہ آتی۔ اور اُس نے قیمتوں میں کچھ کمی نہ کی....

ایک مرتبہ پھر باہر.... تھمل کے بازارِ عجائب میں....

""تارڑ صاحب، تارڑ صاحب۔۔"" گمشدہ نے تھمل کے نائٹ کلبوں کی موسیقی میں اور رنگ رلیوں اور لغویات میں بمشکل سرگوشی سے بلند آواز میں مجھے پکارا "ادھر آئیں۔"

ہم اُدھر چلے گئے۔

"اندر آئیں...." وہ ایک دوکان میں گھس گئی.... اور ہم سب اُس کے پیچھے پیچھے تھمل میں گمشدہ بھیڑوں کی طرح....

اور اندر ایک عجائب گھر تھا۔

اور اس حیرت کدے میں ایسے ایسے عجب رنگ اور شکلیں تھیں کہ ہم دنگ رہ گئے.... ان شکلوں میں اُن دو تبتی خواتین کی شکلیں تھیں جن کے ناک اگرچہ چپٹے تھے لیکن بدن ہرگز نہ تھے....

اُن میں سے ایک اُن خواتین میں سے تھی جو گردن سے نیچے اُترتے ہی بے قابو اور بلند ہو جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے گمشدہ نے مجھے ان پر نظریں سینکنے کے لئے نہیں بلایا تھا.... اُن عجب رنگوں کے لئے بلایا تھا جو تبتی دیہات میں ہاتھ کی کھڈی پر بنے ہوئے شولڈر بیگز میں تھے۔ پرس، تھیلے، پھندنے.... ہینڈ بیگ اور طرح طرح کے نوادر میں تھے، اور ان کی قیمتیں بھی نہایت مناسب تھیں.... بلکہ بقول میری این.... ڈرٹ چیپ تھیں.... اور بقول گمشدہ یہ کھٹمنڈو کی بیسٹ شاپنگ تھی۔

سُنہری بابا ان عجائبات کی قیمت مزید کم کروانے کے لئے اُس ایک تبتی حسینہ کے رخساروں کو سو سو بہانوں سے.... عذرِ ریش رکھتے ہوئے.... چھوتے تھے اور کہتے تھے "نہیں یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔ ذرا تو کم کر دیں۔"

"نہیں۔" وہ سر ہلا کر مسکراتی ہوئی کہتی....

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم سے محبت نہیں کرتیں؟"

"نہیں۔"

"آپ کے رخساروں کی سُرخی کہتی ہے کہ آپ ہم سے محبت کرتی ہیں۔"

"نہیں۔"

اور اس گردانِ نہیں کے دوران مجال ہے جو اُس کی مسکراہٹ کم ہوئی ہو....

میرا تو یہ جی چاہ رہا تھا کہ میں تبت کے اُس بلند حُسن کے رُخسار چھو کر کہوں "بت ذرا تو زیادہ کر دیں۔"

دلائی لاما کی متعدد تصویریں اُس دوکان کی آرائش تھیں۔

تبت کا یہ رُوحانی پیشوا ایک ایسا امام تھا جس کے پیروکار صرف ہندوستان اور پال میں تھے.... دلائی لاما کی تصویر دیکھ کر ہم نے ویسا ہی محسوس کیا جیسا کہ غیر ملکی سیاح لام آباد میں کسی کابلی ریستوران میں جا کر احمد شاہ مسعود یا ربانی کی تصویر دیکھ کر کرتے ں۔ اور جب ہم اُس تبتی دوکان سے باہر نکلے تو سب کے سب ایسے لدے پھندے نکلے ے ہم نیویارک کے باسی ہوں اور بجلی فیل ہو جانے کے باعث اپنی اعلیٰ اور دُنیا بھر سے فع تہذیبی اقدار کو یکسر فراموش کر کے متعدد سُپر سٹورز کے شیشے چکنا چُور کر کے اُنہیں ٹ کر نکلے ہوں۔

تھمل ایک ایسا نخلستان تھا جہاں ہم جیسے آزادی اور شاپنگ کے پیاسے اُونٹوں کو ت پہلے آ جانا چاہئے تھا اور بعد میں بھی آتے رہنا چاہئے تھا۔

لیکن نہ ہم پہلے آئے کہ ہم وہ آئیون ڈینسوچ تھے جو ہوٹل سولتی کے عقوبت انے میں بین الاقوامی معیار پر.... فائیو سٹار سہولتوں کے ساتھ قید تھے.... اور نہ ہم بعد میں ئے۔

میری بیٹی عینی جب اپنے لباس کے ساتھ میچ کر کے ان تبتی رنگوں کے شولڈر گ کندھے سے لٹکا کر کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج میں جاتی ہے تو اُس کی دوستیں اُنہیں کر حسد سے سیاہ ہوتی ہیں اور پُوچھتی ہیں "یہ کہاں سے آیا ہے؟"

اور وہ کندھے جھٹک کر لاپروائی سے کہتی ہے مگر اس احتیاط سے کندھے جھٹکتی ہے کہ وہ بیگ اُس کے کندھوں سے گر نہ جائے "ابو نیپال سے لائے تھے...."

تھمل.... حسن بن صباح کی وہ جنت تھی جس میں دوبارہ جانے کے لئے انسان اپنی ندگی کو داؤ پر لگا سکتا تھا.... خلیفۂ وقت کے سرہانے خنجر رکھ سکتا ہے۔

"لارڈ بُدھا.... اونلی تھری ہنڈرڈ نیپالی.... آئی گو یُو گُڈ پرائس...." وہ گھاگ بچّہ

ابھی تک میرے تعاقب میں تھا۔

"ون ہنڈرڈ...." میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"اوکے...." اُس نے بُدھا کو میری جانب بڑھا دیا....

میں فوراً بیک آوٹ کر گیا کیونکہ یہ ایک بے توقیر... پلاسٹک کا بنا ہوا عارضی بُدھا تھا جو صرف کسی یورپی یا امریکی گھر میں سج کر نروان حاصل کر سکتا تھا.... لیکن میں سرزمین گندھارا کا باسی تھا جہاں بُدھا کی قیمت پڑتی ہے اور وہ یُوں بے توقیر نہیں ہوتا...

میرے گھر میں ہزاروں برس پُرانے ایسے بُدھا تھے جن کی جانب تادیر دیکھیں اُن کی پرستش کو جی چاہتا ہے.... اُن پر ایک خاص زاویئے سے روشنی پڑے تو اُن آنکھیں زندہ لگتی ہیں.... لبادے کی شکنیں حرکت میں آ جاتی ہیں.... وہ میری ساس صاحبہ کی نماز میں بھی مخل نہیں ہوتے اپنے گیان میں اپنے دھیان میں گُم رہتے ہیں.... تو پلاسٹک سے بنے ہوئے اِس بے روح کھلونے کو کیسے اُن کے برابر میں سجا سکتا تھا....

تھمل ایک ایسا نخلستان تھا جس میں ہم پیاسے اُونٹوں کو بہت پہلے آ جانا چاہئے تھا۔

اور ہم نہیں آئے....

اور نہ دوبارہ آئیں گے....

"سِکھ سسرال... اور پرندے آزاد ہوتے ہیں"

"تارڑ صاحب آپ کو ہندوؤں سے بُو آتی ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"اور ہندنیوں سے...."

"اُن سے تو بالکل نہیں آتی۔"

"لیکن مُجھے آتی ہے" ہمشیرہ نے سینے پر دوہتڑ سا مار کر کہا "اب ذرا اِس دیپتی رتی کو دیکھیں۔ اچھی بھلی لگتی تھی گوری چٹی اور چھوئی موئی.... اور آج جو اُس مندر ہو کر آئی ہے جس کا نام پتہ نہیں کونسے مہاراج جی ہے...."

"پشوپتی ناتھ جی مہاراج...."

"ہائیں آپ تو ہندوؤں کے نام اس طرح فر فر لیتے ہیں جیسے خدانخواستہ خود ہندو ہوں۔"

"ہُوں۔"

"کیا ہُوں...." ہمشیرہ غضب میں آگئیں۔

"ہندو۔"

"دیکھیں تارڑ صاحب میں اس معاملے میں بے حد بنیاد پرست ہوں.... اس لئے میرے ساتھ اس قسم کے ملحدانہ مذاق مت کریں۔" ہمشیرہ بے حد ناراض تھیں....

"دیکھیں ہمشیرہ.... میری اکلوتی ساس صاحبہ کے سگے نانا جان ایک سکھ سردار

تھے.... جو بچپن میں گھر سے نکلے تو ایک عالمِ دین کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے.... میری ساس صاحبہ جب فرید کوٹ میں بیاہی گئیں تو اُن کی سکھ برادری میں سے جب بھی کوئی تاریخ بھگتنے یا کسی کام سے فرید کوٹ آتا تو وہ سکھ سردار.... سر جھکائے میرے سسر صاحب کے دروازے پر دستک دے کر کہتا تھا "ادھر ہماری کاکی بیاہی آئی ہے۔ اُسے کہیں کہ اُس کی تاؤ جی آئے ہیں اپنی ہتھیلی آگے کرے" اور میری ساس صاحبہ جو ہرگز میری بیگم کی والدہ نہیں لگتیں کہ وہ اپنے پچاسی ویں برس میں بھی ایک نازک اگرچہ ادھیڑ عمر سفید سفید پری لگتی ہیں اپنی ہتھیلی پردے سے باہر کرتی تھیں اور تاؤ جی اُس پر نظریں جھکا کر چاندی کا ایک روپیہ رکھتے تھے اور بچھے بھاگ لگے رہیں کاکی کر کر تاریخ بھگتنے چلے جاتے تھے....

"بھئی یہ تو بہت ہی کیوٹ بات ہے۔" ہمشیرہ فوراً موم ہو گئیں۔

"ہے ناں؟"

"میں بھی کہوں آپ ہر سردار کو دیکھ کر اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں۔ سسرال کا معاملہ ہے ناں"

"اور یہ تارڑ بھی کسی گیلان، غزنی یا بغداد وغیرہ سے تو آئے نہیں.... ادھر کی ہی پیداوار ہیں.... دریائے چناب کے جنگل بیلوں میں یا تو بھینسیں چراتے تھے یا چُراتے تھے۔ اور تین چار نسلیں پیشتر شدید قسم کے ہندو ہوتے تھے یا پھر سردار ہوتے تھے۔ جو کچھ بھی ہوتے تھے مسلمان نہیں ہوتے تھے...."

"یعنی آپ کی رگوں میں تو کفار کا خون دوڑ رہا ہے۔"

"مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ سندھی کی رگوں میں بھی اسی قسم کا خون دوڑتا تھا ہمشیرہ صاحبہ.... ویسے میں اپنی پسند سے نہیں تاریخ کے جبر کے باعث نجیب الطرفین کافر ہوں...."

"لاحول ولا...." ہمشیرہ اب نہ غضب میں تھیں اور نہ ناراض تھیں بلکہ مسکرا رہی تھیں....

"آپ باتیں تو کھری کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ ہی کھری کرتے ہیں تو میں صرف اس بات پر اپ سیٹ ہوں کہ یہ جو دیپتی ہے چنگی بھلی گوری چٹی اور آنکھوں کو

ے کی کان بنائے تو اُس مندر میں گئی ہے اور واپس آئی ہے تو ذرا دیکھیں کیا کیا اپنے تھے پر تھوپ کے آگئی ہے...."

دیپتی کے سفید ماتھے پر سُرخ تلک تھے جن کا رنگ کچا اور بہتا ہوا تھا اور شاید چاول اور دالیں بھی تھیں جو اس تلک میں شامل تھیں۔

نیپا کانفرنس کا یہ آخری اجلاس تھا....

کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لئے مختلف گروپ تشکیل پا چکے تھے جو اپنی سفارشات کو آخری شکل دے رہے تھے.... اور ملک صاحب اپنی اطالوی لہجے کی رُکی رُکی ریزی میں ازحد متحرک تھے۔ اور اُسی لمحے جب ہمشیرہ صاحبہ دیپتی تلک کی وجہ سے فروختہ ہو رہی تھیں یہ وہی لمحہ تھا جب یہ اس کانفرنس کا آخری لنچ تھا جو ہوٹل سولتی ڈائننگ رُوم میں جاری تھا اور دیپتی اپنے ماتھے پر لہو رنگ تلک لگا کر آگئی تھی اور ں کے چہرے پر ایسی روحانی مسرت تھی جو مقاماتِ مقدسہ کے زائروں کے چہروں پر ہوتی ہے.... اُس کے لئے پشوپتی ناتھ جی کا مندر ایک مقامِ مقدس تھا....

"ہیں...." یکدم گمشدہ نے گویائی حاصل کرلی "آپ کی پلیٹ میں تو چکن ہے.... تو جھٹکے کا ہے۔"

"اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ مچھلی ہے.... اور مچھلی جھٹکے کی بھی جائز ہے...."

"تو کہہ میں یہ رہی تھی کہ.... اور قسم سے سچ کہہ رہی تھی کہ مجھے ان ہندنیوں سے ایک خاص قسم کی مہک آتی ہے۔ اور خاص طور پر جب یہ تلک وغیرہ تھوپ کر آجاتی ہیں"

"ہمشیرہ.... کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ہو سکتا ہے اُنہیں بھی ہم مومنین میں سے کوئی خاص قسم کی مہک آتی ہو۔"

"لو ہم تو روزانہ نہاتے ہیں.... صفائی نصف ایمان ہے۔"

"وہ ہم سے زیادہ باقاعدگی سے اشنان کرتے ہیں.... بلکہ یہ اُن کے دھرم کا ایک حصہ ہے۔"

"ویسے آپ کس کی سائیڈ پر ہیں تارڑ صاحب۔" گمشدہ بھی خفیف سی خفا ہو گئی۔

"میں شیر کی سائیڈ پر ہوں.... اور آپ گمشدہ ایک شیر ہیں اگرچہ ایک گمشدہ اور شاپنگ کا شائق شیر ہیں.... لیکن آپ سے اور ہمشیرہ صاحبہ سے ایک گذارش ہے کہ ہر شخص کو دوسرے مذہب کے پیروکار سے کوئی نہ کوئی مہک آتی ہے.... یہ مہک اپنے عقیدے کی سچائی اور گھمنڈ کی بھی ہوتی ہے۔ یوں بھی ہر نسل کی اپنی اپنی خوراک اور سر پہ لگایا جانے والا تیل مختلف ہوتا ہے۔ انگریزوں کو ہم پاکستانیوں سے ادرک اور لہسن کی بُو آتی ہے اور ہمیں اُن کے پانی کے استعمال کے اجتناب اور صرف ٹائلٹ پیپر پر انحصار کی بُو آتی ہے.... ٹیلی ویژن کے ایک اداکار کینیڈا میں چند برس گذارنے کے بعد پاکستان صرف اس لئے لوٹ آئے کہ اُن کے بقول وہ اپنے اردگرد چوبیس گھنٹے ایسے لوگوں کی موجودگی برداشت نہیں کرسکتے تھے جو گھر سے صرف ٹائلٹ پیپر سے اپنے آپ کو پونچھ کر نکلے ہوں۔ میرے ایک دوست چین گئے تو ہمہ وقت ناک پر رومال رکھے پھرتے رہے۔ کراچی کھٹمنڈو فلائٹ پر جو نیپالی مزدور تھے وہ صرف پانی سے گریز کی بنا پر ہی مہک آور نہیں تھے بلکہ اُن کے سر ایسے تیل سے چپڑے ہوئے تھے جس کی بُو سے ہماری اپنائیت نہ تھی...."

"بیان جاری رہے ہم ہمہ تن گوش ہیں...." گمشدہ نے بھی چہک کر کہا۔ حالانکہ اُس کا ہمہ تن ذرا مختصر تن تھا....

"مجھے اپنی سگی پھوپھی رحمت بی بی کے ہاتھوں اور بالوں سے لسّی کی بُو آتی تھی جب وہ مجھے پیار کرتی تھیں.... اور میں خود جب دیسی گھی سے چپڑی ہوئی روٹی کھا کر اُنگلیوں پر لگے گھی کو نہایت اہتمام سے اپنے ہاتھوں اور چہرے پر مل کر "شکر الحمدللہ" کہتا ہوں تو میرے بچوں کو اُس کی بُو نہایت ناگوار لگتی ہے.... مجھے اُپلوں پر کڑھے دودھ کی زردی اور اُس پر بالائی کی موٹی تہہ سے بہتر دُنیا کی کوئی اور نعمت نہیں لگتی اور میرے بچے اُس دودھ کا ایک گھونٹ بھر کر اُبکائیاں لینے لگتے ہیں اور غسل خانے کی طرف بھاگتے ہیں.... تو گذارش یہ ہے ہمشیرہ محترمہ کہ یہ جو ہمیں بُو آتی ہے تو ایک مختلف لائف سٹائل اور عقیدے کی بُو آتی ہے...."

"واہ...." ہمشیرہ خوش ہو گئیں "ہم بھی جان بُوجھ کر آپ کو چھیڑتے ہیں۔

"آپ اگر بیس برس پیشتر ہمیں چھیڑتیں تو کوئی بات بھی تھی...."

"تارڑ صاحب آپ نے تو پورے کا پورا فلسفۂ رنگ و بُو بیان کر دیا...." سرگوشی میں داد دی۔

"اس لئے کہ حضرت علامہ نے بھی تو کہا تھا کہ

نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو....

اور یہ وہی قافلے ہیں عقیدے اور نسل کے جن کے رنگ و بُو الگ الگ ہوتے ہیں اور میں ایک اور گذارش کروں؟"

"آج اگر آپ گذارشات پر اُترے ہوئے ہیں تو کر دیں۔" سنہری بابا پہلی بار بولے کیونکہ وہ ڈائننگ رُوم میں ذرا تاخیر سے آئے تھے.... شاید آپ اپنے کمرے میں اپنے بچوں کے لئے خرید کردہ پلاسٹک کے سوئمنگ پُول کو ٹیسٹ کرکے آئے تھے اور چند غوطے کھا کر آئے تھے.... اُن کی داڑھی ابھی تک بھیگی ہوئی تھی۔

"مجھے وہ گذارش بھول گئی ہے۔" میں یکدم بلینک ہو گیا کہ میں کہنا کیا چاہتا تھا۔

"ہُوں۔" گمشدہ نے یہ "ہُوں" اُس خوابیدہ شہزادی کی طرح کی جو شہزادے کے انتظار میں برس ہا برس خوابیدہ رہے اور پھر وہ آجائے اور اُس کے لمس سے بیدار ہو کر کہے "ہُوں۔"

"لیکن ہم نے تو سرسری بات کی تھی اور آپ پیچھے ہی پڑ گئے...." ہمشیرہ بنیادی طور پر بنیاد پرست نہیں تھیں صرف شغل میلے کے لئے ہمیں دھمکانے کی خاطر اس قسم کی بیان بازی کرتی تھیں۔ "ویسے آپ غیر جانبدار نہیں ہیں کیونکہ آپ میں ہندو اور سکھ خون بیک وقت دوڑ رہا ہے۔"

"نجیب الطرفین کافر۔" سُنہری بابا نے قہقہہ لگایا....

اس قہقہے کی بلندی نے بلکہ سربلندی نے دِیپتی کو ہماری جانب متوجہ کر لیا اور وہ فوراً ہماری ٹیبل پر آگئیں.... یوں بھی یہ کانفرنس کا آخری دن تھا اور ٹرین کے ایک طویل سفر کے بعد منزل آجانے پر جیسے مسافر جذباتی ہو جاتے ہیں ایسے ہم سب بھی تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" دِیپتی نے پُوچھا۔

"میں تو آپ کے ماتھے پر تھوپے.... میرا مطلب ہے لگے ہوئے تلک کی تعریف

کر رہی تھی کہ دِپتی کتنی دیوی سمان' حسین لگ رہی ہے" ہمشیرہ نے ایک حیرت انگیز پلّہ کھایا۔

"میں آج پشوپتی ناتھ جی کے ہاں گئی تھی.... اُن کے چرن چھو کر شکریہ ادا کیا اُنہوں نے مجھے یہاں بُلایا تھا.... یہ تلک تو میرا جھومر ہے.... ڈو یُو لائک اِٹ؟"

دِپتی نے اگرچہ یُونہی پوچھا تھا لیکن سُنہری بابا نے یہ خیال کیا کہ صرف اُن سے پُوچھا گیا ہے "اِٹس لَولی...."

"بیوٹی فُل" ہمشیرہ نے عینک سنبھال کر تلک کا جیسے پہلی بار بغور معائنہ کیا۔

"سو کیوٹ...." گمشدہ صدق دل سے کہہ رہی تھی۔

"تھینک یُو.... ویسے میں جب دہلی واپس جاؤں گی تو میری ساس جی یہی کہیں گی کہ دِپتی یہ پشوپتی ناتھ جی کیا ہیں.... ہمارے سرگودھا کے مندر میں جو بھگوان تھے بس وہی دھرم' ارتھ اور کام کے دیوتا تھے.... تارڑ صاحب اُن کو اپنی جنم بھومی نہیں بھولتی.... آپ جانتے ہیں کہ گودھا ایک ہندو بھگت تھا جو ایک سَر.... ایک تالاب کے کنارے دھونی رمائے بیٹھا رہتا تھا۔"

"ویسے یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ شاہینوں کے شہر سرگودھا کا نام.... ہندو ہے.... بدل دینا چاہئے" ہمشیرہ نے ذرا قربت میں آکر چپکے سے کہا۔

"ہاں.... میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ہمشیرہ.... اور لاہور اور ٹوبہ ٹیک سنگھ اور واں رادھا رام اور قصور وغیرہ کا نام بھی بدل دینا چاہئے...."

ہمشیرہ چُپ ہو گئیں....

"ویسے ہمشیرہ ابھی ابھی کس بُو کی بات کر رہی تھیں؟"

"کونسی بُو؟ یہ نیپالی خوراک میں کسی تیل کی بُو ہے ورنہ بہن دِپتی تو میری جند جان ہیں۔"

کانفرنس کا اختتام بے شمار تالیوں کی گُونج میں ہوا۔

شاید یہ بالآخر قید سے رہائی کی خوشی میں بجائی گئی تالیاں تھیں.... یا اتنے دنوں کے رفاقت کے بعد اب بچھڑ جانے کی اُداسی کی تالیاں تھیں۔

میری این اتنے دنوں بعد اور آشنائی کے باوجود بے کشش تھی اور ایک روبوٹ

کی طرح.... ایک خاص مشینی ردھم میں.... بے اختیار تالیاں پیٹ رہی تھی جیسے اُس میں چابی بھر دی گئی ہو....

نیپالی رُوپا نے آج اپنی ساڑھی کو اتنی ڈھیل دے رکھی تھی کہ وہ کچھ بھی نظر آجائے جو آج تک نظر نہ آیا تھا۔ اور اُس کی سفید کمر تالیاں بجاتی تھی۔

وہ گھوڑا خاتون تو جیسے اپنے دُم ہلاتی تھی۔

بنگلہ دیشی خواتین نہایت احتیاط سے اور اپنے چہرے ڈھانپے اپنی خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔

ہندوستانی وفد سب سے زیادہ پُرشور اور ہاتھ فضاء میں بلند کر کے تالیاں بجاتا تھا.... پرکاش ایک سرکاری انداز میں دیکھ بھال کر آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہا تھا....

اور دِپتی اپنے ماتھے پر تھوپے دال چاول کے خشک ہو جانے کے باوجود اپنے مدھر اور موٹے ہاتھوں سے تالیاں پیٹ رہی تھی۔

گمشدہ ذرا سُستی سے.... یہی عمل ایک سلوموشن میں دوہراتی تھی۔

کرسچن مندوبین پر ایک مربیانہ نظر ڈالتا تھا.... جیسے ایک سفید فام "تاریکی کے دل" میں اُترتے ہوئے اُس کے استقبال کے لئے آئے ہوئے ڈھول بجاتے "وحشیوں" کو دیکھتا ہو.... کہ میرے کندھوں پر ایک سفید فام کا بوجھ ہے جس کا بنیادی مقصد اگرچہ تمہارے تاریک براعظم کو لُوٹ کر لے جانا ہے لیکن تم وحشیوں کو تہذیب سے آشنا کرنا بھی ہے....

کانفرنس کا اختتام ہوا تو نیپالی شمع دان میں جو دِیا تھا اُسے بجھا دیا گیا۔

سب کے سب آئیون ڈینسوچ آزاد ہو گئے....

لیکن وہ اُن پرندوں کی طرح تھے.... جو پرواز بھول گئے تھے۔ اپنا آسمان بھول گئے تھے اور درِ قفس کھلنے کے باوجود واپس اپنے قفس میں آنا چاہتے تھے....

اور جب ایک عمر قیدی آزاد کر دیا جاتا ہے تو وہ کہاں جاتا ہے؟

نزدیک ترین قمار خانے میں....

"آخری قماری، خماری اور کُماری... اُٹھ فرید ا سُتیا"

قمار خانے میں یا کیسینو میں آج شب کچھ آزردگی تھی۔

وہ رونق نہ تھی جو ہر شام اُمڈتی ہوئی چلی آتی تھی۔

نہ چیک شرٹ میں ملبوس.... سلاد چباتا.... بیئر کے گھونٹ بھرتا وہ چوکنا جواری تھا جو اپنے سامنے بیٹھی کُماری کو بُرے وقتوں کے لئے بچا کے رکھتا تھا۔

اور نہ وہ "زندگی ایک مرتبہ ہے" کی بابر بہ عیش کوش والی حسینہ تھی۔

اور نہ ہی دوستو وسکی اور بابا ٹالسٹائی وہاں موجود تھے....

میری زندگی میں شکر اور قناعت کا ایک وہ لمحہ بھی تھا جب اسسٹنٹ پروفیسر میری کوف نے دوستو وسکی کا ناول "ایڈیٹ" مجھے تحفے کے طور پر دیا اور اُس پر میرا نام لکھ کر کہا کہ سوویت یونین میں سب سے پسندیدہ نثرنگار کے نام....

اگر دوستو وسکی کے ناول پر.... جو کہ میرے اُستادوں میں سے ایک ہے۔ ایسا توصیف لکھ کر مجھے دی جاتی ہے تو مجھے اس ادب کی دُنیا میں اور کیا درکار ہے۔

لیکن یہاں ادب کی نہیں.... قمار کی اور خمار کی دُنیا تھی۔

تو یہاں اس قمار خانے میں کوئی بھی نہ تھا....

شاید وہ سب کچھ تھا جو پہلی شب میں تھا لیکن ہمارے وجود میں آخری شب کی.... کھٹمنڈو میں آخری شب کی اداسی تھی جو ہر سُو بے رونقی کرتی تھی۔

ہم پانچوں سوار کیسینو کی سیڑھیاں اُتر کر ریستوران کی اُسی ٹیبل پر براجمان

ہے جس پر ہم پچھلی کئی شاموں سے زندگی گذارتے تھے۔ اور کیا خوب گذارتے تھے۔

اگرچہ آج صرف گانا نہ تھا بلکہ زندہ ناچ گانا تھا....

ہمارا فیورٹ ویٹر تھاپا.... مسکراتا تھپ تھپ کرتا ہماری میز پر آگیا.... نہ وہ انگریزی جانتا تھا نہ اُسے اردو کی سمجھ بوجھ تھی.... بس جو بولتا تھا تھپ تھپ بولتا تھا اور وہ بھی بتیسی کے تلے گلے میں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اور جس ٹیبل پر ہم براجمان ہوئے وہاں بہت پہلے سے دیپتی اپنے چوڑے چپس کے ساتھ بہت زیادہ براجمان تھی اور اُس کے ماتھے پر پشوپتی کا تلک بہار دکھلاتا تھا۔ دیپتی کے ہمراہ نہایت سادہ اور خوشگوار مزاج کی چترا نیگام تھیں جو آل انڈیا ریڈیو میں بچوں کے پروگراموں کی نگہبانی پر معمور تھیں.... البتہ اُن کے برابر میں بیٹھی ہوئی اُن کی بیزار شکل کی عینک بیٹی بہت ہی بیزار تھی.... یہاں اُس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی کوئی رفاقت نہ تھی اور وہ اپنی ماں کے بار بار "تم بور تو نہیں ہو رہیں؟" کے جواب میں مُنہ بسور کر کہتی نہیں.... میں تو بہت انجائے کر رہی ہوں۔"

دیپتی بے انتہا خوش تھی "میں نے ابھی ابھی دِلّی میں اپنے ہسبینڈ سے بات کی ہے اور اُن سے پوچھا کہ کھٹمنڈو میں ہماری آخری رات ہے تو میں کیا کروں؟ تو اُس نے پتہ ہے کیا کہا؟.... اُس نے کہا' دیپتی ڈارلنگ تم آج کی شام خوب مزے کرو اور جوا کھیلو تو میں جوا کھیلنے آگئی.... میں ایک مشرقی بیوی ہوں اور خاوند کا کہا مانتی ہوں۔"

"آپ کچھ جیتیں؟" گمشدہ جو کبھی جواری حسینہ کے لقب سے سرفراز کی گئی تھی ذرا بیدار ہو کر کہنے لگی۔

"پتہ نہیں.... میں نے اپنے پرس میں جو نوٹ ہیں اُن کی دوبارہ گنتی نہیں کی.... کہیں میں جیت گئی اور کہیں بُری طرح ہار گئی...."

"آپ جوانی میں تو کبھی نہیں ہاری ہوں گی؟" میں نے سوچا ذرا سا فلرٹ کرنے کا کیا حرج ہے....

دیپتی باقاعدہ طور پر بلش کر گئیں.... اور اُن کا تلک دہکنے لگا.... یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنے موٹاپے اور مختصر قد کے باوجود ایسی سُرمہ زدہ بڑی بڑی آنکھیں رکھتی تھیں جو بولتی تھیں.... اور یقیناً جوانی میں اُنہوں نے بہت کچھ بولا ہو گا۔ اور بلش کرنے کے فوراً

بعد انہوں نے مجھے گھورا.... "جوانی میں کیا مطلب.... تارڑ صاحب میرا ہسبینڈ تو اب بھی
میرے پیر دھو دھو کے پیتا ہے"

"دیپتی ایک تو یہ ہے.... کہ کسی بھی خاتون کے پیر چاہے کتنے ہی صاف ستھرے
کیوں نہ ہوں اُنہیں دھو کر اور پھر بالٹی میں جمع شدہ پانی کو پینے کے لئے یا تو مکمل حماقت
درکار ہے اور یا مکمل خمار...."

"آپ کو کبھی عشق نہیں ہوا ناں اس لئے آپ ایسا کہتے ہیں.... میرے خاوند
ایسے ہی ہیں...."

میں نے اپنی زندگی میں جو چند ایک خواتین دستک دیئے بنا در آئی تھیں اُن کے
پاؤں کو یاد کیا.... اور پھر یہ فرض کیا کہ میں ایک عدد جھانویں سے اُن کے پاؤں دھو رہا
ہوں.... اور میں مکمل طور پر اُن کے عشق میں فنا ہو چکا ہوں.... تب بھی میں اُس پانی کو
پینے کا حوصلہ نہیں رکھتا جو اُن کے پیروں کی اور ناخنوں کی میل سے آلودہ ہو.... میں
بے شک وحشت ہوس میں کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن.... یہ نہیں کر سکتا....

"آپ بیئر پئیں گے؟" دیپتی نے آفر لگائی۔

"جی نہیں، شکریہ"

"میں پلاؤں گی.... دے پارٹی اِز آن می"

"نو تھینکس...."

"پلیز.... اِٹس آن می"

یکدم موسیقی جو اَب تک دھیمے سُروں میں تھی.... لوریوں کی طرح گا گا کر
سُلانے والی تھی اور اُکتا دینے والی تھی اُس نے کروٹ سی بدلی.... بیدار ہوئی اور ایک
ہنگامہ سا برپا کر دیا.... اُس کی ردھم بہت بلند ہو کر بدن کے بوسیدہ کواڑوں پر دستک دینے
لگی....

سٹیج پر ایک نیپالی لڑکا پنجاب کے روایتی لباس میں لٹکتا اور "بلّے بلّے" کرتا ہوا
دھڑام سے آیا.... اگرچہ اُس کے چہرے پر سرسوں کا شباب نہ تھا۔ کپاس کی سفیدی نہ
تھی۔ دیسی گھی کی لشک نہ تھی لیکن اُس کی آواز میں ایک پنجابی کھنک تھی اور اُس کے
پیچھے پیچھے ایک نیپالی نار تھی.... ماجھے کی جٹی کی طرح سنوری اور بیباک مورنیوں کی طرح

ہی.... میں ڈر دی رَب رَب کردی تے.... لوکی کہن.... چھوئی مُوئی.... چھوئی مُوئی اور یہ
نیپالی نار چھوئی مُوئی کی ادائیگی کرتے ہوئے ایسی سمٹتی ایسے لجاتی جیسے اُس کے بدن پر بہت
سے ہوس بھرے ہاتھ ہوں....

دلیر مہدی کے دلیر پنجابی الاپ کھٹمنڈو میں ہماری آخری شب میں ایک قمار خانہ
میں دھمال ڈال رہے تھے.... اور ایورسٹ اور اناپورنا اگرچہ ایک طویل فاصلے پر تھیں لیکن
اُن کی برفوں میں بھی ذرا سی لرزش تو ضرور پیدا ہوئی ہو گی جب اُنہوں نے ڈھول کی
تھاپ سُنی ہو گی....

مجھے ایک زبردست کلچرل شاک پہنچا کہ پنجابی زبان کہاں پہنچ گئی ہے....

پنجابی زبان ہم جیسے پنجابیوں کے باوجود.... ہمیں فریب دے کر پُوری دُنیا میں
ردھم اور رومان کی زبان بن چکی تھی۔

اگرچہ شوکت علی نے.... پرویز مہدی، عیسیٰ خیلوی اور منصور ملنگی نے اپنے
آپ کو اس کے لئے وقف کیا لیکن.... یہ نصرت فتح علی خان تھا.... جس نے اقرار کیا کہ میں
اگر سُر میں رہنا چاہتا ہوں تو صرف پنجابی میں رہ سکتا ہوں کہ یہ میرے دل سے ایک
ہُوک کی طرح اُٹھتی ہے۔ سُن چرخے دی مٹھی مٹھی ہُوک.... ماہیا وے میں تینوں یاد آواں
گا.... اُن کی زندگی کے آخری ٹیلی ویژن پروگرام "تیرے نام" میں اُنہوں نے اپنی زندگی
اور فن کے بارے میں آخری باتیں مجھ سے کیں.... اُن کے پاؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی
تھیں۔ ہفتے میں تین بار "ڈیلے سس" کے ذریعے خون تبدیل کرواتے تھے.... لیکن اس
کے باوجود جب اُنہوں نے اپنے ہارمونیم پر جھک کر الاپ شروع کیا تو گویا سُر کی کائنات کی
نبضیں تھم گئیں۔ اور اُس کے چند روز بعد اُن کی نبضیں تھم گئیں.... اکھیاں اُڈیکدیاں
دِل واجاں ماردا.... ساہنوں اک پل چین نہ آوے سجناں تیرے بناں.... دم مست قلندر....
مست مست! اُن کے ایک محسن موسیقار پیٹر گیبریئل نے بھی کہا کہ "لاسٹ ٹمپٹیشن آف
کرائسٹ" کے اُس منظر کے لئے جب حضرت عیسیٰ کو سُولی تک لے جایا جا رہا ہے آپ
اپنے وطن پنجاب میں موت پر جو بین کئے جاتے ہیں اُس قسم کے الاپ کریں.... نصرت
نے ایسے بین کئے ایسے ماتم کئے کہ وہ یادگار ہوئے....

اور اس کے باوجود مجھے ایک زبردست کلچرل شاک پہنچا کہ پنجابی زبان یہاں بھی

پہنچ گئی ہے۔ وہ نیپالی بچہّ اور بچی پنجاب کے لباس میں ملبوس اگرچہ بہت لہکتے اور لچکتے تھے
لیکن اُن بے چاروں کے بدن میں ہرگز کوئی ایسا زاویہ کوئی ایسا اُبھار نہ تھا جو ہوس
بیدار کرسکے....

اگر لہکنا.... اور لچکنا.... ایک نسوانی بدن کا ہوس کو بیدار نہ کرسکے تو پھر کاہے
لہکنا اور لچکنا....

پشتو فلموں کی ایک تگڑی.... فربہ اور مرد نُما ہیروئن نے ایک مرتبہ بیان دیا تھا
اگر سینما سکرین پر ایک ہیروئن تماشائیوں کے جذبات کو مشتعل اور بے قابو نہ کردے
وہ ہیروئن نہیں ہے۔

تو اُس حساب سے.... کھٹمنڈو کے قمار خانہ میں ناچتے یہ بچہّ اور بچی نہایت معصو
لگ رہے تھے۔

قطعی طور پر کسی قسم کے جذبات کو مشتعل تو کیا بیدار بھی نہیں کر رہے تھے۔
ایسے گاتے اور رقص کرتے تھے جیسے کسی سکول کے فنکشن میں ٹیبلو پیش کرتے ہوئے بنے
سنورے لیکن معصوم بچے....

"چھوئی مُوئی' کے بعد بچہّ بچی نے "ہو گیا جے پیار تے تپلے کجھ نیوں رہناں'
شروع کر دیا۔ نیپالی نار ناچتی ہوئی اتنی بے قابو سی لگتی کہ سٹیج کی قربت میں بیٹھے ہوئے
لوگ ہر لمحہ یہ توقع کرتے تھے کہ وہ لڑھک کر نیچے آگرے گی اور وہ اُسے کیچ کرکے
ہاؤ اِز دیٹ کا نعرہ بلند کریں گے لیکن وہ ایسی بھی کچی بچی نہ تھی اور ناٹ آؤٹ رہی۔

دوسرا الاپ شروع ہوا تو ریستوران کے ایک کونے میں نہایت شانتی اور شراب
کے دھیان میں گُم ایک سردار جی نے نعرہ لگایا "بلّے بلّے"

اور یہاں اس قمار خانے میں اس کے مے خانے میں مَیں نے ایک عجیب معجزہ
دیکھا۔

میں اور میرے ہمراہی.... گمشدہ اور ہمشیرہ بھی پچھلی کئی شامیں اس
غارت گر ہوش میں ہی بسر کرتے تھے جہاں شراب بھی تھی اور بہت تھی اور شباب بھی تھا
اگرچہ شہوت سے عاری تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے کبھی بھی کسی ایک فرد کو بھی اتنا
مخمور نہ دیکھا کہ وہ اپنے آپے میں نہ رہے اور ہلا گلا شروع کر دے....

انگریز مہم جُو رابرٹسن نے بھی ہمارے ہم وطن کالاش کافروں کے بارے میں یہی
ما ہے کہ یہ لوگ انگور کی کشید کثرت سے پیتے ہیں اگرچہ وحشی ہیں لیکن میں نے اپنے
برس کے قیام کے دوران کسی ایک کافر کو حواس کھوتے نہیں دیکھا' ٹُن ہو کر "یارو
معاف رکھو میں نشے میں ہوں" گاتے نہیں سُنا....

چنانچہ طے یہ ہوا کہ شراب صرف مومنین پر اثر کرتی ہے کافروں پر نہیں....
شاید اس لئے کہ وہ اس سوم رس کے عادی ہوتے ہیں اور ہم.... نہیں ہوتے....
یقین ہے کہ اس قسم کے حالات اگر لاہور میں ہوتے تو وہاں غدر برپا ہو جاتا اور
نوں کے پشتے لگ جاتے....

تھاپا ویٹر تھپ تھپ کرتا ہمیں سرو کرتا رہا۔

اور جس سردار نے دلیر مہدی کے گانے "ہو گیا جے پیار" پر بلّے بلّے کیا تھا اب
شکل اپنی سردارنی کی کڑی نظر سے بچ کر باتھ رُوم جانے کے لئے اُٹھا اور لامحالہ ہماری
بل کی قربت میں سے جھومتا ہوا گذرا تو مُجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا.... یہ وہی کلکتے والا سردار
ادوپٹے والا تھا "مہاراج مُجھے چرن چھونے دو" وہ فوراً جُھکا اور اگر میں اُسے تھام نہ لیتا
وہ جھکتے جھکتے زمین بوس ہو جاتا....

"سردار جی میں جانتا ہوں کہ آپ لاہور سے بہت محبت کرتے ہیں اور آپ کے
بابا جی امرتسر سے وہاں فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے.... آپ کا بہت بہت شکریہ"

"اوئے بھائی شکریہ نئیں...." وہ یکدم سیدھا اور ہوشیار ہو گیا "مُجھے تو آج پتہ
چلا ہے کہ آپ کون ہیں.... میں نے تو پہلے پہچانا ہی نہیں تھا.... شما کر دیں" وہ ہاتھ باندھ کر
کھڑا ہو گیا۔

"کر دیا...."

"مہاراج میرا پتّر ہے ناں راج پال اور.... میری نونہہ ہے ناں کرن.... ادھر
کھٹمنڈو میں ہنی مُون کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے اُنہیں آپ کا کارڈ دکھایا تو وہ کہنے
لگے' باپو جی ہم تو اِس بندے کے عاشق ہیں.... یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ادھر کھٹمنڈو میں
اسے یقین ہی نہیں کیا.... مجھے شما کر دیں میں نے آپ کو پہچانا ہی نہیں تھا۔"

"کر دیا...."

"وہ دونوں مصروف رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہنی مون میں بڑی مصروفیت رہتی ہے۔ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتے لیکن وہ آپ سے ملاقات کے لئے نکل آئے ہیں۔ بُلا لوں؟"

ریستوران کے ایک اندھیرے کونے میں ایک نوخیز سکھ.... ایسی داڑھی والا کہ جو دینی مدرسوں کے طالبان کے گالوں پر کہیں ہوتی ہے کہیں نہیں ہوتی.... اچھی پنجابی شکل والا.... گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے اور مدھر سیاہ کشش آنکھوں والا اور اُس کے پہلو میں کرن.... جو ایک ٹی شرٹ اور جین میں تھی اور میز پر رکھے اپنے راج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اُسے دباتی تھی اور وہ دونوں مسکراتے ہوئے اور محبت بھری نظروں سے ہماری جانب دیکھتے تھے....

"اوئے آجاؤ۔" سردار جی دوپٹے والے نے نعرہ لگایا۔

وہ دونوں تھکن کے ساتھ اُٹھے جو نوبیاہتا جوڑوں کے بدن کو خوشی دیتی ہے اور ذرا جھجکتے ہوئے ہماری ٹیبل پر آ گئے۔

راج ابھی جوان ہوتا ہوا سکھ تھا اور نو عمری کے باوجود اُس میں نئی نسل کی ایک گہری اور ٹھہراؤ والی دانش تھی جو پچھلی نسل میں کم کم تھی.... کرن اُس کی ہم عمر لگتی تھی اور وہ ایک اُبلتی ہوئی اور اپنے خاوند کے بدن کی باس لئے سکھنی تھی اور اُس ہنی مون دھند میں تھی جس میں کچھ بھی اور کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا.... وہ دونوں چونکہ مشرقی پنجاب میں زیر تعلیم رہے تھے اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے میری شکل اور باتوں کے نہ صرف واقف تھے بلکہ بار بار ایسے فقروں کے حوالے دیتے تھے جو میں نے کہے تھے اور میں اپنے کہے کو بھول چکا تھا لیکن وہ نہیں بھولے تھے....

میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کروایا اور چونکہ مجھے ہمشیرہ صاحبہ سے "لو جی تارڑ صاحب کے رشتے دار آگئے" کا بدلہ لینا تھا اس لئے اُن کو متعارف کرواتے ہوئے میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور راج پال سے کہا "سردار پتر.... ان سے ملو یہ میری پھپھی ہیں۔"

"پھپھی ہیں؟" راج فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا "پھر تو جی یہ ہماری بھی پھپھی ہیں.... چرن چھونے دیں پھپھی صاحبہ۔" اور اس سے پیشتر کہ ہمشیرہ اس رشتے کے بارے

...پنے غم وغصے کا اظہار کرتیں اُس نے جھک کر اُن کے پاؤں کو چھو لیا....

ہمشیرہ ابھی اس شاک سے سنبھلی نہ تھیں کہ نوبیاہتا سردارنی کرن نے بھی جھک کر اُن کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اگرچہ اُسے ٹائٹ جینز کی وجہ سے ذرا احتیاط سے جھکنا پڑا

"پھر تو میری بھی پھپھی ہیں...."

ہمشیرہ اب اِس پھپھی کلچر سے بیک آؤٹ نہیں کر سکتی تھیں۔

"یہ سنہری بابا ہیں.... یہ ملک صاحب ہیں.... اور یہ گمشدہ ہیں جو ہرگز میری پھپھی ...نا ہیں۔"

"تو پھر کون ہیں جی؟"

"یہ بس جواری حسینہ ہیں اور اگر آپ کو جُوئے کے لئے کچھ ٹپس درکار ہیں تو ...سے رجوع کیجئے"

"نہ کریں ناں تارڑ صاحب۔" گمشدہ نے خفیف سا احتجاج کیا۔

"آپ نے نہیں کہا تھا کہ لاس ویگاس میں...."

"کہا تو تھا پر دشمن ملک کے لوگوں میں تو مشہوری نہ کریں ناں.... آخر ...یہ پاکستان بھی تو کوئی چیز ہے۔"

راج پال اور کرن پال کو دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا....

جوانی کی نوخیزی میں' بخار بدنوں والے اور ابھی جذبوں کے نقشوں پر اپنی اپنی ...دگی اور محبت کے شہر دریافت کرنے والے جوڑے مجھے ہمیشہ خوش کر دیتے ہیں.... ...نکہ بعد میں تو یہ نقشے ازبر ہو جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی بھید نہیں رہتا.... اور آپ ...کھیں بند کر کے جذبوں کی اُن جھیلوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں آب و ہوا گرم مرطوب ...تی ہے.... راج اور کرن ابھی ایک دوسرے کی کائنات کے اور بدن کے بھیدوں کے وہ ...ملاح تھے جو تجربے کی تکنیک سے ایک دوسرے کو دریافت نہیں کرتے تھے بلکہ بھٹکتے ...ئے انجانے میں کسی ایسی منزل پر پہنچ جاتے تھے جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوتی تھی.... اُن کے نقشے جب ازبر ہو جائیں اور ردعمل طے شدہ اور معلوم ہو تو انسان محبوب ...کے ایک مشین میں بدل جاتا ہے.... جیسے ایک اجنبی بستی میں کشش اور جذبے کا تناؤ ...تب تک رہتا ہے جب تک آپ اُس کے گلی کوچوں کے بارے میں یہ نہیں جانتے

که یه گلی کہاں پر جا کر ختم ہوگی اور اس کوچے کے اختتام پر کیا ہے.....
جہاں اجنبیت ختم ہوتی ہے وہاں سے جذبے سرد ہونے لگتے ہیں۔
"کاکا شراب پئیں گا؟" میں نے راج سے پوچھا.... پوچھ تو لیا لیکن فوراً ہی اپنی
حماقت کا احساس ہوا کہ یہ کیا سوال ہوا.... ایک ہاتھی سے پوچھنا کہ تمہیں گنے پسند ہیں۔
ایک اونٹ سے دریافت کرنا کہ تمہیں نخلستان اچھا لگتا ہے۔ ایک دریائی گھوڑے سے
پوچھنا کہ تمہیں دریا پسند ہے... غالب سے آموں کا' میر سے عطار کے لونڈے کا..... اور مجھ
سے شاہ گوری کا..... کہ تمہیں پسند ہے کیا سوال ہوا!.... میرا فیورٹ سکھ دوست سُکھ دیپ
سنگھ رانگی خمینی کے انقلاب کے بعد تہران سے رخصت ہو کر آسٹریلیا جا آباد ہوا تھا کہ اُس
کا بزنس ہاؤس تہران میں سکاچ وہسکی کا سب سے بڑا امپورٹر تھا اور ظاہر ہے خمینی کے
تہران میں ٹھہرنا بھوکے مرجانے کے مترادف تھا.... ایک روز اُس نے مجھے اپنے بیٹے کی
شادی کی دعوت دینے کے لئے آسٹریلیا سے فون کیا تو میں نے حال احوال دریافت کرنے
کے بعد پوچھا... سُکھ دیپ دارُو چھکنے کا کیا حال ہے.... اور یاد رہے کہ اُس کا فلسفۂ حیات یہ
تھا کہ چوہدری دارُو نہیں تو سردار نہیں.... دارُو ہے تو سردار ہے.... تو سُکھ دیپ نے اپنی
سفید ہوتی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا.... اگرچہ فون پر یہ تو دکھائی نہیں دیتا کہ فون کرنے
والا اس لمحے کیا کر رہا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اِس لمحے داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا ہوگا۔ تو
اُس نے کہا تھا "چوہدری..... اب میں نے دارُو چھکنا چھوڑ دیا ہے...."
اور مجھے اتنا ہی شاک ہوا جتنا کہ کسی کے مذہب چھوڑ دینے پر ہوتا ہے "لیکن
کیوں؟"

"یار ادھر میں شیپ فارمنگ کرتا ہوں.... بھیڑیں پالتا ہوں.... تو شروع شروع میں
دارُو پیتا تھا اور پھر اپنے فارم کی ایک بھیڑ روسٹ کر کے یاروں کے ساتھ کھا جاتا تھا۔
ایک روز میں نے سوچا سُکھ دیپ تو بھیڑوں کا بیوپاری ہے.... اگر یہی معمول رہا تو اپنی
ساری بھیڑوں کو کھا جائے گا.... تو میں نے دارُو چھوڑ دیا...."
سکھ اتنے پریکٹیکل بھی ہوتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا.... حالانکہ وہ ہوتے ہیں۔
تو میں نے جب راج پال سے پوچھا کہ کاکا شراب پئیں گا اور سوال پوچھتے ہی اپنی
حماقت کا احساس ہوا لیکن اُدھر سے جو جواب آیا اُس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔

"نہیں انکل جی۔ میں شراب نہیں پیتا۔"
"یار تم کیسے سکھ ہو؟"
"میں جی بس ایسا ہی سکھ ہوں۔" وہ خوش دلی سے ہنسنے لگا اور اُس کے دانت
ت ہموار اور سفید تھے.... اُس کی داڑھی ابھی چھدری تھی اور اتنی گھنی نہ ہوئی تھی کہ
ں میں سے اُسے اپنا مُنہ تلاش کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے.....
"اگر تم شراب نہیں پیتے تو تم بلونت سنگھ کے سکھ نہیں ہوسکتے...."
"وہ کون ہیں جی؟" کرن اتنے انہماک سے میری باتیں سُن رہی تھی جیسے میں
رتھ صاحب کا پاٹھ کر رہا ہوں۔
"وہ بھی میرے رشتے دار ہوا کرتے ہیں۔" مجھے افسوس ہوا کہ وہ اُس شخص کو
ں جانتے جس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہمراہ اردو ادب کے بند کواڑ کھولے اور اُن
پنجاب کی تازہ اور سرسوں سے مہکتی ہواؤں کے لئے راستے بنائے اور حبس کی فضا کو
م کیا "وہ راتوں کے بارے میں' چوروں اور چاندنیوں کے بارے میں لکھا کرتے تھے....
اب کے سکھ یا زمیندار کا اگر کوئی مقام ہے تو وہ بلونت سنگھ کی وجہ سے ہے.... پھر وہ
نے لاہور سے جدا ہو کر شاید احمد آباد چلے گئے.... اُنہیں وہاں کون جانتا تھا.... اُن کے
نے کی خبر جب پاکستان پہنچی تو ہم نے یہی کہا کہ.... ہُتے رون گے وِلاں دے جانی تے
ے تینوں گھٹ رون گے.... احمد آباد میں جانے وہ کس مرگھٹ میں جل کر خاک ہوئے
احمد آباد کے لوگوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ کون جل کر راکھ ہوا لیکن اُن کی راکھ لاہور
ک پہنچی اور ہم نے اُن کا سوگ منایا.... میں اُن سے کبھی نہیں ملا لیکن اُن کے روحانی
اگردوں میں سے ایک ہوں.... وہ اگر کسی عورت کے حُسن کو اخیر جانتے تھے تو کہتے تھے
کہ کیا ٹھوئیں ورگی رن اے...."
"Really?" کرن ہنسنے لگی....
"یہ ٹھوئیں کیا ہوتا ہے تارڑ صاحب۔" ہمشیرہ جو اب تک پھپھی صاحبہ ہونے
کے شاک میں سے باہر نہیں آسکی تھیں بالآخر بولیں....
"بچھو کو ٹھواں کہتے ہیں ہمشیرہ۔"
"تو ایک حسین لڑکی کو بچھو کہہ رہے ہیں تو یہ کس قسم کا لٹریچر ہوا؟"

"ایک تو وہ کسی حافظ یا غالب کی عورت کے بارے میں یہ بات نہیں کر
رہے.... یہ وہ ایک پنجابی عورت کے بارے میں کہہ رہے ہیں جو سراسر ایک مختلف سپیشیز
ہے.... اور دوسرا یہ کہ اگر آپ سردار ہوتیں اور اپنی زندگی کی حسین ترین عورت
دیکھتیں جو آپ کو ڈس کر نیلی پیلی کر دے تو اُسے آپ اور کیا کہیں گی؟"

"ہم خواہ مخواہ سردار ہوتیں۔" وہ پھر خفا ہو گئیں۔

"آپ سردار تو نہ ہوتیں۔" فاروق جو بہت مدت سے چُپ بیٹھا تھا میری مد
آگیا "سردارنی ہوتیں۔ اور گرل گائیڈ ہمشیرہ آپ رہنے والی تو چکوال کی ہیں اور ہم
متاثر کرنے کی خاطر اپنے شین قاف کو حلق سے یُوں نکالتی ہیں کہ ہم پنجابی حضرات آ
سکتے میں رہتے ہیں...."

"بھئی کرن...." اور یہ جو کرن تھی اُس کی معصومیت اور بڑی بوڑھیوں وا
دانش مند رویے سے مجھے یوں لگا جیسے وہ میری اکلوتی بیٹی عینی کی طرح ہے "اس شی
قاف سے یاد آیا کہ.... ایک سکھ سردار لکھنؤ کے ایک چوک میں سڑک پر پڑا لوٹ پوٹ
رہا تھا اور نہایت اذیت میں تھا اور قریب المرگ یعنی واہ گرو کی قربت میں جانے کو تھا
کسی نے یُونہی پُوچھا کہ اس سردار جی کو کیا ہوا ہے؟.... جواب آیا کہ ذرا "ق" کو حل
سے نکالنے کی کوشش کی اور وہ وہیں گلے میں پھنس گیا اور نکل نہیں رہا.... اور تب
یہ حال ہے...."

کرن اور راج اِس جوک سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوئے کہ اُن کے ہاں
شین قاف کا مسئلہ نہ تھا.... صرف ہمارے ہاں تھا....

کرن چپکے سے اُٹھی اور اپنا نہایت تازہ ترین ٹیکنالوجی کا کیمرہ ایکوپمنٹ ہمار
میز کے سامنے ایستادہ کرنے لگی.... کیمرہ سٹینڈ اور مختلف لائٹس کو وہ یُوں سیٹ کر ر
تھی جیسے کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آئی ہو.... "انکل اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کی
چند تصویریں اُتار لوں؟"

"انکل کو شروع سے تصویریں اُتروانے کا بہت شوق ہے...." میں نے اپ
موٹاپے کو سانس کھینچ کر ذرا اندر کیا اور اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے اپنے چہرے پر ایک
ایسی مسکراہٹ سجالی جس کے پیچھے جو بد رنگ اور مستقبل قریب میں جھڑنے کو جو دانت

دکھائی نہ دیں۔

فلیش میری اِن نیم وا آنکھوں کو بار بار چندھیاتا تھا....

سٹیج پر جو نیپالی بچہ لوگ تھے اُنہوں نے پبلک کے پُرزور اسرار پر "میں ڈردی
ب کردی" دوبارہ شروع کر دیا.... اور اُس کی پُرجوش ردھم سے کیسینو کی میزوں پر
بھی لرزنے لگے....

فوٹو سیشن کے بعد میں نے راج پال سے کہا "پتّر آپ کے بھائیا جی.. سردار جی
ے والے تو بڑے زبردست جواری ہیں اور آپ کی ماتا جی بھی سلاٹ مشینوں کے
نے بیٹھی سکوں سے بھرے کٹورے کے کٹورے خالی کرتی ہیں تو آپ نے بھی کچھ داؤ پر
؟"

"نہیں جی.... میں جوا بالکل نہیں کھیلتا...."

عجب غیر آئینی سکھ تھا.. نہ شراب پیتا تھا.. نہ جوا کھیلتا تھا....

شاید وہ کرن جیسی بیوی کی موجودگی میں یوں بھی ہمہ وقت خمارِ بدن میں رہتا
کسی داؤ پر کبھی ہارتا ہو کبھی جیت جاتا ہو.... تو اُسے شراب اور جُوئے سے کیا لینا دینا۔

گمشدہ اور کرن امرتسر اور دہلی میں شاپنگ کے ممکنات پر تبادلۂ خیال کر رہی
ں.... اور گمشدہ اُس پر نچھاور ہوتی چلی جا رہی تھی' فاروق اور ملک غائب تھے.... سُنہری
زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتے ہوئے داڑھی نچوڑتے تھے اور نیپالی نار کا تفصیلی جائزہ
ے رہے تھے کہ شاید کہیں کوئی ثبات نظر آجائے.... ہمشیرہ اور رِدپتی شیر و شکر ہو رہی
ں اور شاید دوپٹہ بدل بہنیں بننے پر غور ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ راج اور کرن
ور رِدپتی ذرا چُپ ہو گئی تھی اور اُن کی پذیرائی پر قدرے آزردہ تھی....

"چاچا جی آپ سُنا ہے کہ لکھاری ہیں تو کوئی شعر تو سُنائیں۔"

"پتّر میں شاعر نہیں۔"

"لکھاری شاعر نہیں ہوتے؟" راج حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"نہیں.... لیکن تم دونوں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ شعر میرے ہوں یا کسی
رکے ہوں.... مثلاً.... مائے نیں مائے میرے گیتاں دے نیناں وِچ برہوں دی رڑک
ے.... کیسا ہے؟"

"یہ تو شو کمار بٹالوی ہے جی۔"

"ہے ناں؟.... اور میں اُس کا ایسا معترف ہوں کہ اُس کے صرف ایک مصرعے کا اکثر وِرد کرتا ہوں.... عشقے دا اِک پلنگ نواڑی دے اَساں چاننیاں وِچ ڈاہیا...."

"تارڑ صاحب" ہمشیرہ نے عینک اُتار کر اُس کے شیشے صاف کئے اور پھر پہن کر نہایت متانت سے پوچھا "یہ عشقے وغیرہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ باقی کیا ہے.... اگرچہ ہم چکوال کے ہیں لیکن ایک مدت سے اردو بولتے ہیں اس لئے یہ ہمارے پلّے نہیں پڑتا...."

"ہمشیرہ اس مصرعے کو سمجھنے کے لئے گرمیوں کی شب میں جب گاؤں کے کچے کوٹھے ابھی حدت دے رہے ہوتے ہیں اور بہت دھیرج سے وہ ٹھنڈے ہوتے ہیں اور ایک ہلکی ٹھنڈک کھیتوں کی جانب سے تیر کر آنے لگتی ہے اور چاندنی کا غبار آسمانوں سے اُتر کچے گھروں کے اندر تک جاتا ہے اور بجھے ہوئے دیئے کے طاقچے میں صرف اندھیرا پناہ گزیں ہوتا ہے ورنہ وہ ہر پڑچھتی اور ہر بھڑولے کو نمایاں کرتا ہے.... اور اُس چاندنی میں اگر چھت پر سفید نواڑ کا پلنگ ہو تو اُس کی چھب دیکھنے کے لائق ہوتی ہے اور یہ عشق کا نواڑی پلنگ ہے جس میں سپُردگی کی دعوت بھی ہوتی ہے اور ٹھنڈک کی خوبصورتی بھی، تو اس مصرعے کو سمجھنے کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔"

"یہ آپ کن زمانوں کی بات کرتے ہیں؟"

"جب ایک پنجابی شاعر حافظ برخوردار کے بقول چاندنی اتنی سفید ہوتی تھی کہ اُس میں اُڑتا ہوا سیاہ کوّا بھی روئی کے ایک گالے کی طرح دکھائی دیتا تھا...."

"انکل شعر سنائیں۔" کرن نے پھر کہا۔

اب شاعری مجھ پر اثر تو بہت کرتی ہے، اور میں نے کبھی اس کی زبان یا قومیت پر غور نہیں کیا صرف اس کے اثر کو قبول کیا ہے.... لیکن شعر یاد کرنے میں بالکل پھسڈی ہوں.... لفظ ہمیشہ آگے پیچھے ہو جاتے ہیں اور ایام جوانی میں بھی جب عدم اور ساحر کے شعروں کو رٹا لگا کر یاد کیا کرتا تھا تو اُس کو سامنے پا کر ہمیشہ بھول جاتا تھا.... لیکن کچھ شعر ایسے ہوتے ہیں جو آپ کے بدن میں خودرو بوٹوں کی طرح اُگتے ہیں اور جڑیں پکڑ جاتے ہیں، اُنہیں یاد نہیں کرنا پڑتا وہ آپ کے بدن میں چشموں کی طرح پھوٹتے ہیں اور جاری ہو جاتے ہیں۔

"لو بھئی راج اور کرن.... ذرا سُنو....

کس دا دوش سی کس دا نئیں سی.... ایہہ گلاں ہُن کرن دیاں نئیں
ویلے لنگھ گئے توبہ والے.... راتاں ہوکے بھرن دیاں نئیں
کجھ اُنج وی راہواں اوکھیاں سن.... کجھ گل وِچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن.... کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی...."

راج ایک عجیب سے سکوت میں چلا گیا اور وہ میری جانب ایسے دیکھتا تھا جیسے میں بھی کوہِ طور سے اُترا ہوں اور وہاں سے جو احکام موصول ہوئے ہیں اُن کو بیان کر رہا ہوں۔ کرن کی سیاہ آنکھوں میں ایک حیرت اور اُداسی در آئی جیسے کسی مسافر کو سرِشام منزل سے بہت دور بارش نے آ لیا ہو.... اور اُس کے سر پر جو زندگی کے کاغذ کے پھول ہوں وہ بھیگنے لگے ہوں۔

"یہ کس کے شبدھ ہیں انکل تارڑ۔" کرن بھیگی ہوئی اور بے آسرا سی لگتی تھی اور اتنی آہستگی سے پُوچھتی تھی کہ گمشدہ کی سرگوشی بھی بلند لگتی تھی۔

"منیر نیازی کے۔"

"ذرا دوبارہ سنا دیں گے.... پلیز"

وہ اپنے پرس میں سے ایک نوٹ بک نکال کر میری جانب ایک ایسے سائل کی طرح دیکھنے لگی جس کی عرضی پر میرے دستخط ہو جانے سے وہ عمر قید سے رہا ہو سکتا ہے۔

"یہ تو گرنتھ صاحب میں شامل کرنے کے لائق ہیں۔" راج بھی بہت چُپ تھا اور اب بولا۔

"لوگوں کے دلوں میں جو گرنتھ صاحب ہوتا ہے اُس میں تو یہ شامل ہو چکے ہیں۔"

"میں چلتی ہوں۔" دیپتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ پشو پتی ناتھ جی کا رنگ شاید منیر کی شاعری کے اثر سے اب بے رنگ ہو چکا تھا "تارڑ صاحب آپ دہلی آئیں گے تو ہم پہلے لوگ ہوں گے جو آپ کا سواگت کریں گے...."

چترا نگام اور اُس کی بیزار بیٹی نے بھی آنکھوں میں بھری نیند سے مجبور ہو کر اجازت چاہی اور چلی گئیں۔

"مسٹر ہندو لوگ تو چلے گئے ہیں.... تو اب آپ یہ بتائیں کہ اندرا گاندھی نے دربار صاحب پر حملہ کرنے کی حماقت کیوں کی تھی؟"

"چاچا وہ اور کیا کرتی.... دربار صاحب پر سنت بھنڈرانوالا قابض ہو گیا تھا.... وہ ہمارے سکھ مذہب کا متعصب مولوی تھا.... ہم سب تو اُس کے ساتھ نہ تھے.... تو اندرا جی اور کیا کرتیں؟.... چاچا ایسی باتیں نہ کریں...." "اُس نے فوراً گفتگو کا رُخ موڑ دیا" اتنی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ یا تو وہ بہت دُکھی ہے یا پھر اندرا گاندھی کے ایکشن سے بہت زیادہ اختلاف نہیں رکھتا تھا....

ویٹر تھاپا بار بار تھپ تھپ کرتا ہمارے قریب سے گزرتا تھا' ہم نے بہت دیر سے نہ کچھ کھایا تھا نہ کچھ پیا تھا....

کرن نے وہی نوٹ بک میرے سامنے رکھ دی جس پر اُس نے منیر کے شعر نقل کئے تھے "میرے لئے کچھ لکھ دیں.... میں جب اپنی فرینڈز کو آج شب کی تصویریں دکھاؤں گی اور آپ کے آٹوگراف دکھاؤں گی تو وہ یقین نہیں کریں گی...."

میں نے اُس نوٹ بک پر منیر کو ہی دوہرا دیا.... "کس دا دوش سی کس دا نئیں سی.... ایہہ گلاں ہُن کرن دیاں نئیں...." یہ میں نے پارٹیشن کے حوالے سے لکھا ہے جب آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کے خون سے اپنی کرپانوں کو سُرخ کیا تھا.... جو کالیاں کے گورو دوارے میں ہم نے بھی بہت ظلم کیا لیکن آپ کے ظلم میں وسعت بہت تھی.... بیدردی اور سفاکی بہت تھی...."

راج اور کرن نے اداکاری نہیں کی بلکہ اُن کی حیرت اور خجل تھی.... اور وہ یہ نہ جان سکے کہ محبت میں یہ شکایتیں کہاں سے آگئیں.... نہ اُنہیں بتایا گیا تھا اور نہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی پیدائش سے پیشتر پنجاب کیسے لہو رنگ ہوا تھا۔ ایسی شکایتیں کبھی نہیں مرتیں.... ان کی لاشیں صدیوں تک سامنے رہتی ہیں اور فریاد کرتی ہیں۔

"چاچا آپ ایسی باتیں نہ کریں۔" راج نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے درخواست کی.... "آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کبھی ننکانہ صاحب گئے ہیں؟ وہاں کے مکان کیسے ہیں؟ درخت کیسے ہیں؟ مٹی کی رنگت کیسی ہے؟"

اُس نے ایسے پوچھا جیسے ایک زمانہ میں جب کم کم لوگوں کو بلاوا آتا تھا اور وہ چشمے کی پیاس میں وہاں جاتے تھے جسے رُک رُک کھا گیا اور وہ اتنے ہزاروں برسوں نہیں رُکا.... تو وہ ایک جرعہ پی کر واپس آتے تھے تو اُن سے پوچھا جاتا تھا.... کہ آپ ہواؤں میں سانس لے کر آئے ہیں جن میں اُن سانسوں کی خوشبو ہے تو ذرا یہ تو بتائیں کہ وہاں مکان کیسے تھے' مکین کیسے تھے' درخت کیسے تھے اور مٹی کا رنگ کیا تھا.... راج نے ایسے ہی کھٹمنڈو کے ایک قمار خانے میں گئی شب کی بے رونقی میں مجھ سے پوچھا....

"میں نانک آنا.... کی بستی ننکانہ میں ایک مرتبہ گیا تھا.... گورو دوارہ جنم استھان کے اُس مقام پر جہاں باباجی کی پیدائش ہوئی تھی اور یہ ایسے باباجی تھے کہ ہمارے علامہ اقبال نے بھی اُن کی شان میں شعر لکھے ہیں تو وہاں.... پشتون سرداروں نے میرے عزت افزائی کے طور پر میرے سر پر ایک پگڑی باندھی تھی جسے آپ شلوکا کہتے ہیں اور ننکانہ صاحب کے سب سے خوش آواز راگی نے میرے سامنے بیٹھ کر مجھے بابا فرید کا وہ کلام سُنایا جو گرنتھ صاحب میں شامل ہے "اُٹھ فریدا ستیا صبح نماز گذار...."

بہت دیر بعد ہمشیرہ بولیں کہ اُن کے لئے ہمارے گفتگو میں ایسی خبریں تھیں جو پہلی بار سُن رہی تھیں" تارڑ صاحب کیا سچ مچ اِن کی مقدس کتاب میں نماز گذارنے کی بات لکھی ہوئی ہے؟"

"ہاں.... اور ان کے مکے مدینے یعنی دربار صاحب کی بنیاد میاں میر صاحب نے رکھی تھی...."

"واقعی؟" سُنہری بابا نے کہا۔

"نہیں تارڑ صاحب۔" گمشدہ بھی بیدار ہو گئی۔

"یہ میاں میر کون تھے۔" ملک نے دریافت کیا "میاں نواز شریف کے رشتے دار تھے؟"

"نہیں.... یہ سیاستدان نہیں تھے اگر ہوتے تو دارا شکوہ کی بجائے اورنگ زیب کا ساتھ دیتے.... اور میں نے نہیں ابن انشاء نے لکھا تھا کہ اورنگ زیب وہ حکمران تھا جس نے ساری عمر ایک نماز نہیں چھوڑی.... اور ایک بھائی نہیں چھوڑا...."

"یہ ہندوستانیوں کے سامنے تو ایسی باتیں نہ کریں۔" سرگوشی نے احتجاج کیا۔

راج کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کہاں سے کہاں کیوں نکل جاتے ہیں اُس نے پھر میرا کندھا پکڑ کر پوچھا "چاچا جی.... وہ شلوکا کہاں ہے جو بابا نانک کے جائے پیدائش پر آپ کو باندھا گیا تھا؟"

"وہ میری سٹڈی میں کارل مارکس' نطشے' ہومر' مجید امجد اور قراۃ العین حیدر کے نیچے ایک دراز میں ڈھول جمع کرتا ہے.... اور اُس روز کا منتظر ہے جب شکھ دیپ سنگھ رانگی یا ترلوک سنگھ منڈیر پاکستان آئیں گے.... میرے گھر آئیں گے اور میں اُن کی امانت اُنہیں واپس کر دوں گا کیونکہ وہ پگڑی.... وہ شلوکا.... میرے عقیدے کے تانے بانے سے نہیں بُنا ہوا.... میں شرمندہ بھی ہوتا ہوں کہ اُس کی قدر نہیں کر سکتا۔ بالکل اُسی طرح.... جیسے آپ کو غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا مل جائے تو آپ اُس میں ایک سیاہ مخمل کے ٹکڑے کے سوا اور کچھ نہ دیکھ پائیں گے اور اُس کا اگر آپ بہت احترام کریں گے تو پھینکیں گے نہیں کہیں سنبھال دیں گے اور وہ ڈھول جمع کرتا رہے گا.... اور اگر وہی ٹکڑا میرے نصیب میں آجائے تو میں اُسے فریم کروا کے ایسے زاویئے پر آویزاں کروں گا کہ فجر کی نماز پر سلام پھیرتے ہوئے وہ میری نظروں میں آجائے...."

"ہم اگر پاکستان آئیں تو کیا آپ اُس شلوکے کو ہمیں دکھائیں گے؟"

"پتر تم آجاؤ تو شاید میں اُسے تمہارے سر پر باندھ کر تمہیں بخش دوں کہ شکھ دیپ آسٹریلیا میں بھیڑیں پالتا ہے.... اور ترلوک انگلستان میں ریٹائر ہونے کے بعد گولف کھیلتا ہے۔"

گمشدہ.... ہمشیرہ اور سُنہری بابا نہایت بیباکی سے مسلسل جمائیاں لیتے جا رہے تھے اور مجھ سے عاجز آچکے تھے....

"تارڑ صاحب.... صبح کے تین بج رہے ہیں۔" گمشدہ نے اپنی کلائی پر بندھی اُس مختصر گھڑی کو دیکھا جس کا حجم ایک مکھی سے بڑا نہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ سرگوشی نے جو تین بج جانے کا اعلان کیا تھا وہ ریسٹوران کے کلاک پر نظر ڈال کر کیا تھا.... ورنہ مکھی کی سوئیاں کہاں ہوتی ہیں....

"ہم چلتے ہیں جی۔" راج اور کرن اپنی طویل موجودگی سے ذرا شرمندہ ہو کر

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہم نے بھی مارننگ فلائٹ سے واپس جانا ہے۔"

میں نے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک پاکستانی نوٹ برآمد کیا اور کرن کی ہتھیلی پر رکھ دیا "جیسے میری ساس صاحبہ کے سکھ رشتے دار اُن کی ہتھیلی پر کچھ نہ کچھ رکھتے تھے.... تو میری جانب سے.... اے کاکی یہ دس روپے تمہارے لئے ہیں۔ ہتھیلی آگے کرو میری جیب میں فی الحال یہی دس روپے کا نوٹ ہے۔"

ہمشیرہ فوراً موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے دھم سے کُود پڑیں "تارڑ صاحب۔ میرے پاس سو روپے کا نوٹ ہے.... بچی کو کم از کم سو روپیہ تو دیں۔"

"خاموش ہمشیرہ...." میں نے نہایت درشتگی سے اُنہیں جھاڑ دیا "کیا آپ چپ نہیں رہ سکتیں؟"

کرن نے اُس نوٹ کو ایک صحیفے کی طرح سنبھالا اور پھر جھک کر میرے پاؤں کو چھُوا "تھینک یُو انکل...."

راج بھی جھکا اور میرے جوگرز کو ہاتھ لگا کر کھڑا ہو گیا "ہم چلتے ہیں۔" پھر جیسے اسے ایک عظیم غلطی کا احساس ہوا اور وہ مُڑ کر ہمشیرہ کے پاس آیا اور اُن کے جوگرز کو چھُو کر کہنے لگا۔

"پھپھی صاحبہ.... ہم چلتے ہیں۔"

پھپھی صاحبہ نے پھنکار کر اُنہیں جانے کی اجازت دی اور اُن کے جانے کے بعد مجھ پر برس پڑیں "بھئی میں جو کہہ رہی تھی کہ میرے پاس سو کا نوٹ ہے تو بچی کو صرف دس روپے پر کیوں ٹرخا دیا؟"

"ہمشیرہ صاحبہ آپ میرے مخدوش کردار کی تہہ تک نہیں پہنچ رہیں۔ میرے بٹوے میں بھی سو کے متعدد نوٹ موجود تھے لیکن.... زیادہ جذباتی ہونا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے...."

ہم بھی اُٹھنے کو تھے کہ فاروق نے ہتھیلی سامنے کر دی جیسے ہمیں روکنے کو ہو "پہلے کل کا پروگرام طے کر لیا جائے.... کل ہمارا آخری دن ہے...."

"کیوں تارڑ صاحب۔" سرگوشی اُونگھتے اُونگھتے بولی....

"بھئی کل تو ہمارا نگر کوٹ ایڈونچر اس لئے ٹھُس ہو گیا کہ ہمیں ملک صاحب

کے دید لحاظ کی وجہ سے ریسپشن اٹینڈ کرنا پڑا.... لیکن ہم کل ہر صورت.... بلکہ تین بج
رہے ہیں تو آج ہر حالت میں پانچ بجے بیدار ہوں گے اور....''

''دو گھنٹے سوئیں گے تارڑ صاحب۔'' سرگوشی کی نیند بھری بیزاری عروج پر
تھی....

''بے شک آج نہ بھی سوئیں تو کیا فرق پڑتا ہے گمشدہ.... آج نیپال نگری میں
ہمارا آخری دن ہے اور آخری چانس ہے ایورسٹ پر طلوع آفتاب کو دیکھنے کا.... تو ہم پانچ
بجے روانہ ہوں گے.... عین وقت پر نگرکوٹ پہنچیں گے بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ
پہنچیں گے.... اُس طلسم ہوش ربا کا نظارہ کریں گے' پھر اطمینان سے بریک فاسٹ کریں
گے.... نگرکوٹ کے گاؤں میں ایک مختصر سی واک کریں گے.... جلدی سے لنچ کر کے واپس
ہوٹل سولتی میں.... سامان سمیٹیں گے اور ساڑھے چار بجے کی بس پر سوار ہو جائیں گے
کراچی کے لئے....''

''شاہ جی.... بس پر کراچی جائیں گے؟'' سُنہری بابا کی داڑھی میں بھی نیند کا خمار تھا
وہ چونک کر بولے....

''میری مُراد ایئربس سے ہے.... تو بس یہی پروگرام ہے.... کیسا ہے؟''

''اعلیٰ ہے۔'' فاروق نے انگوٹھا اُٹھا کر داد دی....

''تو پھر فجر کی نماز کے بعد چلیں گے....'' ہمشیرہ بھی خوش ہو گئیں کیونکہ پورے
کراؤڈ میں صرف وہی تھیں جن میں ایڈونچر کی سپرٹ کے جرثومے تھے....

گمشدہ نہیں بولیں ''کیوں گمشدہ آپ نہیں بولیں....''

''اس میں تھوڑا بہت ردّوبدل ہے تارڑ صاحب۔'' گمشدہ بولیں ''ہم آپ کے
ساتھ نگرکوٹ نہیں جاسکیں گے۔''

''ہم کون؟''

''ہم.... یعنی.... مَیں!''

''کیوں؟''

''میں تو دل و جان سے نگرکوٹ جانا چاہتی تھی لیکن ابھی ابھی ایک نیپالی خاتون
سے دوستی ہوئی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے پتن کے قریب اُس فیکٹری میں

لے جائے گی جہاں کھڈیوں پر.... ہاتھ کی کھڈیوں پر پشمینہ بُنا جاتا ہے.... مفلر بھی ہوتے ہیں'
شالیں بھی ملتی ہیں اور بازار سے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اور کندھوں پر ڈالنے والے
کمبل بھی.... اور تارڑ صاحب اصل پشمینے کے ہوتے ہیں۔ اور اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ
اُن کی واقفیت ہے تو اور جنل قیمت پر پندرہ فیصد ڈسکاؤنٹ بھی مل جائے گا تو.... آپ
میری پوزیشن سمجھتے ہیں ناں.... تو اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو....''

''ہم آپ کی پوزیشن بخوبی سمجھتے ہیں بی بی۔'' سُنہری بابا گویا ہوئے ''ٹھیک ہے
آپ پشمینہ فیکٹری میں ہو آئیں بلکہ ہمارے لئے بھی ایک ایک شال خرید لائیں اور ہم
نگرکوٹ ہو آتے ہیں۔''

''پھر میں بھی نہیں جا پاؤں گی۔'' ہمشیرہ نے شاید اپنے آپ سے یا گمشدہ سے
مخاطب ہو کر کہا....

''نہیں نہیں آپ ہو آئیں ناں نگرکوٹ۔'' گمشدہ نے خفیف سا احتجاج کیا....

''بھئی تم تنہا گئی تو کہیں کھو جاؤ گی.... تمہیں تلاش کرنے والا بھی تو کوئی ہونا
ہے.... تو آپ لوگ ہو آئیں....''

''ویسے تارڑ صاحب آپ جانتے ہیں کہ میری ایک ٹانگ میں لوہے کی سلاخ کا
راہے.... تو خواتین نہیں جا رہیں تو ہم جا کر کیا کریں گے.... نگرکوٹ یقیناً ایک پہاڑی
ہے شاید میری ٹانگ کے لئے موزوں نہ ہو....'' سُنہری بابا بھی بیک آؤٹ کر گئے....
آپ لوگ ہو آئیں....''

''ہم لوگ کیا ہو آئیں.... ہم تو بس ہو آئے۔'' میں نے بجھ کر آخری بات کی....

تھپا تھپ تھپ ویٹر کی آنکھیں.... جو یُوں بھی بہت مہین تھیں اب نیند کی وجہ
بالکل ہی ہموار لکیر ہو رہی تھیں....

کیسینو میں ہمارے سوا بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے.... کیسینو کی رولیٹ ٹیبلز'
ٹ مشینیں' کرسیاں اور سٹول ننگے ہو چکے تھے' دکھائی دیتے تھے.... آغاز شب میں
کے ہجوم میں وہ پوشیدہ تھے....

کیسینو سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

میرا جی چاہا کہ کم از کم ریکارڈ کی شکستگی کے لئے.... میں کسی ایک سلاٹ مشین

میں ایک سکہ ڈال کر ہینڈل گھما دوں تاکہ میں آئندہ یہ تو دعویٰ کرسکوں کہ جناب میں تو
جواری ہوں.... جوا کھیل چکا ہوں.... لیکن میں ایسا نہ کرسکا کہ میں بجھ چکا تھا.... میں جو کچھ
جیتنا چاہتا تھا.... وہ نہ جیت سکا اور جو کچھ ہارنا چاہتا تھا وہ میرے پاس موجود تھا۔

سروانتے کا کردار ڈان کیہوتے مجھ سے کہیں بڑھ کر خوش بخت اور جری تھا
کہ جس نے اپنا قدیم صندوق ایک تہہ خانے میں سے جھاڑ پونچھ کر نکالا اور اُس میں
محفوظ ایک پُرانی زرہ بکتر پہنی اور اپنے خادم سانچو کے ہمراہ مریل گھوڑے روزی نانتے پر
سوار ہو کر آفتوں' بلاؤں اور پن چکیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا
تھا....

میں اگرچہ ڈان کیہوتے کا معنوی شاگرد تھا لیکن.... میری آشفتہ سری عمر کے
بھاری پتھر کے بوجھ سے آہستہ سانس لیتی تھی.... ڈان کیہوتے کے ملک ہسپانیہ میں بھی
ایک اجنبی تھا.... جو سان سباستیان کی گرم شاموں میں تھا.... بل فائٹنگ کے اکھاڑوں میں
تھا.... ثوریا کی شب میں کسی چشمِ غزال کی دل نشینی کا مرکز تھا.... "کبالا روخو" یعنی سرخ
گھوڑے کے قرطبی ریستوران میں شانگریا کی سرخ صراحی سامنے رکھے ناڑلا سعد کے
لبنانی ہونٹوں کی کاٹ کو اپنے بدن پر محسوس کرتا تھا.... اُس کے.... اور میرے درمیان
تقریباً تیس برس حائل تھے.... میں اب سہارا لے کر چلتا تھا.... مجھے نگرکوٹ جانے کے لئے
سہاروں کی ضرورت تھی.... جیسے میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر ایسے ہیں کہ کمر سے نیچے
اُن کا پُورا دھڑ مفلوج ہو چکا ہے.... لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے.... جہاں جاتے ہیں وہاں
ایک نظر میں دیکھ لیتے ہیں کہ اس راہداری میں وہ کون کون سے مقام ہیں جن کو تھام کر
میں اپنے آپ کو دھکیل کر آگے لے جاؤں گا.... ہر پندرہ بیس قدموں کے بعد اگر وہ کسی
شے کو تھام کر.... سہارا لے کر اپنے آپ کو آگے نہ دھکیلیں تو وہ گر جائیں....

تو میں بھی اُنہی کی طرح اِس عمر میں سہاروں کی تلاش میں ہوتا ہوں....

اور یہ سہارے ایک ایک کر کے نیپالی پشمینے کی فیکٹری کی جانب جا رہے تھے....

میں نے بھی اپنے "ہسپانوی" کے سُوٹ کیس میں ڈان کیہوتے کی طرح کوہ
نوردی کے سب سامان اِسی نیت کے ساتھ پیک کئے تھے کہ میں اپنے کسی نہ کسی ساتھی کو
بیوقوف بنا کر.... ایک سہارا بنا کر ایورسٹ کے بیس کیمپ تک لے جاؤں گا۔

لیکن میں ناکام رہا تھا....

ایورسٹ کا بیس کیمپ تو کیا میں نگرکوٹ تک نہیں جا سکا تھا۔

اور آج ساڑھے چار بجے میں پی آئی اے کی ایئربس میں سوار ہو کر اپنے قیدی
میں لوٹ رہا تھا.... ایک آئیون ڈینسوچ کی مانند....

میں اُس زائر کی طرح تھا.... جو دمشق تو جاتا ہے لیکن قبرستان باب الصغیر میں
بلال حبشی کے مزار تک نہیں پہنچ پاتا۔ ایران جاتا ہے تو فردوسی' حافظ' سعدی اور
کی قربت میں نہیں پہنچتا.... فلارنس میں کلیسا ڈومو میں مائیکل انجلو کے مدفن پر
بدہ فرشتوں کو نہیں دیکھ پاتا۔ پیرس جاتا ہے تو مونا لیزا کے لبوں کے خماؤ اور خم کو
دیکھتا....

استنبول پہنچ کر یاشر کمال سے ملاقات نہیں کرتا....

گجرات جاتا ہے تو چناب کو نہیں دیکھتا....

ایتھنز میں شب کرتا ہے تو اگلی سویر اکروپلس میں حاضری نہیں دیتا۔

کوئٹہ میں سرینا ہوٹل میں پڑا رہتا ہے اور حنا جھیل کا رُخ نہیں کرتا۔

نہ کوپن ہیگن میں لٹل میرمیڈ سے ملاقات کرتا ہے اور نہ لاہور پہنچ کر فاسٹنگ
کی زیارت کرتا ہے۔

تو یہ کیسا زائر ہے جو نیپال آتا ہے اور ایورسٹ کو نہیں دیکھ پاتا۔

یہ زائر نہیں.... ایک دُنیا دار شخص ہے۔ جو چند روزہ آسائشوں کے لالچ میں....
ارادہ قیام اور بین الاقوامی حکام کی خواہش میں ادھر آیا تھا اور اب آج پچھلے پہر
کے چار بجے خالی ہاتھ لوٹ رہا تھا۔

نہ اُس نے.... کپل وستو کی یاترا کی اور نہ وہ کشورِ ہندوستاں کی فصیل ہمالیہ
ایورسٹ اور اناپورنا تک گیا تو پھر وہ کیا نیپال گیا.... اِک سفرِ رائیگاں میں گیا....

میری سنو جیکٹ' جوگرز اور اُونی موزے اُن ہواؤں میں ایک سانس بھی نہ
جن کی آس پیاس میں اُنہوں نے یہاں تک کا سفر کیا تھا....

میں کیسا زائر تھا....

قمار' خمار اور کماریوں میں ہی اپنے روز و شب بسر کر دیئے....
ے خوار اُٹھتے جاتے تھے.... چنانچہ ہم بھی اُٹھ گئے۔

"بگلا بھگت اور لچکیلی سیڑھی اور وادئ کھٹمنڈو"

"سربستہ رازوں کا آخری گھر...." کتاب کا نام ہے۔
نیپال کے بارے میں ہے۔
مصنف کا نام ای۔اے۔ پاول ہے.... ۱۹۲۹ء میں شائع ہوتی ہے.. آج سے تق
ستر برس پیشتر.... اور پاول کہتا ہے "اگر نیپال میں اور کچھ بھی نہ ہوتا.... سوائے بھگتاپو
کے.... اور اُس کے دربار چوک کے.... تب بھی آدھی دُنیا کی مسافت کے بعد وہاں پہ
جائز ٹھہرتا۔"

ہر مُہم جو مصنف کی سُوئی کسی ایک مقام' کسی ایک شہر یا چوٹی یا قصبے پر اٹکی ہو
ہے اور وہ یہی بیان دیتا ہے کہ نصف دُنیا کا سفر اگر کیا اور اس مقام کے لئے کیا تو کیا
کیا....

کوئی ہنزہ میں قیام کرتا ہے' کوئی سات برس تبت میں گذارتا ہے.... کوئی تبّہ
کو خدا مانتا ہے.... کوئی شاہ گوری کی پرستش کو ایمان جانتا ہے.... اور کوئی رڈیارڈ کپلنگ
وادئ کالاش میں ایک ایسے شخص کو روانہ کرتا ہے جو بادشاہ ہو سکتا تھا لیکن اس کے باو
لاہور واپس لوٹتا ہے اور زمزمہ کی توپ پر براجمان ہو کر اپنے آپ کو "کِم" کا نام دے کر
عجائب گھر پر نظر رکھتا ہے....

ہر ایک کے لئے "سربستہ رازوں کا آخری گھر" الگ الگ ہوتا ہے....
میں اگرچہ ایک اتفاقاً مہم جو ہوں' اتفاقیہ مصنف ہوں لیکن اس کے باوجو

میرے لئے سربستہ رازوں کا کوئی ایک آخری گھر نہیں...
میں کس گھر کو آخری گھر قرار دوں؟..
میں کسی ایک گھر کا حوالہ دے کر باقی گھروں سے بے وفائی نہیں کر سکتا....
نہ بشام سے' نہ فیری میڈو سے.... وادی رُوپل اور ترشنگ سے بھی نہیں....
ردوس کی گھاس سے بھی نہیں.... پائیو کی شام سے بھی نہیں.... اشکولے سے کیسے
بے وفائی کروں.... وادی سوختر آباد کے سنو ٹائیگر مجھے زرد نظروں سے دیکھیں گے.... جھیل
رومبر کے پانی مجھ سے خفا ہوں گے.... سنو لیک پر رواں بادبانی کشتیاں مجھ سے شکایت
ریں گی.. بُرجی لاء کی ٹاپ سے جو عظیم ترین پہاڑی منظر دکھائی دیتا ہے.... اور جو صرف
ں نے دیکھا ہے میرے سوا بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے.... تو یہ وہ گھر ہیں جن کے
وازوں پر.... جب میں مزید بوڑھا اور لاچار ہو جاؤں گا تو دستک دوں گا....
تو ان گھروں میں ایک اور گھر.... بھگتاپُور کا بھی سہی....
میں اور سُنہری بابا ایک ٹیکسی میں سوار سربستہ رازوں کے آخری شہر بھگتاپُور جا
ہے تھے.... ہم جا تو نگر کوٹ رہے تھے' ایورسٹ کے دودھیا درشن کے دوار پر.... لیکن
ل شمینے نے ایورسٹ کو ناک آوٹ کر دیا تھا.... سرگوشی نے بیک آوٹ کیا تو ہمشیرہ بھی
ر ہو گئیں کہ یہ گم ہو گئی تو کون اِسے تلاش کرے گا۔
ملک صاحب کانفرنس کی اختتامی رپورٹ تیار کر رہے تھے اس لئے حسب معمول
را ساتھ نہ دے سکتے تھے۔
اور فاروق.... لاپتہ ہو گیا تھا.... ہر شخص کے اپنے اپنے راز ہوتے ہیں۔
تو اب ہم دونوں تھے.... میں اور سُنہری بابا....
"سُنہری بابا.... کہاں جائے گا؟" میں نے کھٹمنڈو کے آخری ناشتے کے آخری لقمے
اختتام پر اُن سے بصد ادب پوچھا۔
باہر.... ہوٹل سولتی کے ڈائننگ روم کے باہر لان میں وہی فوارہ اُبل رہا تھا جو
نڈو کی ہر صبح اُبلتا تھا.... پچھلی شب کی ناکامیوں کو یاد کر کے اُبلتا تھا او ذرا زور لگا کر اُبل
ورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ بوسہ بازی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔
"کہاں جائے گا؟"

"بھگتا پُور جائے گا۔"

"وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟"

"وہ بھگت لوگوں کا.... سادھو سنت لوگوں کا شہر ہے.... پیروں فقیروں کا شہر ہے"

"آئی سی میں کتنا ہوگا؟"

"پتہ نہیں.... یہ تو اُس ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھیں گے جو ہمیں وہاں لے جائے گا"

ہم دونوں شاید پہلی بار اِس قیامِ نیپال کے دوران ہوٹل سے نکلے تو ناکم نکلے.... نہ گمشدہ آس پاس تھی نہ ہمشیرہ.... ذرا جھانک لیتے ہیں.... ہمارے ہم سفر تھے نہ ملک تھا اور نہ فاروق۔

یہ عجیب شش جہت گروپ تھا جس کے سارے کے سارے آئینے الگ الگ تھے.... اور ہر آئینے کا اپنا مزاج اور اپنی کیفیت تھی لیکن اس کے باوجود کوئی اپنے مزاج اپنی کیفیت کو دوسروں پر ٹھونستا نہ تھا۔ بلکہ ہم مزاج و ہم کیفیت ہو جاتا تھا.... ان پانچ آئینوں میں صرف دوستی اور مفاہمت کی شکل نظر آتی تھی.... چنانچہ میں اور سُنہری بابا قابل فہم طور پر قدرے اداس اور تنہا تھے.... جیسے چھ سُروں والے کسی ہندو دیوتا کے چار سر الگ ہو جائیں تو وہ صرف دو سُروں کے ساتھ اپنے سنگھاسن پر براجمان قدرے اداس اور تنہا ہوتا ہے۔

ہوٹل سولتی سے نکل کر ہم نے متعدد ٹیکسی ڈرائیوروں سے اُس گھونگھا شکل کے شہرِ ماضی بھگتاپُور تک کے اٹھارہ کلومیٹر فاصلے کے لئے مذاکرات کئے.... بلکہ صرف سُنہری بابا نے کئے۔

سُنہری بابا کسی بھی ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کرتے بلکہ حکم دیتے جیسے وہ اُن کے کسی ڈرامے میں بلنگ کا بھوکا ٹیلی ویژن سٹیشن کی راہداریوں میں گھومتا سمال ٹائم ایکٹر ہو۔

"بھگتا پُور چلو...."

ایک دو نے تو کہا "نہیں چلتا۔"

اور پھر ایک نے کہا "چلو...."

"کتنا پیسہ؟"

وہ بتاتا کہ کتنا پیسہ....

"آئی سی میں کتنا؟"

وہ یہ بھی بتا دیتا.... ہم حساب کرتے تو وہ کرایہ ہمارے حساب کتاب سے بلند ہو کر بالا ہی بالا پرواز کر جاتا....

....کہ ہمارا حساب اُس رقم میں قید تھا جو ملک نے جُوئے کی میز پر جیتی تھی.... اگرچہ اُس نے یہ رقم دان کر دی تھی کہ آپ لوگ جی بھر کے اس حرام کی کمائی سے جوا کھیلیں.... لیکن ہم شرفا میں سے تھے اِسے بچائے رکھا کہ اس غیر قانونی آمدنی سے نگرکوٹ کی زیارت کریں گے اور ایورسٹ دیکھیں گے.... نگرکوٹ پشمینے سے مار کھا گیا تو ہم نے اسے بھگتاپُور کے لئے وقف کر دیا۔

ایک اور ٹیکسی تھی تو میں نے جنگ و جدل پر آمادہ ایک شمشیر بہ کف سپاہی کی طرح اُس کی جانب بڑھتے ہوئے سُنہری بابا کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں پرے دھکیلا اور بنفسِ نفیس ڈرائیور سے گفت و شنید شروع کر دی.... "ہیلو تھاپا.... کیا حال ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نہ صرف موم ہو گیا بلکہ مُجھے ایک اوتار جان کر درشتی نظروں سے دیکھنے لگا "کیسا جانتا ہے کہ میرا نام تھاپا ہے۔"

"ہم بھگت لوگ ہیں آپ کا شکل دیکھا تو جان گیا کہ یہ تو اپنا تھاپا ہے۔"

اور حقیقت اس بھگتی کی وہی تھی جو میں بیان کر چکا ہوں کہ جیسے آپ وادی ہنزہ میں ہر دوسرے شخص کو "بیگ صاحب کیا حال چال ہے" کہہ سکتے ہیں اور وہ دوسرا شخص بیگ ہی ہوگا.... اسی طرح نیپال میں ہر جانب ہر سائز کے تھاپاز پائے جاتے ہیں.... "تو تھاپا بھائی.... ہم بھگت لوگ ذرا یاترا کے لئے بھگتاپُور جائے گا.... صرف جائے گا' لوٹے گا نہیں.. تو کتنا کرایہ ہوگا۔"

"پانچ سو نیپالی۔"

"بھگت لوگوں کے لئے کم نہیں ہوگا؟"

"نیپال میں عام لوگ کم ہوتا ہے اور بھگت لوگ زیادہ ہوتا ہے.... ادھر دیوتا بھی بہت ہے تو اُن کا بھگت بھی بہت ہے.. تو کیا کرے...."

"یار ہم غیر ملکی بھگت ہیں۔"

"کیا کرے۔"

"یار ہم بگلا بھگت ہے کچھ تو کم کرو۔"

"یہ والا بھگت تو ہم نہیں جانتا.... چلو ساڑھے چار سو روپے دے گا۔"

"دے گا۔"

ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے میں نے تھاپا برادر سے یونہی پوچھا "اگر ہم بھگتاپور سے واپس بھی تمہارے ساتھ آئیں تو پھر کتنا پیسہ ہو گا؟"

"اُدھر کتنا ٹائم ٹھہرے گا؟"

"اُدھر زیادہ ٹائم نہیں لگائے گا.... اپنے بھائی بندوں سے ملے گا۔ درشن کرے گا، ماتھا ٹیکے گا اور واپس آجائے گا۔"

"کس کو ماتھا ٹیکے گا؟" تھاپا نے اس کے بعد کوئی درجن بھر نہایت مشکل ناموں والے دیوی دیوتاؤں کے نام گنوائے اور وہ لوگ جو میرے نام کو مشکل سمجھتے ہیں اگر اُنہیں ان نیپالی دیوی دیوتاؤں کے نام سنائے جائیں تو وہ غش کھا جائیں اور میرے نام کو بہت ہی سہل جانیں۔

"ان سب کو ماتھا ٹیکے گا...."

وہ ذرا ناراض ہو گیا اور کوئی ایک نام لے کر بولا "اُس کو بھی ماتھا ٹیکے گا.... وہ تو کوئی اچھا دیوتا نہیں ہے۔"

میں جان گیا کہ یہاں بھی کوئی شیعہ سنی کا مسئلہ ہے۔ "نہیں نہیں اُس کے پاس بھی نہیں جائے گا تم بتاؤ کتنا پیسہ۔"

"چلو ساڑھے چار سو روپے.... یہ نہیں دیتا تو ہم جاتا ہے"

"یہ جانے جانے کا ہے؟"

"نہیں جانے آنے کا ہے۔"

"لیکن تھاپا برادر ابھی ابھی تو آپ اتنی ہی رقم میں جانے جانے کا بتایا تھا۔"

"یہ بھی بولا تھا کہ وہاں سے آپ کو چھوڑ کر خالی واپس آئے گا.... خالی آئے گا تو آپ کو بھی بٹھا کر لے آئے گا تو کرایہ وہی ہو گا۔"

عجیب نامعقول قوم تھی کہ جانے جانے کا بھی وہی اور آنے جانے کا بھی وہی۔

ڈنٹ لوگ کی مجبوری سے فی الفور فائدہ اُٹھانے کی رتی بھر کوشش نہ کرتی تھی.... کرایہ بل نہیں کرتی تھی.... ان کفار کے طور طریقے ہماری سمجھ سے باہر تھے....

ٹیکسی.... تھاپا کی.... مُجھے اور سُنہری بابا کو لے کر بھگتاپور کے لئے روانہ ہو گئی۔

وہ حضرت محل کی قبر کی قربت میں سے ہو کر گزری.... قبر دکھائی نہ دی صرف وہ ہڑ کا درخت دکھائی دیا جو دن کی روشنی میں بھی پُرملال تھا۔ ہلکی ہوا کے ساتھ ذرا خم کھا ر جھکتا تھا اور شاید میری طرف جھکتا تھا....

اُس کے سامنے دیوی کا استھان تالاب کے گدلے پانیوں میں سویر کی اولین وپ میں روشن ہو رہا تھا۔ اور مُجھے پھر ہوٹل سولتی کے ڈائننگ رُوم کے باہر جو فوارہ بے چین ہو کر اُبلتا تھا.... وہ یاد آیا.... کہ وہ اس سمے سُنہری کرنوں میں رنگا جا چکا ہو گا اور ب تپتے بدن کی طرح اُس کا ایک ایک رُواں.... پانی کا ایک ایک قطرہ اُس دھوپ میں ک الگ دکھائی دے رہا ہو گا....

میں نے جان بوجھ کر اپنے دوست درختوں کا ذکر نہیں کیا.... وہ جان چکے تھے کہ کھٹمنڈو میں میرا آخری دن ہے.... اُن کے شگوفوں کے الاؤ خوش تھے کہ میں قید سے ل کر بالآخر اِس شہر کی زنجیروں سے پرے کہیں اور جاتا ہوں.... کہ وہ یہی چاہتے تھے....

میں نے کل شام.... اتنے دنوں بعد ذرا فراغت پا کر اُس کارڈ کو بہ نظر غور دیکھا ل پر پتلے بانس کی لچکیلی سیڑھی.... سری جانا شرما کا نام لکھا تھا.... کانفرنس کی قید میں میں ول چکا تھا کہ کبھی کراچی ایئرپورٹ پر ایئربس میں داخل ہونے والے مسافروں کی طویل طار میں وہ بھی تھی جس کے بیگ میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں اور اُس نے کارڈ دے کر ہا تھا کہ کھٹمنڈو پہنچتے ہی مُجھے فون کرنا.... تمہیں اپنا شہر دکھاؤں گی۔"

میں نے فون کیا....

"ہو آر یُو؟" اُدھر سے ایک احتیاط پسند آواز آئی اور اس کے پس منظر میں ایسے تھے اور ہلکی سرگوشیاں تھیں جو ایک کامیاب پارٹی کی دلیل ہوتی ہیں۔

میں نے اپنا نام بتایا اور مُجھے عادت تھی کہ جب میں اپنا نام بتاؤں تو دوسری جانب سے بدترین حالت میں بھی "اوہو آپ ہیں...." سُنوں.... تو میں بے حد دل شکستہ ہوا جب اُس نے کہا "کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟"

"کراچی ایئرپورٹ پر.. ایئربس میں سوار ہوئے تھے.... آپ کے بیگ میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں اور میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی کی کڑیوں کے الگ الگ ہو جانے کا خطرہ مول لیتے ہوئے وہ بیگ اُٹھایا تھا.... یاد ہے؟"

"اوہو...." اُس کی یادداشت فوراً لوٹ آئی "تو یہ آپ ہیں.... آپ کہاں ہیں؟"

"ہوٹل سولتی اِن.... کمرہ نمبر پانچ سو پچاس۔"

"میرے پاس ابھی کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں، لیکن میں ابھی آتی ہوں.. ایک گھنٹے کے اندر اندر.... کیا آپ میرا انتظار کریں گے...."

"آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟"

"ہم دربار مرگ کے کسی ہوٹل میں کھانا کھا سکتے ہیں.... کسی بار میں بیٹھ کر ڈرافٹ بیئر پی سکتے ہیں اور نیپالی سموسے کھا سکتے ہیں.. آپ ہمارے مہمان ہیں.... میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

"ابھی تو نہیں۔" میں ذرا جھجک گیا.... کیونکہ میں نے ایک سوشل کال کی تھی اور مُجھے قطعی طور پر اُمید نہیں تھی کہ اُدھر سے کوئی آفر آجائے گی "ابھی ہم لوگ ذرا کیسینو تک جا رہے ہیں.. اور کل صبح نگرکوٹ جا رہے ہیں تو...."

"نگرکوٹ.. اُدھر تو آپ نے جانا ہے تو آج شام ہی چلے جایئے۔ وہاں جتنے بھی ہوٹل ہیں اُن سب کی کھڑکیاں ایورسٹ اور اناپورنا پر کھلتی ہیں.... صبح سویرے اُن کی برفوں کو دھیرے دھیرے روشن ہوتے دیکھئے.... اُن کے سامنے ناشتہ کیجئے اور واپس کھٹمنڈو آجایئے۔ صبح جانے کا کوئی فائدہ نہیں...." اور اُس لمحے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم نگرکوٹ نہیں جائیں گے.... اور ایورسٹ کی بلندی ایک پشمینے کی چادر سی بھی کم ہو جائے گی....

"بس اسی قسم کا پروگرام ہے.... تو...."

"تو پلیز آئندہ کسی بھی دن آپ مُجھے ٹیلی فون کرلیں میں آپ کے ہمراہ چلوں گی اور آپ کو اپنا شہر دکھاؤں گی.... ویسے آپ کو کورین فوڈ پسند ہے؟"

"نارتھ کورین یا ساؤتھ کورین....؟" میں نے کہا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ کھٹمنڈو کی سیر کے بعد میں جانتی ہوں کہ شہر میں بہترین خوراک ایک نہایت لاجواب کورین ریستوران میں ملتی ہے.... ہم وہاں کھانا کھائیں گے"

"اوکے"

"تو پھر میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی... صرف یہ ہے کہ چار بجے تک میں اپنے آفس میں مصروف رہتی ہوں اور اُس کے بعد آپ مُجھے فون کرلیجئے گا.. کریں گے؟"

"بالکل۔"

اور میں اُس لچکیلی سیڑھی خاتون کو یہ نہ بتا سکا کہ میں نہیں کروں گا.... کیونکہ میں اگلی دوپہر ساڑھے چار بجے اُس کے شہر کو چھوڑ رہا تھا۔

"بالکل" میں نے پھر کہا "میں دوبارہ فون کروں گا۔"

"اور اُس بیگ میں اینٹیں نہیں، کتابیں تھیں.. میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔"

اُس کی مترنم جل ترنگ آواز آئی.... اور کھٹمنڈو کی شب میں ایک فون پر ایک مترنم آواز کو سنتے ہوئے مُجھے "کاما سُوترا" کے مصنف کا ایک اور قول یاد آیا کہ جہاں ایک خاتون کے لئے کچھ بدنی اور کچھ حسیاتی شرائط ہیں وہاں اُس خاتون کو مردوں کا دل لبھانے کے لئے پانی سے بھرے متعدد پیالوں کو ایک چھڑی سے چھیڑتے ہوئے دل پذیر موسیقی تخلیق کرنے کا ہنر بھی آنا چاہئے.... جسے ہم ان دنوں جل ترنگ کا نام دیتے ہیں.... تو اُس بانس کی سیڑھی کی آواز میں کاما سُوترا کے جل ترنگ پیالے بجتے تھے۔

میں اور سُنہری بابا قیام کھٹمنڈو کے دوران پہلی بار اس شہر کی قید سے آزاد ہوئے....

شہر پیچھے رہ گیا لیکن آبادی ختم نہ ہوئی۔

جدید فلیٹ، پُرانے گھر.... کچے برتنوں کے شوروم.... آسمان وسیع ہوگیا... اور حیرت انگیز طور پر ان ماڈرن فلیٹوں کو جاتے ہوئے راستے کچے تھے اور اُن کے آس پاس کھیت تھے جن میں موسمی سبزیوں کی بیلیں اور فصلیں تھیں اور جہاں کچھ نہ تھا وہاں گھاس تھی۔ اِسی شاہراہ پر جس پر تھاپا کی ٹیکسی دوڑتی تھی اس کی دائیں جانب سڑک کی عین اوپر الیکٹرک کیبلز کا ایک سلسلہ تھا جس کے ساتھ جڑی ہوئی کوئی بس ایک ہموار رفتار سے مخالف سمت میں چلی جاتی تھی۔

بس سٹاپوں پر لوگ کھڑے تھے.... کھٹمنڈو شہر میں روزی کمانے والے اُدھر جا رہے تھے جدھر سے ہم آ رہے تھے....

بائیں ہاتھ پر جب عمارتیں کم ہوئیں اور وادی کھٹمنڈو کی ہریالی وسیع ہوئی تو اُس میں ایک دریا پھیلنے لگا جس کے کناروں پر بے شمار خواتین یا تو گھریلو کپڑے پیٹ پیٹ کر دھوتی تھیں یا اُس میں اپنے آپ کو دھوتی اور اشنان کرتی تھیں.... اور ایسے کرتی تھیں کہ کھٹمنڈو ایئرپورٹ پر متعین زنانہ پولیس کے براڈ چیس کی مانند اُن کے براڈ چیس بھیگتی ساڑھیوں میں بدن سے چپکتے نمایاں ہوتے تھے یا اُن کی ناف سے اوپر جو حصے تھے اُنہیں وہ تازہ ہوا اور دُھوپ سے آشنائی کی خاطر کھلا چھوڑتی تھیں....

اور سوائے ہمارے اُنہیں کوئی نہیں دیکھتا تھا.... کیونکہ ہم ایک پاک سرزمین سے آئے تھے.... اُنہیں جی بھر کے دیکھتے تھے اور لاحول پڑھ کر اپنے اس گناہ کی تلافی کر دیتے تھے۔

"تارڑ صاحب آپ نے دیکھا؟" سُنہری بابا نے اپنی مومن داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا اور ایسے کہا کہ نظر دریا کنارے نیم برہنہ نیپالی خواتین کے بالائی حصوں سے ہرگز جدا نہ ہو....

"سُنہری بابا.... میں نے آج سے تقریباً پینتیس یا شاید اڑتیس برس پیشتر فرانس کے ایک ساحلی جزیرے "آئل ڈی لیواں" میں اتفاقاً قدم رنجہ فرمایا تھا اور اُن زمانوں میں ابھی ٹاپ لیس یا نیوڈ ساحلوں کا رواج نہیں ہوا تھا بلکہ آج کی نسبت تو نہایت باپردہ اور پرہیزگار زمانے تھے تو اُس جزیرے میں داخلے کی شرط صرف یہ تھی کہ جو بھی آئے صرف برہنہ پا ہی نہیں برہنہ بدن بھی آئے اور اگر وہ ازحد شرمیلا ہے تو زیادہ سے زیادہ جاپانی سُومو پہلوان کی برائے نام سی لنگوٹی پہن کر آئے۔ اور یہ لنگوٹیاں وہاں لنگر انداز ہوتے ہی خریدی جاسکتی تھیں' تو اُس جزیرے میں مَیں انسانی بدن کی اُکتا دینے والی یکسانیت سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ اول اول تو خون کی گردش تیز کرتا اور بے قابو کرتا ہے اور پھر مسلسل دیکھنے سے اُس کی عادت ہو جاتی ہے اور وہ آپ کو بالکل ٹھنڈا کر دیتا ہے.... یہاں تک کہ وہ مظاہر قدرت کے مقابلے میں.... بھدا اور بے سُرا لگنے لگتا ہے۔ میں نے وہاں ایک ہینڈ پمپ سے پانی بھرتی خواتین کے ڈھیلے اور اُلجھتے ہوئے بدن کو دیکھا۔ مقامی چرچ میں اُن

ہلت غیر میں موم بتیاں جلاتے دیکھا تو انسانی بدن کی یکسر یکسانیت سے آگاہ ہوا اور بیزار ہوا.... اُس کا بھید اور شہوت صرف پردے اور لباس میں پنہاں تھی.... تو میں دیکھ چکا ہوں.... مجھے ترغیب نہ دیجئے...."

"یہ تو عمر کا تقاضا ہے۔" سُنہری بابا نے ایک سُنہری بچھو کی طرح سُنہری ڈنگ مارا۔

"شاید ایسا ہی ہے.... لیکن مجھے اب بھی وینس ڈی میلو یا ڈیوڈ کے بدنی تناسب ایکسائٹ کرتے ہیں.... تو یہ وینس اور ڈیوڈ اس دُنیا میں کتنے ہوں گے اور کہاں سے لائیں گے.... میرے لئے اب وینس جھیل کرومبر کے پانی ہیں اور اُن میں اُترتی سیڑھیاں ہیں اور ڈیوڈ کی پرفیکشن مجھے کے ٹو میں نظر آتی ہے.... اسے آپ عمر کا تقاضا کہہ لیجئے۔"

تھاپا ٹیکسی ڈرائیور بہت زیادہ تھاپا تھا یعنی بہت زیادہ سیریس تھا اور مسافر حضرات کے ساتھ خوشگوار گپ شپ پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا.... اس لئے ہم اطمینان سے خاموشی سے آس پاس کی لینڈ سکیپ پر نظر رکھتے ہوئے جا رہے تھے۔

بائیں جانب وادی کھٹمنڈو میں پھیلی آبادیوں اور سرسبز ٹیلوں کے اُوپر اُس آسمان کے بیچ جو دُھند سے خالی کبھی کبھی ہوتا تھا دو آنکھیں معلق تھیں اور ہماری اُس ٹیکسی کو گھورتی تھیں جو ہمیں بھگتاپور لے جا رہی تھی.... یہ سیاہ کھلی آنکھیں ایک ایسے ایئر بیلون پر پینٹ کی گئی تھیں جو وادی کے آسمان کے درمیان جا کر جیسے ٹھہر گیا تھا.... نیپال کی پہچان.... سٹوپا کی دو آنکھیں جو اگرچہ انسانی ہاتھوں نے بنائی تھیں لیکن اُن میں ایک عجیب معمہ کشش تھی کہ انسان اُن آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا....

یہی دو آنکھیں وادی کھٹمنڈو پر معلق ایئر بیلون پر کھلی تھیں۔

میں نے ایک ٹورسٹ میگزین میں اس کمرشل بیلون رائڈ کا اشتہار پڑھا تھا....

"آیئے اور وادی کھٹمنڈو کے اوپر ایک بیلون میں سوار ہو کر دُنیا کے عظیم ترین نظاروں کی قربت میں ہو جائیے۔ اگر دُھند نہ ہوئی تو آپ کو ایورسٹ اور اناپورنا ایسے دکھائی دیں گے کہ آپ ہاتھ بڑھا کر اُنہیں چُھو سکتے ہیں.... بلکہ ان کی برفوں سے ایک مٹھی بھر کر اپنے شیمپین کی بوتل کی بالٹی میں ڈال سکتے ہیں.... آپ دُھند ہونے کی صورت میں وادی کھٹمنڈو پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی اس بیلون فلائٹ کا کرایہ صرف دو سو ڈالر ہے.... چانس کی نشست کے لئے صرف ڈیڑھ سو ڈالر...."

میرے جیسے بندے کی جیب میں اگر دو سو ڈالر فالتو ہوں تو وہ خود طائر ہو سکتا ہے۔ اُسے کسی بیلون کی ضرورت پیش نہیں آئے گی....

ہم بہت مرتبہ طائر ہو چکے تھے....

منطق الطیر کے ایک طائر ہو چکے تھے.... ایک پکھیرو کی صورت میں....

وادیٔ سوختر آباد پر پرواز کر چکے تھے....

کے ٹو کے گرد ایک مچھر ہیلی کاپٹر میں سوار اُس کی چوٹی کا طواف کر چکے تھے۔

اور اس کے باوجود ہمارے پر نہیں جلے تھے....

اگرچہ ہم ایک معصوم پرندے کی بجائے اب ایک تجربہ کار گدھ ہو چکے تھے۔

تو ہمیں پرواز کے لئے دو سو ڈالر خرچ کر کے کسی بیلون میں سوار ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

فراٹے بھرتی اُس ٹیکسی میں سے صرف وہ بیلون دکھائی دیتا تھا جو ایک بیوقوف لبوترے چاند کی طرح وادیٔ کھٹمنڈو پر معلق تھا۔ وہ سیاح نہ دِکھتے تھے جو اُس کے نیچے لٹکتی ایک بانس کی ٹوکری میں کھڑے اپنے دو سو ڈالر کے خرچے پر شاید نادم ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا....

ہم زمین پر تھے اور وہ جو ڈالروں والے تھے آسمان پر تھے....

"دریائے ہنومانتے اور شائد... ایورسٹ کی برفیں"

"بھگتا پور.... اس جانب" کا بورڈ نظر آیا اور ہم اُس جانب مُڑ گئے۔

دائیں جانب جو کھیت تھے اُن میں ہریاول تو تھی لیکن وادیٔ مانسہرہ کے دھان کے کھیتوں ایسی بھیگتی ہوئی گیلے سبز پینٹ والی تازگی نہ تھی....

اور سرسوں بھی تھی.... لیکن اُس میں بھی وہ شوخی وہ دمک نہ تھی جو مئی جون کی گرمیوں میں ہمارے املتاس کے گچھوں میں سے ایک ایسی پھوار کی صورت اُترتی ہے کہ ہوائیں اور چہرے اُس زرد پھوار سے زرد ہو جاتے ہیں.... یہ کچھ بجھی بجھی سی سرسوں تھی.... اگرچہ ادھر بھی بسنت کا تہوار منایا جاتا تھا.... لیکن یہ سرسوں کچھ زیادہ بسنتی نہ تھی۔

ہم سے نیچے بائیں جانب دریائے ہنومانتے تھا جو وادی کے کھیتوں میں ایک اُدھیڑ عمر اژدھے کی مانند سُستی سے لیٹا ہوا تھا اور اُس کے اُوپر وادی کی جو ہری اور کم بلندیوں والی اُونچائیاں تھیں اُن کے اُوپر کچھ برفوں نے جھانکا.... اُنہوں نے بھی شاید ہمشیرہ کا تکیہ کلام سُن لیا تھا کہ ذرا جھانکنے میں کیا حرج ہے.... برفپوش ہمالیہ کی سفید زنجیر جھانکنے لگی لیکن اُس کے جھانکنے میں حرج تھا کیونکہ اُس نے جہاں میرا دل روک لیا تھا وہاں مجھے آزردہ بھی کیا تھا....

میں نیپال میں آمد کے بعد پہلی بار "پہاڑ" دیکھ رہا تھا.... یہ میری ملکیت تھے اور تما آج سہ پہر ان تک اپنا حق جتانے کے بغیر ساڑھے چار بجے کی ایئربس میں اِن سے جُدا

ہو رہا تھا.... میرے پاس ان کی قانونی ملکیت کے ٹھوس ثبوت تھے.... میرے جوگرز، ایک سنو جیکٹ، ٹریک سُوٹ اور گرم بنیانیں جو ہوٹل سولتی کے کمرہ نمبر پانچ سو پچاس میں ایک سُوٹ کیس کی تہہ میں رکھے تھے اور میری ملکیت کے ڈاکومنٹس تھے....

میں نے واخان پامیر ٹریک کے دوران وادی سونج کے گھاس بھرے میدانوں میں.... جہاں میرے گھوڑے کے سموں سے تتلیوں کی سفید ڈھول اُٹھتی تھی خوشحال سے پوچھا تھا "یہ وادی کس کی ہے؟"

"صاحب یہ وادی اُس کی ہے جس میں یہاں پہنچنے کی ہمت ہے۔" اُس نے کہا تھا۔

ایک آوارہ گرد۔ ایک کوہ نورد دُنیا داروں سے اس لئے بہت سپیریئر ہوتا ہے کہ وہ اُن خطروں کو مول لیتا ہے جو نہ اُسے دولت سے مالا مال کرتے ہیں اور نہ ثواب کا باعث بنتے ہیں.... وہ کسی بھی غرض کے تحت اپنی جان کو داؤ پر نہیں لگاتا بلکہ یہ اُس کے من کی موج ہوتی ہے جو دُنیا داروں کے حساب کتاب میں سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا ہے.... لیکن وہ بیوپاری نہیں ہوتا.... چونکہ وہ بے غرض ہوتا ہے اس لئے وہ جس وادی میں پہنچا ہے، جس جھیل تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ اُسی کی ہو جاتی ہے.... ان وادیوں اور جھیلوں کا کوئی شاک ایکسچینج نہیں ہوتا.... ان کے حصے کبھی نہیں گرتے کہ یہ اُن کی پہنچ میں ہی نہیں ہوتے جو کاروبار کرتے ہیں۔

نانگا پربت کے دامن کی مٹیالی جھیل، سنو لیک، جھیل کرومبر اور کنول لیک اور وادی سونج اسی لئے میری ملکیت میں آچکی تھیں.... اگرچہ فصیل کشور ہندوستان بھی میری ملکیت تھی لیکن اُس کی پکی رجسٹری تبھی میرے نام ہونی تھی اگر میں اُس کے اندر تک پہنچ جاتا.... اور یہ اب اور ساڑھے چار بجے کے درمیان ممکن نہ تھا۔

ان برف پوش ہمالیائی بلندیوں میں سے کوئی ایک ایورسٹ تھی.... لیکن مجھے اُس کی پہچان نہ تھی.... بہت دنوں سے یہ بادلوں اور دُھند میں چھپی ہوئی تھی اور آج پہلی بار وہ ظاہر ہوئی تھی۔ ایک ایسے زائر کے لئے ظاہر ہوئی تھی جو آیا تو اُس کی زیارت کو تھا لیکن راستے میں آسائشوں کے مندروں کی گھنٹیاں بجاتا رہا.... اور قمار خانوں میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا۔

دریائے ہنومانتے کے نیم مُردہ اژدہا پانیوں میں اُس کی سفیدی کی کوئی جھلک نہ تھی کہ وہ ایک طویل فاصلے پر تھی....

ہم جس روڈ پر سفر کرتے تھے اُسے چینی روڈ کہا جاتا تھا.... بجلی کی تاروں سے بندھی ایک مسافر ٹرالی ہر چند منٹ کے بعد گذر جاتی تھی۔

اس چینی روڈ سے الگ ہو کر جب ہم بائیں ہاتھ کو ہو گئے تو وہاں سڑک کے کنارے ایک اور بورڈ نظر آیا "نگرکوٹ.... ۱۵ کلومیٹر"

"نگرکوٹ بھی ادھر ہے؟"

"بھگتاپُور سے آگے فارٹی فائیو منٹ کا ٹریول ہے.... جائے گا؟" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کیوں سُنہری بابا.... جائے گا؟.... رسم دُنیا بھی ہے اور دستور بھی ہے.."

"جناب اُدھر کی خوبی تو یہی ہے ناں کہ وہاں سے ایورسٹ نظر آتی ہے.... تو یہاں سے بھی نظر آ رہی ہے...."

"کونسی ہے؟"

"دریائے ہنومانتے کے اُوپر جو برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے ہیں ان میں سے کوئی سی بھی ہو سکتی ہے.... تارڑ صاحب آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کونسی ہے.... برفیں ساری کی ساری ایک جیسی ہوتی ہیں...."

"سُنہری بابا آپ میرے ایک بچپن کے دوست پھتو شیخ سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ وہ خواتین کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ "رنگ برنگیاں ہانڈیاں تے تھلے اِکو جئے"....

"نہ کوئی فرق ہوتا ہے؟" سُنہری بابا تاؤ کھا گئے....

"اگر آپ کو اپنی ریش مبارک کے باوجود ہانڈیوں کا کوئی تجربہ ہو تو.... فرق ہوتا ہے"

"مثلاً؟"

"مثلاً کے لئے "کاما سوترا" سے رجوع کیجئے۔"

"میں آپ سے رجوع کرتا ہوں۔ اور جس قسم کی واہیات اور مخرب الاخلاق گفتگو آپ فرماتے ہیں اُس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک ماڈرن کاما سوترا لکھنے کی

اہلیت رکھتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہ منحصر ہے اس بات پر کہ وہ ہانڈی کسی مٹی کی بنی ہوئی ہے.... اُس مٹی کے مزاج میں کیا کیا گندھا ہوا ہے.... وہ محبت کے آوے میں پکی ہوئی ہے یا چاک سے کچی ہی اُتاری گئی ہے.... وہ سلگتے اُپلوں کی آگ پر چڑھ کر اپنے اندر پکنے والے گوشت کو نرم کرتی ہے یا لوہے کی طرح سخت اور بے جان کر دیتی ہے۔ یا پھر اُس کی مٹی کی مہک بند کمروں میں بھی دُھومیں مچاتی ہے اور جو کوئی دروازہ کھول کر اندر آتا ہے وہ جان جاتا ہے کہ یہ محبت کی آوے میں پکنے والوں کے سامان ہیں.... اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا...."

"اس سے زیادہ آپ اور کیا کچھ کہہ سکتے ہیں.... پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے.... شاید جنون میں کہہ رہے تھے.... چنانچہ ہم نگرکوٹ اس لئے بھی نہیں جاسکتے کہ ہم ساڑھے چار بجے روانہ ہونے والی فلائٹ کو مِس کرنے کا رِسک نہیں لے سکتے۔"

"سر آپ بالکل درست فرماتے ہیں.... ہم دُنیا دار لوگ ہیں اور یہ رِسک نہیں لے سکتے۔"

میں اگر تنہا ہوتا تو یہ رسک یقیناً لے لیتا.... کم از کم کچی رجسٹری تو ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک فلائٹ مِس ہو جاتی.... ایورسٹ تو مِس نہ ہوتی۔

ٹیکسی رُک گئی....

"بھگتا پور۔" تھاپا نے ایسی بیزاری سے کہا جیسے ایک گُجری دیوار پر ایک اور اُپلا تھاپتے ہوئے کہتی ہے "ایک اور اُپلا"۔

"بودی شاہ... مسلمان بُت فروش اور کالی دیوی"

قدیم دیو مالائی قصّوں اور تبت کی بُدھ داستانوں میں بھی بھگتاپُور کا ذکر آتا ہے.... اور اس کے شہر کو ایک سمندری گھونگھے کی شکل کا بیان کیا جاتا ہے جس کے ندر داستانوی حیثیت کے مندر اور عبادت گاہیں اور عمارتیں ہیں اور اس کی آبادی میں مرف وہ بھگت ہیں جو یہاں پرستش اور نروان کے لئے آتے ہیں.... ان میں ہم جیسے بگلا بھگتوں کا ذکر نہیں۔ ٹیکسی رُکی تو میں نے باہر آکر ہمالیہ کی دور دراز برفوں کو ذرا قریب لا کر دیکھنے کی کوشش کی.... اُس کی برفوں میں میرے سینے میں ٹھنڈ نہ پڑی کہ وہ بہت دُور تھیں.... جیسے نانگا پربت کو شاہراہِ ریشم سے دیکھ لیا جائے.... کے ٹو کو برجی لاء کے درّے پر کھڑے ہو کر اُس کی سینکڑوں کلو میٹر دُوری کو نزدیک لانے کی آرزو کی جائے.... جیسے ایک محبوب چہرے کی تصویر ایک دھوکا ہوتی ہے.... ایسے یہاں سے بھگتاپُور سے ایورسٹ کی سفیدی ایک دھوکا تھی.... اگرچہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان ہمالیائی چوٹیوں میں سے کونسی ایکا ہے جو سربلندیوں کی ملکہ ہے۔

"دو گھنٹے میں واپس آجائے گا؟" تھاپا نے ناراض ہو کر پوچھا۔

"آجائے گا.... انشاء اللہ"

میرے انشاء اللہ کہنے سے تھاپا ذرا مشکوک ہو گیا "آپ کیسا بھگت ھے؟"

یقیناً نیپال میں بھی بھگتوں کی مختلف اقسام پائی جاتی ہوں گی.... مختلف فرقے اور قبیلے ہوں گے.... شیعہ، سنی، بریلوی، اہلِ حدیث اور وہابی بھگت ہوں گے اور ایک

دوسرے کی جان کے پیاسے بھگت ہوں گے.... لیکن ہم تو آگاہ نہ تھے۔

"ہم دونوں بگلا بھگت ہے تھاپا.... میں ذرا سانولا بھگت ہوں اور یہ داڑھی والا.... سُنہری بھگت ہے اور یہ ہم دونوں کی ملی بھگت ہے...."

"کیسا بھگت ہے؟"

"بس ہم ایسا بھگت ہے اور بس دو گھنٹے میں واپس آجائے گا"....

ہم ٹیکسی سے اُترے ہیں تو ایک خوشگوار نیپالی رنگ کی.... سرسبز اور ذور برفانی کشادگی کا احساس ہوا جو کھٹمنڈو میں مفقود تھی.... یہاں سانس لینے میں آسانی تھی....

اور ہم ٹیکسی سے اُترے ہیں تو.... ایک منحنی سا جھکا ہوا نہایت مسکین اور بجھا ہوا سا شخص زندگی سے رنجیدہ اور ناخوش کہ.... زندگی نے اُسے کچھ نہیں دیا تھا ہمارے آس پاس جانے کس آس میں اپنی فاقہ زدہ یا چرس زدہ کھال کھنچی ہوئی کھوپڑی کو سہلانے لگا اور اُس کی کھوپڑی پر جو پچکے ہوئے گال نما تھے وہ کم از کم دو تین ہفتے پیشتر کسی کھنڈے اُسترے کی زد میں آئے تھے اور اس کھوپڑی کے اُوپر ایک باریک نامعلوم سی چند باریک بالوں کی لٹ لٹکتی تھی اور یہ وہی بودی تھی جو ہمارے ہاں سیاسی کارٹونوں میں ہندوؤں کے سر سے لٹکتی ہے.... جانے ہندو کارٹونسٹ مسلمان حضرات کے کارٹون بناتے ہوئے اُن کے بدن کا کونسا حصہ لٹکاتے ہیں....

ظاہر ہے وہ ہماری توجہ کا طالب تھا....

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا.... اِس بودی شاہ سے پوچھا....

جواب میں اُس نے صرف سکڑتی رگوں سے بنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے "گائیڈ ہے صاحب...."

"کیا دکھائے گا؟" سُنہری بابا نے نہایت تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا.... وہ اس سے بھی کسی ڈرامے میں اداکاری کے جوہر دکھانے کے تمنائی کسی سمال ٹائم ایکٹر کی طرح مخاطب ہوئے....

جواب میں بودی شاہ نے ایک نہایت عاجزانہ تقریر کسی نامانوس زبان میں کی جس کے آخر میں اُس سے بھی زیادہ نامانوس دیوی دیوتاؤں کے نام عقیدت سے لئے اور پھر کہا "صاحب میرے پاس لائسنس نہیں ہے؟"

"گاڑی چلائے گا۔ پستول چلائے گا.... کس شے کا لائسنس نہیں ہے؟"

"جی صاحب...." وہ پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا "گائیڈ ہے صاحب"

"تو کس شے کا لائسنس نہیں ہے؟"

"صاحب ادھر نیپال میں گائیڈ کا لائسنس صرف اُسے ملتا ہے جو پڑھا لکھا ہو.... بلغ گیا ہو.... صاحب ہم پڑھا لکھا نہیں چوری چھپے یہ دھندا کرتا ہے لیکن صاحب.... ہم بھگت پُور کا رہنے والا ہے.... اِس گائیڈ لوگ سے زیادہ جانتا ہے' ہمارا انگلش ٹھیک نہیں لیکن ہم جانتا ہے کہ کس دیوی کی چرن چھونے سے آپ سورگ میں جائے گا...." وہ اتنا مسکین اور اتنا اپنے آپ کو پیچھے پیچھے رکھنے والا اور آپ پر سوار نہ ہو جانے والا معصوم سا دہ تھا کہ میں انکار نہ کر سکا.... اور یوں بھی مجھے اُس کی بودی پسند آگئی تھی جو بھگت پُور کی ہواؤں میں ایک لال دوپٹے کی طرح لہرا رہی تھی۔

"کتنا آئی سی ہو گا؟" یہ ظاہر ہے میرا نہیں سُنہری بابا کا سوال ہی ہو سکتا تھا....

"سو روپے دے گا تو ہم خوش ہو جائے گا صاحب...."

"پچاس روپے دے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب...." اُس نے بودیِ تسلیم خم کر دی....

بھگتاپُور کی یاترا کے دوران مسلسل سُنہری بابا صرف اس بات پر کڑھتے رہے کہ اگر ہم اِس بودی بابا کو پچیس روپے بھی آفر کر دیتے تو وہ مان جاتا....

ہم.... میں.... سُنہری بابا اور جھکا ہوا بودی شاہ بھگتاپُور کے دامن میں کھڑے تھے....

دامن میں ایسے کھڑے تھے جیسے شاہ گوری کے بیس کیمپ میں اُس پر نظر ڈالتے ہوں....

ٹاپ میدان سے نانگا پربت پر سے اُترنے والے کسی برفانی تودے کی گونج اور سفیدی کو تکتے ہوں....

لیکن بھگتاپُور کے دامن سے جو بُرج مینار سے دکھائی دیتے تھے وہ برف اور چٹانوں کے نہ تھے' پگوڈوں' مندروں اور کئی سو برس قدیم آماجگاہوں کے تھے۔

بھگتوں کا یہ عجوبہ شہر جو ایک عجائب گھر کی طرح نیپال کی قدیم ثقافت اور آخرت

کے عقیدوں کو سنبھالے ہوئے تھا ہم سے ذرا بلندی پر اُٹھتا تھا.... اور اُس کے پُرانے وجود تک ایک صاف سُتھری سڑک اُٹھتی تھی جس کے آخر میں سیڑھیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا اور پھر وہاں ایک دروازہ تھا جو آپ کو اِس شہر طلسمات کے اندر لے جاتا تھا۔ داخلے کے لئے ٹکٹ مقرر تھا....

اور ہم ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کی کھڑکی کے اوپر درج شدہ داخلہ رقم مبلغ تین سو روپے دیکھ کر ہراساں ہو گئے کہ ہم اس شہر کو دیکھنے آئے تھے' خریدنے نہ آئے تھے.... لیکن یہ شرح غیرملکیوں کے لئے تھی.... ڈالروں کے حساب کتاب کے مطابق تھی اور اُس کے نیچے سارک ممالک کے غریب غربا کے لئے صرف تیس روپے کی نوید تھی۔

میں اور سُنہری بابا جو اس تین سو روپے کو دیکھ کر بھگتاپُور یاترا تیاگ دینے کو تھے.... تیس روپے کی نوید سے ازحد نہال ہوئے....

میرے داخلے کے ٹکٹ کا نمبر ۹۹۳۵ تھا.... اور یہ میری یادداشت کا معجزہ نہیں ہے مجھے تو اپنا ٹیلی فون نمبر بتاتے ہوئے بھی دِقت ہوتی ہے.... یہ کمال ہے اُس ٹکٹ کا جسے میں نے سنبھال لیا تھا اور اب میری سٹڈی ٹیبل پر میرے سامنے رکھا ہے.... اور اِس سامنے والے ٹکٹ پر تیس روپے کے اندراج کے نیچے "ویلکم ٹو دی سٹی آف کلچر".... درج ہے.... ٹکٹ پر بھگتاپُور کے مندروں اور عبادت گاہوں کی ایک خوبصورت ڈرائنگ ہے.... اور یہ بھی درج ہے کہ اس رقم سے بھگتاپُور کی قدیم یادگاروں کی دیکھ بھال اور مرمت ہوتی ہے.... بلکہ یہ بھی کھلا کہ بھگتاپُور میں ہمہ وقت جرمن آثار قدیمہ کے ماہرین کی ایک ٹیم موجود رہتی ہے جو مندروں' لکڑی کے جھروکوں' کھڑکیوں' صحنوں' تالابوں اور مجسموں کو اُن کی اصل شکل میں محفوظ رکھنے اور اُنہیں شدید موسموں کی شکست و ریخت سے بچانے کا جتن کرتی ہے....

اگرچہ میر نے بھی کسی سے پُوچھا تھا کہ دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے.... لیکن ہمیں کسی سے پوچھنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ہمارے سامنے جو راستہ اُٹھتا تھا تو یہ اُن بھگتوں کے دل اور جان سے اُٹھتا تھا جو اِس قدیم بستی کے درشن کو جانے کہاں کہاں سے آتے تھے.... اور اِس راستے کے اختتام پر وہ دروازہ تھا جس کی اندر اُن کا شہرِ آرزو تھا....

اور ہر شہرِ آرزو عقیدے اور عشق کے نقشوں سے اور جذبوں کے اینٹ گارے سے تخلیق ہوتا ہے۔

اور ہر ذی نفس کا شہرِ آرزو الگ الگ ہوتا ہے....

سوہنی کے لئے چناب کے بپھرتے پانیوں کے پار جو ایک کُلی یار کی دکھتی ہے....

ایک جھونپڑا مہینوال کا جو نظر آتا ہے بس وہی شہر آرزو ہے....

ایک کوہ نورد کے لئے کوئی پانیوں کا شہر.... ایک جھیل بھی آرزو کی تکمیل ہو سکتی ہے....

ہم سیاہ غلافِ کی پہلی جھلک پر اپنے سارے شہر قربان کر دیتے ہیں اور سکھ ننکانہ صاحب کے نظر آتے ہی جھک کر اُس مٹی کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

کسی اور کے شہرِ آرزو میں داخل ہوتے ہوئے یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ ہم اُس شوق اور دیوانگی کا ایک ذرہ بھی محسوس کر سکیں جو اُن کے عقیدے اور عشق میں ہے جن کا کہ وہ شہرِ آرزو ہے۔

دروازے.... بھگتاپُور کے دروازے تک اُٹھتی صاف ستھری سڑک کے کنارے حسب معمول ٹورسٹ حضرات کے لئے نیپالی ہینڈی کرافٹس اور یادگاری تحفے فٹ پاتھ پر سجے تھے.... دوکانداروں کی بجائے وہاں زیادہ تر دوکانداریاں یعنی خواتین تھیں.... کچھ تبتی کچھ نیپالی لیکن ہر دو اقسام نہایت بے ضرر تھیں.... ایک نوجوان لڑکا لپکتا ہوا ہمارے تعاقب میں چلا آیا اور اُس کے ہاتھوں میں بھی وہی پلاسٹک کا لارڈ بدھا تھا جو تھمل میں اُس نیپالی بچے کے ہاتھ میں تھا کہ آئی۔گو۔یُو گڈ پرائس.... لارڈ بدھا فار ٹو ہنڈرڈ روپیز....

اور اس نوجوان نے بولی پانچ سو روپے سے شروع کی.... لیکن وہ اعصاب پر سوار ہوتا تھا' نہایت دھیمے لہجے میں مہاتما کا سودا کرتا تھا "اسے گھر میں رکھو گے تو لکشمی اُترے گی' نروان ملے گا۔ یہ اچھی خرید ہے.... پانچ سو میں لارڈ بدھا کیا بُرا ہے.... اس کے گلے میں اگر کنول کے پھُول ڈالے تو یہ خوش ہو گا.... نہیں ڈالو گے تو ناراض نہیں ہو گا.... گُڈ لارڈ بدھا...."

"نہیں نہیں...." میں نے مسکرا کر کہا "ہم ان لارڈ کے خیالات اور شخصیت کے پُجاری ہیں لیکن ان کے نہیں۔"

نوجوان ذرا ٹھٹک گیا "بدھا کو نہیں مانتا"

"نہیں۔"

"شیوا کو مانتا ہے.... اُس کا ماسک بھی میرے پاس ہے.... ہنومان جی بھی ہے"

"یار ہم ان کو بھی نہیں مانتا.... اور ان تینوں کے نزدیک ہم سخت بے دین ٹھہرتے ہیں"

وہ کچھ دیر خاموشی سے ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا.... ذرا شش و پنج میں مبتلا رہا اور پھر کہنے لگا "آپ ہندوستان سے نہیں آیا؟"

"نہیں۔"

"تو کدھر سے آیا ہے؟"

"پاکستان سے۔"

"اصل پاکستان سے۔" اُس نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

"ہاں.... سو فیصد سچل.... چوبیس کیرٹ کے دمکتے سُنہری پاکستان سے...." یہ جواب سُنہری بابا کی جانب سے آیا....

"مسلمان ہے؟"

میں اگرچہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ ہاں.... نصف مسلمان ہے.... سؤر نہیں کھاتا.... البتہ دیگر قباحتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور بندہ سخت شرمندہ ہے لیکن میں نے صرف "ہاں۔" کہنے پر اکتفا کیا۔

نوجوان نے میرے چہرے پر سے نظریں ہٹائے بغیر بدھا زمین پر رکھا اور اُس کی شکل پر ایک ایسی خوشی آئی جو ایک بچے کے چہرے پر آتی ہے جب وہ زندگی میں پہلی بار آئس کریم کھاتا ہے۔

"السلام و علیکم۔" اُس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"وعلیکم السلام۔" سنہری بابا نے فوراً اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

"میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام محمد اعجاز ہے۔ نیپالی ہوں اور .... آئی ایم اے مسلم...."

"اچھے مسلمان ہو بُتوں کا کاروبار کرتے ہو۔"

"یہ تو کسی اور کے بھگوان ہیں صاحب.... ہمارے تو نہیں.... ان کے بیچنے سے ہمارا یا جاتا ہے۔" محمد اعجاز نیپالی کی اس منطق سے مجھے وہ سردار صاحب یاد آ گئے جو ایک ندی نالی میں ہاتھ چلا رہے تھے اور ساتھ ساتھ دعائیں کر رہے تھے کہ یا اللہ میری چونی جائے.... یا اللہ اس نالی میں جو میری چونی گر گئی ہے وہ مل جائے۔ ایک اور سردار جی کا زر ہوا تو وہ سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے اوئے بھاپے کیسا خالصہ ہے کہ اللہ کا نام لے ہا ہے واہ گرو سے مدد نہیں مانگتا.... تو نالی میں ہاتھ چلانے والے سردار صاحب نے کہا' لو ں نالی میں گری چونی کے لئے اپنے واہ گرو کو کیوں تکلیف دوں....

ویسے محمد اعجاز نیپالی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہم اپنے پیارے پاکستان میں اپنے گوانوں کو کھلے عام فروخت کرتے ہیں.... ان کی بولی لگاتے ہیں.... ان کے عذاب کی نوید سنا ر عوام الناس کا ستیاناس کرتے ہیں.... وقت آنے پر تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر اللہ ہی اللہ کرتے ں اور سوس بینکوں اور رائے ونڈ کی طرف نکل جاتے ہیں.... اپنے گھوڑوں کو سوس اکلیٹ کھلاتے ہیں.... اور عوام کو کہتے ہیں کہ بھگوانوں کے لئے قربان ہو جانے کے لئے یار ہو جائیں....

"محمد اعجاز تم سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی...." ...اور یہ حقیقت ہے کہ گتوں کے شہر میں داخل ہوتے ہوئے یہاں کی اقلیتی برادری سے مل کر نہایت مسرت ہوئی.... ہم اپنے ہاں تو اپنی اقلیتوں کے شانتی نگر اور مندر وغیرہ ڈھا دیتے ہیں پتہ نہیں نیپالی ہندو اپنے دھرم کو پوتر رکھنے کے لئے ایسے نیک اقدام کرتے ہیں یا نہیں....

محمد اعجاز وہ پاسبان تھا جو بت خانے کے باہر اپنے ایمان کو سنبھالتا تھا....

اور ہم وہ تھے جو آخری عمر میں مسلمان ہونے جا رہے تھے.... اگرچہ خاک ہونے جا رہے تھے۔

بودی شاہ ہمارے آگے آگے چلا جا رہا تھا اور مسلسل کچھ جنتر منتر اور دیوی دیوتاؤں کے نام الاپتا جا رہا تھا.... اور اس کی باریک بودی ایورسٹ کی برفوں کے پس منظر میں اور مارچ کے مہینے کی ٹھنڈک میں کبھی کبھی ہوا کے زور سے فضا میں ایک پژمردہ کینچلیے کی طرح اُٹھتی تھی اور پھر اُس کی گردن پر گر جاتی تھی....

مجھے یہاں وہ پروفیشنل لمبے سیاہ چوغوں والے حضرات یاد آ گئے جو آپ کے

ساتھ مشہد میں امام رضا کے روضے پر اپنے آپ کو ایک پُرتقدس چال کے ساتھ نتھی کر لیتے ہیں... زیرِ لب... جانے کیا کیا پڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر آپ کے ہاتھوں کو ایک دھکا دے کر کہتے ہیں "دُعا..."...اور جب آپ دُعا سے فارغ ہو کر رُخصت ہونے لگتے ہیں تو وہ آپ کا دامن تھام کر دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہیں "دُعا کے پیسے..." اگرچہ یہ بودی شاہ اُن کی نسبت نہایت دھیما اور مسکین تھا...

سڑک کا اختتام ہوا تو سیڑھیاں شروع ہو گئیں...

ان کے اختتام پر... بہت اُوپر بھگتا پُور کے شہرِ آرزو کا دروازہ کھلا تھا...

سیڑھیوں کے ساتھ جو دیوار اُٹھتی تھی... اُس میں طاق اور جھروکے تھے جن میں بجھے ہوئے دیئے اور ہار تھے...

اور شنید تھی کہ اگر آپ بھگتا پُور میں سرِشام آئیں تو اُس کی جانب جانے والے تمام راستوں اور پگڈنڈیوں پر دیئے جلتے ہیں... اور اُنہیں جلانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی آرزوئیں ناتمام ہوتی ہیں۔

بھگتا پُور کے گیٹ سے ذرا اِدھر بائیں ہاتھ پر بودی شاہ کو بریک لگ گئی' وہ رُکا اُدھر کو جھکا' ہاتھ جوڑے' اپنی بودی کو سنوارا اور کہنے لگا "یہ کالی دیوی کا مندر ہے۔"

بودی شاہ نے اگرچہ نام کسی اور دیوی کا لیا تھا جو میں یاد نہیں رکھ سکا اور اگر ہم اُسے کالی دیوی کہہ دیں تو کیا فرق پڑتا ہے... ایک بدھ یا ہندو کو بھی تو شیعہ' سنی یا وہابی سے کوئی فرق نہیں پڑتا...

وہاں اُس مندر کے جھروکے میں کوئی دیوی تھی... اُس کے آگے کچھ پجاری ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور مجھے جو دیوی نظر آئی وہ کچھ معیوب سی نظر آئی۔

مندر کے باہر ایک بنی سنوری بکری کھڑی تھی... جیسے کسی بیوٹی پارلر سے سنگھار کر کے آئی ہو... اُس کے سینگوں کے درمیان سُرخ رنگ کے تھوبے تھے جیسے دیتی اپنے ماتھے پر پشوپتی ناتھ جی کے ہاں سے تھپوا کر آئی تھی...

"یہ بکری بلی کے لئے ہے..." بودی شاہ بولا "ابھی اس کا بلیدان ہو گا دیوی کے چرنوں میں...

بکری بے چاری نہایت پُرمسرت حالت میں کبھی کبھار "باں آں" کر دیتی تھی

دراپنے سینگوں کے درمیان ماتھے پر سُرخ تلک لگوا کر نہایت معزز اور برگزیدہ محسوس کر رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہ سارے ہار سنگھار اور چاہتیں تھوڑی دیر میں اُس کا گلا ہلاک کر رکھ دیں گے... جیسے عید قربان کے لئے تیار شدہ بکرا یہ ہرگز نہیں جانتا کہ اُس کے ان کو جو مہندی لگائی جا رہی ہے اُسے سجایا جا رہا ہے اور سینگوں کے ساتھ گیس کے غبارے باندھے جا رہے ہیں تو یہ سب کے سب سامانِ مرگ ہیں...

"بھگتا پُور... ہیون سانگ اور مارکو پولو اِن دربار چوک"

بھگتا پُور کے شہر آرزو کے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہوئے ہم پر نہ رقت طاری ہوئی اور نہ ہمارے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں اتریں اس لئے کہ ہم جینوئن بھگت نہ تھے... بگلا بھگت تھے...

دروازے کے اندر دائیں جانب کچھ قدیم گھر تھے... کچھ نیم شکستہ مکان تھے جن کی اینٹیں دیواروں کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں... کھڑکیاں چوکور اور اندھی تھیں اور میں یقیناً ایک ایسے گھر میں اپنی زندگی کے آخری ایّام نہیں گذار سکتا تھا... ایک عجیب مردنی تھی ان پُرانی آماجگاہوں میں...

ہمارے سوا اور بھی سیاح تھے جو حیران اور متاثر ہونے کے لئے بھگتا پُور آئے تھے...

یہ سیاحتی رزمیئے کا ایک عجیب قصہ ہے کہ سیاح پہلے سے فیصلہ کر کے آتا ہے کہ وہ تاج محل، اہرام مصر یا آئفل ٹاور کو دیکھ کر حیران ہو گا اور اور متاثر ہو گا... بے شک اِن انسانی عجائبات پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد وہ دل ہی دل میں سخت مایوس اور نامُراد ہو... تاج محل کی قربت میں جمنا کے کنارے وہ کیچڑ اور بھینسیں دیکھے... اہرام مصر کے بے ہنگم پتھروں کے مجموعے کو دیکھ کر مایوس ہو... یا آئفل ٹاور کو ایک مُردہ آہنی پرندے کی طرح پیرس کے آسمان پر اپنے منحوس پنجے گاڑے دیکھے... لیکن وہ پہلے سے طے کر کے آتا ہے...

وہ انہیں دیکھ کر حیران ہو گا اور متاثر ہو گا... اور اِس ڈیوٹی کو سرانجام دیتا ہے... بے شک اپنی سیاحتوں کے دوران وہ ہندوستان کے پنک سٹی جے پُور میں "ہوا محل" کے طلسم میں گرفتار ہو۔ مصر کے شہر سکندریہ کی کسی سانولی شکل میں اُسے عمر بھر کی مسافتوں کی کشش دکھائی دے یا پیرس میں دریائے سین کے کسی پُل کے کسی ایک مجسّمے کو نظر بھر کے دیکھتا رہے... پھر بھی اُس کی ڈیوٹی یہی ہے کہ وہ تاج، اہرام اور آئفل کے گُن گائے...

کچھ اسی طور ہمارے سوا جو سیاح تھے وہ بھگتا پُور میں حیران اور متاثر ہونے کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔

ذرا آگے ایک اور چوکور اور بلند دروازہ تھا۔

ایک چوکھٹا تھا جس کے پار بھگتا پُور اور دربار سکوئر تھا...

اور اِسی سکوئر کے بارے میں اِی اے پاول نے کہا تھا کہ اگر نیپال میں اور کچھ نہ ہوتا... صرف بھگتا پُور کا دربار سکوئر ہوتا... تب بھی آدھی دنیا کی مسافت طے کرنے کے بعد صرف اُسے دیکھنا جائز ٹھہرتا...

اِس دروازے کے پہرے دار دو شیر نما مجسّمے تھے جن کی گردن کے بال مینڈھیوں کی شکل میں گندھے ہوئے تھے جیسے ایک زمانے میں پنجاب کے دیہات میں مٹیاریں اپنے بال مینڈھیوں کی شکل میں گندھواتی تھیں اور اپنی طرف سے نہایت ماڈسکوڈ ہو جاتی تھیں... اگرچہ ان دنوں وہی سٹائل "فرنچ بَن" کی صورت میں قبولِ عام کی سند پا چکا ہے۔

بھگتا پُور کی حفاظت پر معمور جو شیر تھے... اُن کے بال اگر مینڈھیوں کی صورت میں گندھے ہوئے تھے تو یقیناً اُن کی شیرنیوں نے پیار سے گوندھے ہوں گے کہ ایک شیر چاہے وہ کتنا ہی شیر کیوں نہ ہو بہ ذاتِ خود اپنے پنجوں سے تو اُنہیں گوندھ نہیں سکتا تھا۔

ایک جھکا ہوا... بودی شاہ کا بھائی نیپالی چست پاجامے اور چادر میں لپٹا ہوا کاندھے پر ایک بانس بیلنس کئے اور اُس کے سروں پر دو ٹوکریاں اُٹھائے ہم سے لاتعلق بلکہ رنجیدہ... چلا جا رہا تھا... جیسے ہمارے ہاں... دال اور چنے بیچنے والے اپنا بوجھ اُٹھائے چلے جاتے ہیں...

بھگتا پُور کے چوک میں اگرچہ اُس پر جھکا جو آسمان تھا جس کے ایک کنارے پر

کشور ہندوستان کی سفیدی تھی جو یہاں سے دکھائی نہ دیتی تھی... نیلا اور شفاف تھا...

دھوپ ہر شے کو ظاہر کرتی تھی... اُسے برہنہ کرتی تھی۔

دربار چوک کی سُرخ اینٹوں کے فرش پر کوئی سایہ نہ تھا...

جو زینہ بہ زینہ بلند ہوتے چھتری نما مندر تھے اور اُن کے کلس سُنہری تھے... اور ان کے عقب میں بھی سفید برفوں کی جھالر تھی...

اور اُن کے وجود میں سُرخی کا رنگ گوڑھا تھا' لیکن اس کے باوجود...

اس کے باوجود... کہ یہ لمحۂ موجود میں تھا... یہ یہاں نہ تھا... ہزاروں برس پیشتر کا ایک فلیش بیک تھا... لمحۂ موجود کا پردہ اُٹھ چکا تھا اور ہم تماشائی تھے ایک ایسے منظر کے جو ہندو اور بدھ مت کی ہزاروں برس سے کسی مندر یا گمشدہ سٹوپا میں بھوج پتر پر لکھی گئی فراموش کردہ پوتر تحریروں میں تھا... ہم ان کی عبادت پڑھنے سے قاصر تھے لیکن اُسے اپنے سامنے دیکھ سکتے تھے... یا تو بھگتا پُور کسی فلم کا سیٹ تھا... اور یا ہم ٹائم بیریئر کراس کر کے بہت پیچھے سفر کر گئے تھے... یہاں اگر ہیون سانگ نظر آ جاتا' مارکو پولو دکھائی دے جاتا... یا ابن بطوطہ اپنی تازہ ترین اہلیہ کے ہمراہ طویل لبادے اور پھندنے والی ٹوپی میں کسی مندر کی گیلری میں واقع ریستوران میں بیٹھا کلب سینڈوچ کے ہمراہ ٹیوبرگ بیئر کے گھونٹ بھرتا پایا جاتا تو ہمیں کوئی اچنبھہ نہ ہوتا... اور ابن بطوطہ کی بیئر سعودی عرب میں کشید کردہ "نان الکوہلک بیئر" ہوتی... اور ہیون سانگ چینی رائس وائن سے دل بہلاتا اور مارکو پولو سُرخ کیانتی سے اپنا غم غلط کرتا کہ واپسی پر اُس نے اپنی زندگی کے آخری ایام ایک عقوبت خانے میں بسر کرنے تھے...

جیسے نانگا پربت کے رُوپل چہرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹاپ میدان میں ایک ایسی ہی کیفیت مجھ پر اُتری تھی کہ ہم کوہ نورد پچھلے زمانوں میں چلے گئے تھے... ہم ہمالیائی پہاڑوں کے اندر پوشیدہ ایک خطے میں داخل ہو گئے تھے کہ نانگا پربت پاکستان کی رشک آمیز بلندیوں میں سے واحد چوٹی ایسی ہے جو کوہ ہمالیہ کی زنجیر کی آخری کڑی ہے... تو یہی کیفیت یہاں بھی تھی... بھگتا پُور کے پس منظر میں جو کشور ہندوستاں تھی اگر ہم پرندے ہوتے اور اُس پر پرواز کرتے چلے جاتے تو نانگا پربت تک جا پہنچتے اور وہیں گھونسلا بنا لیتے کہ وہی ہمارا وطن تھا... وہی ہمارا گھونسلا تھا...

بھگتا پُور چوک میں صرف چند ایک سیاح تھے۔ جن کی نیلی جینیں' پریشان بال اور بکھرے اس گمان کو جھٹلاتے تھے کہ ہم اُن زمانوں میں نہیں ہیں جب ہیون سانگ ادھر آیا تھا...

بودی شاہ مسلسل بولے چلا جا رہا تھا اور پتہ نہیں کیا کیا بولے چلا جا رہا تھا۔

ہم اُس کے عقیدے اور عشق سے ناواقف تھے اور ناہمدرد تھے... اس لئے وہ جو بھی کہتا تھا اُس سے ناواقف تھے اور ہم پر اثر نہ ہوتا تھا۔

میں اگر اس بودی شاہ کو دمشق کے قبرستان باب الصغیر میں مدفون بلال حبشی کے مزار پر لے جاؤں اور اُن کی صفات بیان کرتا چلا جاؤں تو کیا اس پر اثر ہو گا؟...

اس دربار چوک میں جتنی بھی شاندار عمارتیں تھیں اُن میں سے بیشتر کا سنگِ بنیاد آج سے بارہ سو برس پیشتر رکھا گیا تھا... ابھی محمود غزنوی کی آمد میں دو سو برس کا وقفہ تھا... استنبول ابھی قسطنطنیہ تھا... قصر الحمرا اور مسجد قرطبہ ابھی وجود میں نہ آئے تھے اور اُندلس موروں کا ملک تھا اور یورپ اپنے بدن کو کھالوں سے ڈھک کر ایک نیم وحشی زندگی گزارتا تھا... تب اِن عمارتوں کا سنگِ بنیاد رکھا گیا... اور وہ کیسے آرکیٹکٹ تھے جن کے ذہن میں ایسے محیر العقول نقشے آئے اور وہ کیسے باکمال معمار تھے جنہوں نے اِنہیں تعمیر کیا اور وہ کیسے ذوقِ جمال کے لوگ تھے جنہوں نے اِن کی آرائش کی... اگرچہ ان سے بھی سینکڑوں برس پیشتر "شکنتلا" کا عظیم ڈرامہ نویس کالی داس گزر چکا تھا جو یونانی المیہ نگاروں... سفوکولیس' یوروپی ڈیز اور ایس کلس سے کسی طور کم نہ تھا اور جس کے ڈراموں میں ہرن یوں زقندیں بھرتے تھے کہ اپنے بدن پیچھے چھوڑتے تھے اور اُس کے میک اپ رُوم میں اداکارائیں وہی باتیں کرتی تھیں جو آج کے ٹیلی ویژن کے میک اپ رُوم میں بھی... وہی باتیں کرتی ہیں۔

لیکن ہمارے سامنے جو عمارتیں تھیں وہ مکمل طور پر بارہ سو برس قدیم نہ تھیں... مسلسل زلزلوں اور موسمی آفات کے باعث وہ منہدم ہوتی رہیں اور پھر سے تعمیر کی جاتی رہیں... یہاں بھی ایک اور گولڈن گیٹ ہے... جس پر تانبے کو ایسے ڈھالا گیا ہے کہ اُس کے نقش باقاعدہ سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں' کھٹمنڈو کے اُس دروازے کی مانند جسے فلارنس میں واقع "گیٹ آف پیراڈائز"... گبرتی کے تخلیق کردہ دروازے سے

تشبیہ دی جاتی ہے...

اس گیٹ کے اندر تالیجو مندر ہے...

اور ہمارا بودی شاہ منتروں کا الاپ کرتا ہمیں اس کے اندر لے جا رہا تھا...

مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ یہ بودی شاہ جو شاید ٹورسٹ سیزن میں ہر روز کسی نہ کسی آسامی کے ساتھ اس مندر میں جاتا ہے تو اُس کے الاپ میں کوئی مکانکی کمرشل ازم نہ تھی کہ وہ صرف ڈیوٹی کے طور پر یہ شبد الاپتا ہے بلکہ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک طویل مسافت کے بعد اس مندر میں پہنچا ہے اور پہلی بار اُس میں داخل ہو رہا ہے اور لبیک کہتا ہوا اپنے خداؤں کی توصیف کرتا ہے۔

مندر کے اندر آب و ہوا گرم مرطوب اور بے آرام کرنے والی تھی اگرچہ یہ مندر اوپن ایئر تھا... یہاں بھی کچھ زمینی بھگوان تھے جن پر اُبلے ہوئے رنگین چاول، تیل اور گیندے کے پھول پڑے تھے... بائیں ہاتھ پر ایک منقش پتھریلا دروازہ تھا جس کے اندر مندر کا پوشیدہ اور مُقدّس حصّہ تھا... یہاں ایک بورڈ پر انگریزی زبان میں ایک وارننگ درج تھی کہ یہاں سے آگے صرف ہندو جا سکتے ہیں... لیکن اس پر یہ درج نہ تھا کہ اگر ہندوؤں کے فلاں فرقے کے لوگ عبادت کے لئے اندر آئیں گے تو جس جگہ پر وہ عبادت کر کے فرار ہو جائیں گے اُسے کھود کر دوبارہ تعمیر کیا جائے گا تاکہ ناپاکی دُور کی جا سکے...

بودی شاہ اپنا رام نام جپتا دندناتا ہوا اندر چلا گیا اور ہم دونوں رُک گئے...

"کیوں تارڑ صاحب... اندر چلیں... کسی کو کیا پتہ کہ ہم کیا ہیں۔"

"ہمیں خود نہیں پتہ کہ ہم کیا ہیں... میں تو شکل سے خاصا براہمن اور رگ وید کے وطن کا پجاری لگتا ہوں... لیکن آپ جیسا سُنہری ہندو تو خال خال ملتا ہے..."

"دیکھیں تو سہی اندر کیا ہے؟"

"سُنہری بابا... اندر ایک مندر ہے... اندر وہی کچھ ہو گا جو ہم پچھلے ایک ہفتے سے دیکھ رہے ہیں اور عاجز آ چکے ہیں... یُوں بھی ایک مندر کے لئے اپنا عقیدہ داؤ پر نہیں لگا سکتا..."

"کیا مطلب؟"

"کیا پتہ ہم اس کے اندر جائیں تو ہمیں کچھ ہو جائے..."

"کیا ہو جائے؟" سُنہری بابا چوکنے ہو گئے۔

"یہ بھیدوں کی بستی ہے... بھگتا پور ہے... اس مندر کے اندر جائیں تو کیا پتہ ہمارے سروں سے بودیاں لٹکنے لگیں، ماتھے پر تلک نمودار ہو جائیں اور بُت پرستی ہمارا شعار ہو جائے... تو یہ رسک نہیں لینا چاہئے..."

"آپ ٹھیک کہتے ہیں... آخری عمر میں کیا خاک بُت پرست ہوں گے... ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہئے۔"

میں نے گائیڈ بک میں پڑھ رکھا تھا کہ مندر کے اندر جو تالیجو چوک ہے اور کماری چوک ہے وہ قدیم نیپالی فن تعمیر کا ایک عجوبہ ہے... اور وہاں جو نقش و نگار اور مُورتیاں ہیں وہ ایمان کو متزلزل کرنے پر قادر ہیں... تو اسی لئے ہم نے اُس کے اندر جانے سے پرہیز کیا۔ بودی شاہ کیونکہ اپنے آپ میں غرق تھا اور اُس کا خیال تھا کہ ہم بے دام غلام پجاریوں کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اس لئے وہ سرہلاتا منتر جپتا اس مندر کے ستونوں کو بوسے دیتا، کبھی ادھر ہاتھ جوڑتا، کبھی اُدھر پرنام کرتا، کبھی فرش پر ماتھا ٹیکتا... بولتا چلا جا رہا تھا۔

اور ہم چوکھٹ کے اس جانب "اونلی فار ہندوز" کے بورڈ تلے رُکے کھڑے تھے... اور چوکھٹ کے پار تالیجو مندر کے ویران صحن میں بودی شاہ کے منتظر تھے...

گویا یہ چوکھٹ ایمان اور کفر کی سرحد تھی جس پر ہم کھڑے تھے...

کھینچے ہے مجھے کفر...

مندر میرے آگے...

اگرچہ سُنہری بابا یہ بیان دے چکے تھے کہ آخری عمر میں کیا خاک بُت پرست ہوں گے... لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہم آخری عمر میں مسلمان ہو رہے تھے... کیا خاک مسلمان ہو رہے تھے... اندر... مندر کے اندر... بودی شاہ ایک بے دام غلام کی طرح فرشی بھگوانوں اور ہاتھ جوڑے رقص کے انداز میں پتھر ہوئے دیوی دیوتاؤں کے چرنوں کو چُھوتا... اِن چرنوں میں بھینٹ کئے ہوئے گیندے کے پھولوں کو سجدے کرتا جب ایک ہمارے لئے ہیبت ناک آفت نُما دیوی کے سامنے ماتھا ٹیکتا اُٹھا اور اُٹھ کر خاصی دیر تک

اس دیوی کی فضیلت بیان کرتا رہا اور بالآخر پیچھے مُڑ کر دیکھا... تو ہم نہ تھے...

اُس نے اپنی بودی کو اِک عالم حیرت میں سنوارا اور شدید حیرت ناکی سے اِدھر اُدھر نگاہ کی... پورے مندر کو اپنی مہین نشہ باز آنکھوں سے کھنگالا اور پھر ہمیں دریافت کیا جو ابھی تک چوکھٹ کے اُس پار کھڑے تھے۔

وہ جھکا جھکا ہمارے پاس چلا آیا "صاحب آپ ادھر کیوں کھڑا ہے... اندر کیوں نہیں آتا؟"

"بھئی بودی شاہ"... سُنہری بابا نے نہایت مؤدب ہو کر کہا "اِدھر بورڈ پر درج ہے کہ ہندو لوگوں کے علاوہ داخلہ منع ہے..."

بودی شاہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہم کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں "تو آپ بُدھ ہیں؟"

ظاہر ہے ہم نے ابھی تک بودی شاہ کے گوش گزار نہیں کیا تھا کہ ہم کون ہیں، اور کیا ہیں اور ہم تو وہاں ہیں جہاں سے ہمیں اپنی خبر بھی نہیں آتی...

"نہیں..." سُنہری بابا جذبۂ تفاخر سے سیدھے ہو گئے "پاکستان... مسلمان"

بودی شاہ نے اپنی بودی اپنی ناتواں چٹکی میں بھر کر... اور وہاں بھرنے کے لئے چند بال ہی تھے... ذرا پریشان ہو کر کہا... اور ایسے کہا جیسے کوئی حسینہ اپنے ماتھے پر آئی لٹ کو پریشان کرتی ہے اور اِس شاہ صاحب کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دُنیا میں اُس کے عقیدے کے سوا کوئی اور بھی عقیدہ ممکن ہے... "آپ لوگ..." اور یہاں اُس نے درجنوں مشکل ناموں والے خداؤں کا تذکرہ کیا "آپ لوگ... اُن کا پجاری نہیں ہے؟"

"نہیں..."

"آپ بدھ ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو آپ کس کے پجاری ہیں؟"

"ہم اب جس کے بھی پجاری ہیں ہمارے آباؤ اجداد صنم گر تھے... ہمارے کعبے میں بھی... اگرچہ بتوں کی نسبت دور کی ہے لیکن ہے... بہرحال تازہ صورت حال یہ ہے کہ بُت پرستی موقوف ہے..."

بودی شاہ نے 'کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی... کی نظر سے ہمیں دیکھا اور پھر ہمیں ہایت پھرتی سے پتھروں اور فرشی بھگوانوں کو پھلانگتا پچپن کھڑکیوں والے عظیم محل کے ں بیک یارڈ میں لے گیا جس کے پوشیدہ وجود کی خبر باہر سے نہ ہوتی تھی...

مندر کی پتھریلی کائنات کا ایک کونے میں سے آہستہ آہستہ قدم دھرتے ایک ی راستے پر قدم دھرتے جب ہم بائیں جانب ہوئے تو وہاں ایک عظیم الشان ناگ پھن پھیلائے جیسے ہمیں کے لئے اُداس ہوتا تھا اور ہمارا منتظر ہوتا تھا کہ... وہاں آس پاس کوئی باج نہ تھا... صرف ہم تھے... اور وہ ناگ تھا... اور وہ ناگ ایورسٹ کی برفوں کے پس منظر ں... پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

ایک سراسر خشک تالاب کے درمیان میں سے وہ سانپ دیوتا اُٹھتا تھا... واسوکی ہم کا سانپ سر اُٹھاتا تھا اور اتنا بلند ہوتا تھا کہ اُس کے سُنہری پھن کے عقب میں ہمالیہ کی ہ برفیں تھیں اُن پر بھی اُس کا سُنہری پن اثر انداز ہو کر اُن کی سفیدی میں زرد کرنوں کی آمیزش کرتا تھا۔

یُوں لگتا ہے جیسے بھگتا پُور کے مندروں کے شہر میں ایک زرافہ اپنی گردن مزید لمبی کر کے آس پاس کا نظارہ کرنا چاہتا ہو... اور اُس زرافے کی گردن تھوتھنی سے ذرا اِدھر ہٹی ہو کر پھیل گئی ہو۔

یہ شنید ہے... کہ یہ تالاب اتنا پوتر تھا کہ اس میں اشنان کرنے کے لئے تبت اور ن سے بھی پجاری آتے تھے...

اور دیکھا جائے تو یہ پجاری کوئی اتنا کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیتے تھے کہ یہ نوں ملک... نیپال کی قربت میں ہیں۔

تالاب کے اردگرد مجسّموں کی ایک زندہ ہوتی کائنات تھی۔

یہاں سے سات میل کی دُوری سے زیر زمین پائپوں کے ذریعے تازہ پانی اس لاب تک پہنچایا جاتا تھا تاکہ یاتریوں کے بدن کو اس دنیا کی میل سے صاف کیا جا سکے...

میں اگر اس میں نہاتا تو میرے بدن کی میل سے تالاب کے پائپ بلاک ہو جاتے لہ میں نے سوائے اس دنیا کی میل کے اور کچھ حاصل نہ کیا تھا...

لیکن اب... اس لمحۂ موجود میں... ہمارے سامنے جو واسو کی سانپ دیوتا کھڑا تھا...

جس کے اردگرد ایک زمانے میں سونے کے پانی میں نہائے ہوئے مجسمے کھڑے تھے... اب یہ ایک ایسے کیکٹس کی طرح تنہا اور پیاسا کھڑا تھا جس کے اردگرد سوائے ایک لاانتہائی صحرا کے اور کچھ نہیں۔

اُس کے پجاری رُخصت ہو چکے تھے۔

لیکن... یہ واسوکی سانپ دیوتا جانتا تھا کہ اُس کے پجاری سراسر رُخصت نہیں ہوئے... وہ جانتا تھا کہ میں... جو اُس تالیجو مندر کے اندر نہیں گیا اور کماری چوک کی کشش کے باوجود نہیں گیا اور اُس کے چوکھٹ پر ایمان سلامت رکھنے کے لئے ٹھہر گیا تھا صرف میں تھا... جو اُس کا پجاری تھا۔

میں نے اُسے... اور اُس نے مجھے پہچان لیا تھا...

یہی وہ ناگ تھا... جو مجھے ہر برس ڈستا تھا۔

یہی وہ سانپ تھا جس کے زہر کے بغیر میرا بدن ٹوٹتا تھا... میں سارا سال منتظر رہتا تھا کہ کبَ وہ مجھے ڈسے اور کب میرا بدن بحال ہو...

یہ آوارگی اور عشقِ خاص کا سانپ تھا جو ذرہ برابر لحاظ نہ کرتا تھا کہ میری عمر کیا ہے... میں اُس کے زہر کو سہار بھی سکتا ہوں یا نہیں... یہ لحاظ نہیں کرتا تھا... ایک تنہا زہریلے کیکٹس کی مانند وہ ایک مدت سے خشک ہو چکے تالاب میں بلند ہو کر پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

"سائیں آ جائیں۔" سُنہری بابا کب کے اِس ہیبت ناک سانپ کے بلند ہوتے پھن سے تنگ آ کر واپس اُس گولڈن گیٹ تک پہنچ چکے تھے جس کے اُوپر پچپن کھڑکیاں جھکی ہوئی تھیں۔

میں اس مندر کے توبہ شکن ماحول سے باہر آیا تو باہر بھگتا پُور چوک میں ابھی تک ہیون سانگ... مارکو پولو اور ابن بطوطہ گھومتے تھے۔

وہ تینوں اُس عجوبہ محل کو تکتے تھے جس میں پچپن کھڑکیاں کھلی آنکھیں تھیں... اور ہر کھڑکی ایسی تھی کہ اُس کی قدامت اور کاریگری اگر تاج محل کے بیل بوٹوں سے بڑھ کر نہ تھی تو کم بھی نہ تھی...

لیکن یہ سب کی سب کھڑکیاں کھلی نہ تھیں... ان کے پٹ کھلے نہ تھے... مدت

سے بند تھے...

میں اُنہیں بھگتا پُور کے چوک میں تادیر تکتا رہا کہ ان پچپن کھڑکیوں میں سے کوئی ایک کھڑکی تو کھلے... اور اُس میں سے کوئی شکل ایسی نظر آئے جو تصویر نظر آئے۔

اس لئے کہ میں کھڑکیوں کا شیدا تھا۔

کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک آوارہ گرد کے لئے... بے شک وہ عمر رسیدہ اور شکستہ ہو چکا ہو... کوئی نہ کوئی کھڑکی ضرور کھلتی ہے اور اُس میں سے ایک چہرہ' راکاپوشی کی برفوں میں ڈوبنے اور گم ہو جانے والے زرد ماہتاب کی طرح ایک پل کو دکھائی دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ... آپ نے ہمارا پانی پیا؟

لیکن یہاں... بھگتا پُور میں... اُس کے دربار چوک میں... پوری پچپن کھڑکیوں میں سے کسی ایک کے کواڑ میرے لئے نہ کھلے۔

کوئی ایک کھڑکی تو کھل سکتی تھی... اور اُس میں سے ایک کماری... ایک لونگ لاڈلیں جھانک کر پوچھ سکتی تھی کہ... کون آیا پہن لباس کڑے... لیکن کماری مکمل طور پر مخبوط الحواس تو نہ تھی جو ایک سٹھیائے جانے کی قربت میں ایک بوڑھے کو پٹ کھول کر دیکھتی... اگرچہ وہ بوڑھا اپنے بھدے بدن میں ایک دلِ رعنا رکھتا تھا اور کماری سے ایسی دل نشیں اور عمر کے تفاوت کو بھلا دینے والی باتیں کر سکتا تھا جو کوئی بھی نوخیز بھگت نہیں کر سکتا تھا۔

بھگتا پُور کے تین بڑے چوک ہیں۔

دربا چوک...

تاؤ مادھی چوک...

اور دتہ ترایا چوک...

ان تینوں چوکوں میں ایک خصوصیت ایسی تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا... ئیں دیکھ کر اگر آپ ٹائم بیریئر کراس کر کے پچھلے زمانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور آپ کو ابن بطوطہ' ہیون سانگ اور مارکو پولو وغیرہ نظر آنے لگتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے سامنے جدید تہذیب کی کوئی علامت نہیں ہوتی... کوئی نیون سائن' کوکا کولا کے اشتہار' سائن بورڈ یا کوئی ماڈرن عمارت نہیں ہوتی اور عہد حاضر کا شائبہ صرف اور صرف

اِن میں گھومتے سیاحوں کے لباس اور کیمروں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ یہاں سیاحوں کے لئے تمام تر سہولتیں موجود ہیں... بین الاقوامی ٹیلی فون اور فیکس' پوسٹ آفس' ریستوران' کافی شاپس' باتھ رومز' سوونیئر شاپس' ہرشے موجود تھی لیکن او جھل اور اشتہاری پن سے عاری... یہ سہولتیں مندروں اور محلوں کی چار دیواریوں کے ساتھ پُرانے گھروں اور برآمدوں میں یُوں پوشیدہ ہیں کہ اُن کا وجود ان چوکوں کی قدامت میں مخل نہیں ہوتا...

اسی لئے تو ابن بطوطہ اپنے لمبے چوغے کے ساتھ دربار سکوئر میں موجود ہے اور پچپن کھڑکیوں والے اُس محل کو دیکھتا ہے جسے یونیسکو نے ورلڈ ہیرٹ ایج کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ وہ نہ صرف اُسے دیکھتا تھا بلکہ گولڈن گیٹ' ناگ دیوتا کے قدموں میں اُبلتے سُنہری فوارے' بٹ سالہ مندر' لکشمی مندر اور مٹی کے مندر کو بھی دیکھتا تھا...

اگرچہ چینی راہب ہیون سانگ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنے وطن سے بدھ یاترا کے لئے نکلا تھا اور پاکستانی شمال کے راستے ادھر آیا تھا... دریائے سندھ کے کناروں پر جو بلند چٹانیں تھیں اُن کی خوفناکی سے بچتا وادئ سوات اور ٹیکسلا آیا تھا اور پھر بودھ گیا کی زیارت کو پہنچا جہاں گوتم نروان پا کر بدھ کے رُتبے کو پہنچا... اُس تالاب پر سجدہ ریز ہوا جہاں ملکہ مایا نے درخت کی ایک شاخ کو تھام کر گوتم کو جنم دیا تھا اُس نے گوتم کی راجدھانی جسے اُس نے تیاگ دیا تھا' کپل وستو کی بھی زیارت کی اور وہ اپنے سفر نامے میں کہتا ہے "یہ شہراب مفتوح ہے اور ایک وسیع کھنڈر ہے" اگرچہ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ ہیون سانگ جب وہاں آیا تھا تو کپل وستو کے محلات کا نام ونشان تک نہ تھا... شاہ سُدھو دانا... جو کہ گوتم کا باپ تھا اُس کا محل کب کا روپوش ہو چکا تھا... اور وہاں ایک خانقاہ کے کھنڈر تھے جنہیں ہیون سانگ کپل وستو کے محلات سمجھ بیٹھا... لیکن میرا خیال ہے کہ ایک سفرنامہ نگار کو اتنی سی تو چھوٹ دینی چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے اور فینٹسی کو بروئے کار لا کر وہ کچھ دیکھ لے جو وہاں موجود نہیں ہے جو تاریخ دانوں اور محقق حضرات کو نظر نہیں آتا...

چنانچہ حقائق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہیون سانگ بھگتاپُور میں ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی تعمیر سے ایک صدی پیشتر یہاں آیا تھا... اور اگر میں اُسے بھگتاپُور میں دیکھتا ہوں تو سفرنامہ نگار کی اُس چھوٹ اور فینٹسی کا سہارا لیتا ہوں... یُوں بھی مار کو پولو اور

ابن بطوطہ بھی الگ الگ زمانوں کے ہیں... اور اگر وہ مجھے... ایک ہی زمانے میں بھگتاپُور میں نظر آتے ہیں تو... کم از کم مجھے نظر آتے ہیں کیونکہ میں ایک سرد مزاج تاریخ دان اور بزدل مزاج محقق نہیں ہوں...

"تاؤ مادھی چوک..." بودی شاہ اپنی مستی میں چلا جاتا ہے...

"کدھر ہے بھائی۔" سُنہری بابا ہانپتے ہوئے کہتے ہیں "ہم نے ابھی کھٹمنڈو واپس پہنچ کر ساڑھے چار بجے والی ایئربس میں سوار ہونا ہے"

بودی شاہ کب ہماری سُنتا تھا۔ وہ تو حالتِ نروان میں تھا...

لیکن ہم دربار چوک سے نکلے تو ایک منٹ میں تاؤ مادھی چوک کی وسعت میں داخل ہو گئے۔

یہ ایک ایسا سکوئر تھا جس میں کل جہان معلق تھے...

یہ زمین پر نہ تھا کسی آسمان پر ٹھہرا ہوا تھا...

یہاں جو مندر' عمارتیں اور محل تھے اُن کا زمین سے واسطہ کم تھا اور وہ افلاک کے رشتے دار زیادہ لگتے تھے۔

تاؤ مادھی چوک میں جو آسمانی عجوبے تھے... انہیں دیکھ کر خیال آتا تھا کہ مصنف پاول کی یادداشت نے اُسے دھوکا دیا... اگر اُس نے کہا کہ بھگتاپُور کے دربار چوک کو دیکھنے کے لئے آدھی دنیا کی مسافت جائز ہے تو اُس کے ذہن میں تاؤ مادھی سکوئر تھا۔

ادب اور سیاست کی طرح... بلکہ ہر انسانی عمل کی طرح سیاحت میں بھی کچھ "کلیشے" ہوتے ہیں... یہ آرٹ اور فلم میں بھی ہوتے ہیں اور کردار اور کاروبار میں بھی... تو سیاحت میں اگر ہم عمارتوں تک ہی محدود رہیں تو دیا میں صرف تاج ہے۔ اہرام اور آئفل ٹاور ہے... کلوسیئم ہے... ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور سڈنی کا آپرا ہاؤس ہے... نیلی مسجد اور کلیسا سینٹ پیٹرز ہے... کمبوڈیا کے مندر اور موہنجو ڈارو کے کھنڈر ہیں... ان کے سوا اور کچھ نہیں۔

لیکن ان کے سوا جو کچھ ہے جو "کلیشے" نہیں ہے۔ ان سے کہیں بڑھ کر ہے...

ایک طویل فہرست ہے... پیٹرا کا گلاب شہر اُردن میں ہے... شہر بابل کے دروازے عراق میں ہیں... پرس پالس کے سوختہ کھنڈر ایران میں ہیں' مینارِ جام اور غزنہ

کے دروازے افغانستان میں ہیں... وادی خپلو اور شگر کی خانقاہیں اور مسجد بھونگ پاکستان میں ہے اور... نیاتا پولا کا مندر بھگتا پور میں ہے...

اِسی تاؤ مادھی سکوئر میں... نیاتا پولا کی سُرخ چھتیں زینہ زینہ... بلند ہو کر آسمان کو چھوتی تھیں۔

اور اُس کی پہلی منزل بھی تاؤ مادھی چوک سے بہت بلند تھی... اور وہاں تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں سیڑھیوں کو طے کر کے جانا پڑتا تھا... اور ان سیڑھیوں کے آغاز میں دونوں جانب دو سنگی ہاتھی پہرے دار تھے... اگرچہ نیپالی بچے ان ہاتھوں کی پوترتا کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اُن پر سواری کرتے تھے اور اُنہیں اپنے ننگے اجسام سے دھکیلتے ہوئے یہ خواہش کرتے تھے کہ وہ چلنے لگیں لیکن وہ ساکت تھے... کہ صرف عقیدہ اور پختہ عقیدہ ہی ایک ایسا چابک ہے جو پتھر کے بنے ہوئے ہاتھیوں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔

نیاتا پولا کا یہ حیرت ناک معبد تین سو برس پیشتر بھوپندر ملا نے تعمیر کیا تھا...

بے شمار کھڑکیاں... جو ہمالیہ کے برفانی منظر کو دیکھ نہ سکتی تھیں... کہ وہ سب کی سب اندھی تھیں... بند تھیں۔

اور اِسی مندر میں سینکڑوں کے حساب سے وہ گھنٹیاں تھیں جنہیں "ہوائی گھنٹیاں" کہا جاتا ہے... یعنی... بادِ نسیم کا کوئی ایک ہلکا سا جھونکا ادھر بھگتا پور میں آ نکلے تو یہ سب کی سب بے اختیار ہو کر وجد میں آتی ہیں... اور بجنے لگتی ہیں۔

ہم سب اپنی حیات میں اُسی ایک جھونکے کے منتظر رہتے ہیں۔

ہمارے وجود کی گھنٹیاں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اور اُن کی زبانیں آہنی تالو سے چپک جاتی ہیں اور وہ جھونکا نہیں آتا جو ہمارے بدن کو... ہماری حیات کو مترنم کر دے...

کیا یہ انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ اپنے بدن کے اندر زنگ آلود گھنٹیوں کے وجود سے آگاہ ہوتا ہے اور پھر اُن کی آواز سننے کے لئے کیا کیا کشٹ کاٹتا ہے۔ کبھی بودھ گیا میں دھونی رماتا ہے... اور کبھی غارِ حرا میں قیام کرتا ہے... کبھی زرتشت کی مانند آگ جلاتا ہے... صحرائے سینا میں نکل جاتا ہے اور کبھی مصلوب ہو جاتا ہے... صرف اس لئے کہ اُن زنگ آلود گھنٹیوں کی آواز سُن سکے... اور یہ سب کے سب پہنچے ہوئے

لوگ تھے۔ اِن کے لئے ربِ کائنات نے خصوصی طور پر گھنٹیوں کا زنگ اُتارا اور پھر اُن کی آواز کل عالم میں گونجی اور ایک جہان کو مسحور کیا۔

لیکن ہم تو منتظر ہی رہے... زنگ نہ اُترا... نہ کوئی آواز سُنائی دی... کہ ہم راندۂ درگاہ تھے... کمزور اور کمینے لوگ تھے۔

کوئی ایک ہلکا سا جھونکا بھی ہماری جانب نہ آیا...

ہم وجد میں نہ آ سکے... بے اختیار نہ ہو سکے...

تو اِس میں قصور کس کا تھا... جو اختیار میں تھا... یا وہ... جن کے اختیار میں کچھ نہ تھا ہم ٹھہری ہوئی ساکت زنگ آلود گھنٹیوں کے کھنڈر منتظر رہے اور بادِ نسیم کا کوئی ایک جھونکا بھی ہمارے جانب نہ آیا... تو قصور کس کا تھا؟

بودی شاہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا جاتا تھا...

اُس کا خیال تھا کہ وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا ہے...

کیونکہ ہمارے پلّے اُس کی کوئی کوئی بات پڑتی تھی...

اور یوں بھی وہ مگن اور بڑبڑاتا ہوا چلتا تھا...

اور جب کبھی کسی مندر کی اُونچائی بیان کرتا تو اپنی بودی چٹکی میں بھر کر اُسے بلند کر دیتا اور جب اُسے کسی چھوٹی شے کا ذکر کرنا ہوتا تو وہ جھک کر فرش کے قریب اپنی ہتھیلی لے جاتا... چنانچہ میں اگر نیپالی اور بھگتا پوری دیو مالا کے قصّوں کو قدرے گڈمڈ کر دوں تو اس میں میرا نہیں بودی شاہ کا قصور ہو گا...

تو یہ بودی شاہ ہمیں نیاتا پولا مندر کے سٹوپا نُما سٹرکچر کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یہ مندر جتنا ہمیں دکھائی دے رہا تھا اتنا ہی... اتنی ہی منزلیں زمین کے نیچے تھیں جو دکھائی نہیں دیتی تھیں... اگر اس کی پانچ منزلیں تہہ در تہہ اُوپر اُٹھتی تھیں تو بھگتا پور کی زمین کے اندر بھی اس کی اتنی ہی منزلیں اُترتی تھیں... اور اُن کے اندر ایک اندرونی اور اوجھل ایک معبد ہے جس میں بہت پہنچے ہوئے بھگت ہی پہنچتے ہیں۔ اور وہاں زیرِ زمین ایک ماہیش مروانی سِدھی لکشمی کا ایک ایسا مجسمہ ہے جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے... اور جو بھی اُسے دیکھتا ہے وہ چُپ ہو جاتا ہے، کسی سے کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ سِدھی لکشمی کے حُسن کا اسیر ہو جاتا ہے... حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ سِدھی لکشمی کو مندر

کے بلند ترین سنگھاسن پر براجمان نہیں کیا گیا بلکہ اُسے زیرِ زمین جہاں سے مندر کی بنیاد اُٹھائی گئی ہے وہاں پوشیدہ کیا گیا ہے...

مجھے نیا تا بولا مندر کا طرزِ تعمیر بے حد تبتی لگ رہا تھا... اور یہ ایک قدرتی امر تھا کہ سرحد پار تبت تھا... جیسے ترشنگ کی مسجد میں لداخی رنگ نمایاں تھے...

مندر کے باہر بھگتا پُور کے داستانوی پہلوان ماں اور بیٹا مجسموں کی صورت میں پہرا دے رہے تھے... کہا جاتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک میں دس ہاتھیوں کے برابر زور تھا۔

اگرچہ بودی شاہ باتیں کیا جا رہا تھا لیکن میرا دھیان ابھی وہیں اٹکا ہوا تھا جہاں نیا تا پولا کی زیرِ زمین منزلوں میں ایک ایسا معبد تھا جس میں سِدھی لکشمی کا بُت تھا... اور اُس بُت طناز تک پہنچنے والے بھگت اُس پر فدا ہو جاتے تھے...

اس حساب سے تو ہر شخص کے بدن کی زیرِ زمین منزلوں میں کوئی نہ کوئی بُت پوشیدہ ہوتا ہے... کوئی نہ کوئی سِدھی لکشمی براجمان ہوتی ہے... کسی کے اندر شاہ گوری کے ڈیرے ہوتے ہیں' کوئی اپنے بینک بیلنس کی لکشمی کو سنبھال کر رکھتا ہے... اور کوئی زہد اور تقویٰ کے تکبر کو ایک بُت کی صورت پوجتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔

بودی شاہ... سر جھکائے اپنی بودی جھکائے اِس آس میں بھی بولتا چلا جاتا تھا کہ بالآخر اُسے اُس کے بولنے کی مناسب قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس کے باوجود اُس کے انداز میں کوئی خوشامد کوئی چاپلوسی یا ڈپلومیسی نہ تھی... جو خاصا ہے دنیا بھر کے گائیڈز کا... اگر ہم دن کے اختتام پر اُسے ایک پیسہ بھی نہ دیتے اور "تھینک یُو بودی شاہ" کہہ کر چلے جاتے تو وہ پھر بھی اتنا ہی مطمئن بودی شاہ ہوتا اور اپنی بودی سہلاتا ہوا چلا جاتا...

سُنہری بابا البتہ ایک متفکر بے بسی کے ساتھ بار بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے تھے کیونکہ وہ میرے چہرے پر دیوانگی کے وہ آثار دیکھ رہے تھے جو کسی بھی سیاح میں تب نمودار ہوتے ہیں جب وہ اپنے سامنے کسی ایسی عمارت یا منظر یا شکل کو پاتا ہے جو اُسے یہ کہتی ہے کہ اب تم نے کہاں جانا ہے... یہیں ٹھہر جاؤ' قیام کرو... اور بس مجھے دیکھو...

بھگتا پُور دراصل ایک دھوکا پُور تھا جس کے فریب میں آیا ہوا سیاح کسی اور منزل کی جانب کُوچ کرنے کے ارادے ترک کر دیتا تھا...

اسی لئے سُنہری بابا کو مصمم یقین تھا کہ ساڑھے چار بجے والی ایئر بس پر کم از کم ہم نہ ہوں گے کہ تارڑ کے چہرے پر دیوانگی کے آثار ہیں' ہم بھگتا پُور میں دیر کر دیں گے...

"دیر ہو رہی ہے تارڑ صاحب..." سُنہری بابا نے اپنی کلائی آگے کر کے گھڑی دکھائی اور وہ مجھے نظر نہ آئی... کہ نظر میں صرف بھگتا پُور کے زمین و آسمان تھے...

اس تاؤ مادھی چوک میں... وہ چھوٹے چھوٹے ریستوران اور کیفے تھے... سوونیئر شاپس اور ایک کشمیری شالوں کی دوکان تھی... جو قدیم عمارتوں کے اندر اُن کی قدامت کو مجروح نہ کرتے ہوئے اِس چوک پر کھلتے تھے... اور ریستورانوں کی گیلریوں میں ہم پر نظر کرتے ایسے خوش بخت سیاح تھے جن کی میزوں پر نیپالی خوراک اور ڈینش بیئر تھی اور اُن کی جیبوں میں کوئی ایسا ایئرلائن ٹکٹ نہ تھا جس پر یہ درج تھا کہ آج دوپہر ساڑھے چار بجے تم نے نیپال چھوڑ جانا ہے... اور ہماری جیبوں میں وہ ٹکٹ تھا... وہ ہمارے بودی شاہ کی مانند شانت اور سُست دوپہر کے کھانے کے بعد نیچے اُن سیاحوں کو تک رہے تھے جن میں ایک بھدے بدن کا بے ڈول شخص تھا۔ دوسرا ایک باریش اور چست آدمی تھا اور اُن کے آگے آگے ایک بودی شاہ جنتر منتر پڑھتا چلا جا رہا تھا۔

میں اپنے خیال میں اس امکان کو لایا کہ اگر مجھے آج دوپہر کہیں نہ جانا ہو اور میری جیب میں جو ٹکٹ ہے اس پر آج کی مُہر نہ ہو اور میں بھگتا پُور کی چوبی بالکونیوں میں اطمینان سے ایک ریستوران میں پاؤں پسارے بیٹھا رہوں تو یہ کیسا تجربہ ہو... یہ جیسا بھی تجربہ ہوتا اِس میں یقیناً شانتی اور ٹھہراؤ اور قدامت ایسی ہوتی کہ شاید میں ایک سراسر مختلف انسان ہو جاتا... میری جُون بدل جاتی...

لیکن میرے پاس چونچلوں کے لئے وقت کہاں تھا...

ہم تو عدیم الفرصت لوگ تھے... اہم اور مشہور لوگ تھے اور بگلا بھگت بن کر بھگتا پُور آئے تھے... ہمارے پاس ایسے چونچلوں کے لئے وقت کہاں تھا...

میں اگر بگلا بھگت نہ ہوتا... ایک ٹانگ پر کھڑا جھوٹ مُوٹ آنکھیں بند کئے شہرت اور عزت کی مچھلیوں کی تاک میں نہ ہوتا... سچ مچ کا... زعفرانی چوغے میں اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتا ایک معصوم سا بھگت ہوتا تو یقیناً نیا تا پولا کے زیرِ زمین معبد میں اُتر کر دیوی کے چرن چُھوتا اور آج کی شب بھگتا پُور کی سیڑھیوں پر دیئے جلاتا اور اُن کی لو اُونچی رکھتا...

خیر ہو تیرے بھکشوؤں کی... آج کی شب جب دیئے جلائیں' اُونچی رکھیں لو...

تاؤ مادھی سکوئر میں... زندگی کا بہاؤ بہت دھیرے سے بہتا تھا...

یہ ندیا دھیرے بہتی تھی...

اس میں اتنی آہستگی تھی... کہ انسان نہ صرف اپنی بلکہ قریب سے گذرتے کسی بدھ بھکشو کے دل کی آواز... قدرے مدھم سہی... سُن سکتا تھا...

بودی بہادر چلتا جا رہا تھا۔

"ہیلو..." مُہری بابا نے صدا بلند کی "بھکتا پُور تو دیکھ لیا ہے... اب کدھر جانا ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے اپنی بودی کو اُٹھا کر اُسے ذرا ہوا لگوائی "ابھی تو نیچے مانسٹری ہے۔ داتاری کا مندر ہے... پی کاک وِنڈو ہے... سب ٹورسٹ لوگ اُسے دیکھتا ہے... ابھی اُسے دیکھے گا۔" وہ چلتا گیا۔

"تارڑ صاحب۔" مُہری بابا نے میرا بازو تھام کر کہا "آپ بہ قائمی ہوش و حواس میری بات سُن رہے ہیں؟"

"کیوں... مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آپ کچھ لاپرواہ سے لگ رہے ہیں۔ لیکن ہم نے بھکتا پُور کافی نہیں دیکھ لیا؟"

"مُہری بابا... اس بے چارے بودی شاہ کا دل توڑنا مناسب نہیں... اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اُس کا دل توڑ دیا اور اس کی بات نہیں مانی تو اس کی بودی ہمیشہ کے لئے گر جائے گی... تو کیا قباحت ہے اگر ہم ایک آدھ مانسٹری اور پی کاک وِنڈو دیکھ لیں۔"

"شاید ہم اپنی ایئر بس مِس کر جائیں؟"

"تو تین' روز بعد چلے جائیں گے۔"

"بس مجھے یہی خدشہ تھا۔" مُہری بابا نے ایک ذاکر کی طرح سینے پر دوہتڑ مار کر کہا "آپ پر اثر ہو گیا ہے..."

ہم بودی شاہ کی قیادت میں مندروں' محلوں اور عبادت گاہوں کے عظیم جُھرمٹ میں سے یکدم بھکتا پُور کے عام بازاروں اور گلیوں میں آ گئے... اور یہ کُوچے بھی ذرا

خوابیدہ تھے... ان کے مکان اور آماجگاہیں ایک قدیم زوال کی نشانیاں تھے... ایک تھڑے پر بھکتا پُور کے مشہورِ زمانہ مٹی کے برتن سجے تھے... دیئے اور مرتبان... ہانڈیاں اور تیل کے کُونڈے... اور ایک بوڑھی نیپالن جسے آنکھوں سے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا وہ ان برتنوں کو ٹٹول ٹٹول کر اُن کی قیمت بتاتی تھی۔

سبزی کی دوکانیں' انڈین فلم سٹارز کے پوسٹر' ویڈیو کی دوکانیں' نیپالی حکیم جو ہمارے یونانی دواخانوں کے شانہ بہ شانہ مایوس مریضوں کے لئے قوت مردمی کی نوید دیتے تھے... ٹورسٹ ایجنسیاں اور پرچون کی دوکانیں جہاں سے آپ بھگوانوں کے لئے چاول زعفران اور تیل حاصل کر سکتے ہیں...

میں اگرچہ بھکتا پُور کی قدامت کی دیوانگی کے زیرِ اثر تھا لیکن یکدم مجھ میں ایک سراسیمگی اپنے پنجے پھیلانے لگی... کہیں ایئر بس مس نہ ہو جائے... میں اگرچہ دیوانہ ہو چکا تھا لیکن بہ کار خویش ہوشیار تھا...

میں اتنا دیوانہ بھی نہ تھا۔

بودی شاہ جو کچھ کہتا تھا وہ ہمارے سَر پر سے گزر جاتا تھا شاید اس لئے کہ ہمارے سر پر بودی نہ تھی... لیکن تاؤ مادھی چوک کے بعد... بھکتا پُور کے بازاروں اور گلیوں میں سے گذرنے کے بعد ایک مقام پر... جہاں دائیں جانب ایک اور وادی کی ہریاول اور پہاڑ نظر آتے تھے بودی شاہ رُک گیا اور کہنے لگا "اُدھر وہ پہاڑ دیکھتا ہے؟"

"ہاں... دیکھتا ہے۔" میں نے کہا...

"اِس میں دیکھنے والی کیا بات ہے... بس پہاڑ ہے..." مُہری بابا بہت بور ہو چکے تھے...

"صرف پہاڑ نہیں صاحب..." بودی شاہ اُسے ایسے تک رہا تھا جیسے ہلیری اور تن زنگ نے ایورسٹ پر قدم رکھنے سے پیشتر اُسے ایک تقدس سے دیکھا ہو گا "یہ وہی پہاڑ ہے جسے ہنومان جی اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر لے گئے تھے۔"

میں نے بہت بچپن میں ہنومان جی کو گوالمنڈی چوک میں دیکھا تھا...

میں شاید پانچ برس کا بھی نہ تھا... اور ایک موہوم سی یاد ہے کہ منڈیروں اور چھتوں پر... کرشنا گلی' گاندھی سکوئر اور نسبت روڈ کے تمام در و دیوار پر مٹی کے دیئے لاہور

کی رات میں آسمان سے اُترے بجھتے ستاروں کی طرح جھلملاتے ہیں... گوالمنڈی چوک میں مٹھائیوں کے بڑے بڑے تھال سڑک کے درمیان تک سجے ہیں اور اُن میں بھی دیئے جل رہے ہیں... مجھے ہندو یاد نہیں لیکن ہندوؤں کی دیوالی کی کوئی رات میری یادداشت میں مرتے ہوئے جگنوؤں کی مانند ٹمٹماتی ہے... مٹھائی کے ان بڑے بڑے تھالوں میں جو ہندو دیومالائی تصویریں سجتی تھیں میں نے وہیں ہنومان جی کو دیکھا تھا... ان بندر شاہ کو میں نے آسمانوں میں پرواز کرتے ایسے دیکھا تھا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنی ہتھیلی پر اس احتیاط سے رکھے اُڑان کرتے تھے جیسے وہ ایک بلیک فارسٹ کیک ہو...

"تو یہ پہاڑ تو ابھی یہاں ہے یارا... تو ہنومان جی اِسے واپس رکھ گئے تھے۔" یہ سُنہری بابا کا سوال تھا۔ لیکن اُن کا سوال بے جا تھا...

دیومالا کی سائنسی توجیہہ ممکن نہیں... یہ وہ خواب ہوتے ہیں جن میں حقیقت کا کوئی نہ کوئی ذرہ کسی گذرے زمانے میں ضرور موجود ہوتا ہے... اور پھر حقیقت کے اس ایک ذرّے کو انسان... صدیوں کے سفر کے دوران' عقیدے اور احترام کی نابینائی سے دیکھتے ہوئے اُس ایک ذرّے کو ایک کائنات بنا دیتے ہیں اور اُس پر اپنے یقین کی مُہر لگا کر اُسے ناقابلِ تردید قرار دے دیتے ہیں... یہ تقریباً ہر مذہب میں ہوتا ہے... دیومالا یونانی ہو' ہندو یا بُدھ ہو اُسے آپ توجیہہ کی سرچ لائٹ کے نیچے رکھ کر نہیں پرکھ سکتے... یا تو آپ اُس پر یقین رکھتے ہیں... یا نہیں رکھتے... اور تیسرا راستہ اُن میں سے کسی قوم یا مذہب کی تاریخ اور عقائد کو ہمدردی سے سمجھنے اور اُسے اپنی تحریر میں ایک استعارے کی شکل میں آج کی حقیقتوں کو بیان کرنے کا ہوتا ہے... آپ اُس کا تمسخر نہیں اُڑا سکتے کہ آپ کے نیچے بھی ایسی زمینیں ہو سکتی ہیں جنہیں چیلنج کیا جا سکتا ہے...

چنانچہ ہنومان جی اگر ایک پہاڑ اپنی ہتھیلی پر اُٹھا کر فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ سَر آپ ایوی ایشن فیول کے بغیر کیسے اُڑان کرتے ہیں اور جب آپ لینڈ کریں گے تو کیا یہ کمپیوٹر کے ذریعے خود کار یعنی آٹو میٹک لینڈنگ ہو گی اور کیا آپ کی لینڈنگ کے لئے ایک ایئر سٹرپ ضروری ہے یا آپ جنگلوں صحراؤں میں بخوبی اُتر جائیں گے... کریش لینڈنگ کے بغیر...

بھگتا پور کی شانتی اور ٹھہراؤ میرے قدموں کو سُست کرتے تھے... اور سُنہری بابا

میرے قدموں پر کڑی نظر رکھتے تھے...

جیسے وینس کی آبی گلیوں میں انسان کاہل اور لاپرواہ ہو جاتا ہے... ثوریا کی شام میں اُترتا ہے ایک طویل نیم صحرائی سفر کے بعد تو وہاں سے کُوچ کرنے کو جی نہیں چاہتا... ہرات کے طلوعِ آفتاب کے سامنے ایک چرسی کی مانند گم سُم بیٹھا رہتا ہے۔ کوہِ آرارات کے دامن میں کسی بستی کے گھر سے سرِ شام دھواں اُٹھتا دیکھتا ہے تو وہیں سب کچھ تیاگ کر ٹھہر جانا چاہتا ہے... یا بیافو گلیشئر کے اُوپر ایک چٹان میں پوشیدہ شکاری جھونپڑے میں زندگی کے کچھ دن ایک برفانی تنہائی میں گذارنا چاہتا ہے... ہر سیاح... ہر کوہ نورد پر کسی نہ کسی مقام پر یہ سُستی اور ٹھہراؤ وارد ہو جاتا ہے... وہ اپنی دربدری اور خانہ بدوشی سے تنگ آ جاتا ہے اور اپنا خیمہ جلا کر کسی ایک بستی ایک منظر میں آباد ہو جانا چاہتا ہے... یہ آوارہ گرد کسی اسکولے میں اپنی آوارگی کی بے معنویت سے عاجز آ جاتا ہے اور اُسے ترک کر کے بس وہیں رُک جانا چاہتا ہے... اور اُسے اِس سُستی اور ٹھہراؤ کے خلاف ایک جنگ کرنا پڑتی ہے... اپنے آپ کو لعن طعن کرنا پڑتی ہے کہ... اُٹھو اپنا خیمہ سمیٹو... اپنا سامان اکٹھا کرو کہ تم اپنے قبیلے سے کیسے بغاوت کر سکتے ہو... تمہارے خیمے کے گرد گھاس اُگ آئی ہے تو اب تم کس مُنہ سے یہاں ڈھیٹ بن کر ٹھہر سکتے ہو... کُوچ کرو... تمہارے لئے ابھی اور بستیاں ہیں جن تک تم نہ پہنچے تو وہ کھنڈر ہو جائیں گی... اور جھیلیں ہیں جہاں تمہارے قدم نہ گئے تو وہ خشک ہو جائیں گی... کُوچ کرو...

یہی کیفیت مجھ پر بھگتا پُور میں وارد ہوئی...

پی آئی اے کی ایئربس نے مجھے اس دیومالائی طلسم سے نکال کر مستقبل کے کسی اور بھگتا پُور میں لے جانا تھا... ابھی کوئی اور جھیل بھی تھی جسے میں نے خشک ہو جانے سے بچانا تھا۔

بودی شاہ چلتا جا رہا تھا... ہنومان جی کے پہاڑ کو دکھا کر چلتا جا رہا تھا اور ابھی تک وہ مانسٹری وہ راہب خانہ وہ چوک نہیں آ رہا تھا جس کا اُس نے وعدہ کیا تھا کہ ابھی آ جائے گا...

"تارڑ صاحب دیر ہو رہی ہے۔" سُنہری بابا نے طلسم کے اُس تانے بانے کو توڑ دیا جو بھگتا پُور کی دیومالائی فضا میرے گرد بُن رہی تھی۔

میں اُلجھا ہوا باہر آیا "سُنہری بابا اگر ہم آج اُس ایئر بس میں سوار نہ بھی ہوئے تو دُنیا کی تاریخ میں کیا فرق پڑے گا... ہماری زندگیوں میں کیا فرق پڑے گا... آپ اسلام آباد میں ٹیلی ویژن کے ہیڈ کوارٹر کے سفید عقوبت خانے میں قید ہونے کے لئے کیوں بے چین ہیں... میں کاہے کو لاہور کی آلودگی اور گندگی میں سانس لینے کے لئے... اپنے گھر کی آسودہ جھیل کا پھر سے قیدی بننے کے لئے بھاگ دوڑ کروں... ریلیکس..."

شاید اس ٹرپ میں پہلی بار سُنہری بابا کو احساس ہوا کہ میں وہ نہ تھا جو پچھلے کئی روز سے اُن کے شب و روز اور قمار خانوں اور تھمل بازاروں میں اُن کے ساتھ تھا... میں کوئی اور تھا...

میری شکل بدل چکی تھی... میرے آوارہ گرد اور ناقابل اعتبار کردار کا یہ رُخ پہلی بار اُن کے سامنے آ رہا تھا۔

اور میں نے بہت سے دوست اور ہمدرد زندگی میں اسی طرح گنوائے کہ وہ مجھے ایک مددگار اور نہایت سر جھکا دینے والا شخص سمجھتے رہے... جو کہ میں ہوں... لیکن کسی ایک لمحے میں... جو میری گرفت میں نہ ہوتا تھا۔ مجھ پر وارد کر دیا جاتا تھا' میں یکدم باغی ہو جاتا تھا' انکاری ہو جاتا تھا... میرا خون سفید ہو جاتا تھا اور میں کہتا تھا... "نہیں۔"... وہ مجھے سمجھاتے تھے اور میں پھر کہتا تھا "نہیں۔" اور وہ مجھ سے بدظن ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دیتے تھے کہ اس شخص کا کوئی دین ایمان نہیں... یہ بلاشبہ اچھا لکھاری ہے لیکن دوبارہ بلاشبہ اچھا انسان نہیں...

لیکن سُنہری بابا اُن سے سیانے تھے وہ میری سیماب صفت طبیعت کو بھانپ گئے' اُنہوں نے اپنا رد عمل ظاہر نہ کیا اور صرف اتنا کہا "سائیں ایئر بس کا کیا ہے' ہفتے میں چار پانچ بار کراچی جاتی ہے... آپ موج کرو"

ہم بالآخر ایک تنگ کُوچے سے نکلے اور اس کُوچے میں ایک خاص بات تھی کہ اُس میں ایک پرانی عمارت میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جس کے بورڈ پر لکھا تھا... "ہماری کھڑکیوں سے ہمالیہ دکھائی دیتا ہے اور بھگتا پُور دکھائی دیتا ہے اور یہاں آپ کے آرام میں کوئی مخل نہیں ہو گا"... تو اس تنگ کُوچے سے نکلے اور بالآخر نکلے تو بھگتا پُور کے تیسرے چوک یعنی دِتہ تریا سکوئر میں داخل ہو گئے۔

قدیم عمارتوں کو ایک نظر دیکھ کر اُنہیں بیان کرنا آسان نہیں... کہ آپ اُنہیں ایک آرکی ٹیکٹ کی تکنیکی نظر سے نہیں دیکھتے کہ اس پر کونسی صدی کی ثقافت کے آثار نُمایاں ہیں اور اس کی بنیادوں میں اینٹ روڑے اور سیمنٹ کی کیا شرح ہے اس پر جو گیلریاں تعمیر کی گئی ہیں وہ وہاں کیسے نصب کی گئی ہیں... استنبول کے ہاگا صوفیہ کا ناقابل یقین گنبد جب تعمیر کے مرحلوں میں تھا تو جب تک اُس کا لینٹر نہیں کھلا تھا اُسے سہارا دینے کے لئے کیسے ستون بنائے گئے تھے... اور کتنے دنوں بعد جب اُس کی آخری اینٹ جڑی تھی تو اِن ستونوں کے سہارے کو ہٹایا گیا تھا... شالیمار کے فواروں میں جو پانی اُبلتا ہے اُسے کیسے پریشر دیا گیا تھا... یا تاج محل کے تناسب دریائے جمنا کے حساب سے کیسے حساب کئے گئے تھے...

آپ تو ان عمارتوں کو... اُس ایک لمحے میں دیکھتے ہیں جب ایک کُوچے سے نکلتے ہیں تو وہ سامنے آ جاتی ہیں... اور اُس ایک لمحے کے مشاہدے کو لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں... اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ قدیم عمارت وہ نہیں ہوتی جو آپ بیان کرتے ہیں... کہ آپ کے بیان کی حدود صرف ایک لمحے میں مقید ہوتی ہیں...

ہاگا صوفیہ میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کا مُنہ کھل جاتا ہے اور آپ کہتے ہیں یہ گنبد نہیں ایک اور آسمان ہے... اور ابھی فرشتے اُتریں گے... کسی صحیفے کا نزول ہو گا...

شالیمار میں آپ کو Pale hands beside the Shalimar نظر آتے ہیں۔

اور تاج اگرچہ میں نے دیکھا نہیں... لیکن سُنا ہے کہ وہاں مرنے کی خواہش شدید ہو جاتی ہے اور چاندنی کے غبار میں وہ ہر شب آپ کی نظروں کے سامنے دوبارہ تعمیر ہوتا ہے اور صرف آپ کے لئے وجود میں آتا ہے۔

دِتہ تریا سکوئر میں جو عمارتیں اُس ایک لمحے میں سامنے آئیں وہ ہاگا صوفیہ' شالیمار یا تاج کے ہم پلہ تو ہرگز نہ تھیں لیکن اُن میں فنا سے پرے کی کی ایک جاذبیت ایک کشش ضرور تھی۔

اس سکوئر میں داخل ہوتے ہی جو ایک سیاہ پڑتا لکڑی کا عجوبہ نظر آیا کہ وہ ایک راہب خانہ یا مانسٹری نہ لگتا تھا کسی متروک دیوتا کا گھر لگتا تھا جس میں وہ اپنی

ریٹائرمنٹ کے بعد دن گذارتا تھا اور پچھلے پہر اچھے دیوتاؤں کی طرح جو کبھی بیورو کریٹ رہ چکے تھے، پچھلے پہر... گالف کھیلتا تھا... اور بودی شاہ کا کہنا تھا کہ بھگتا پُور میں جو بھی ٹورسٹ آتا ہے اِسے ضرور دیکھتا ہے۔

چنانچہ ہم نے بھی اسے ضرور دیکھا۔

ایک اور تہہ در تہہ ایک بڑے اور قدیم جنگل میں جتنے درخت ہو سکتے ہیں اُن کی لکڑی سے تراشا ہوا ایک عجائب خانہ جس میں بے شمار گیلریاں تھیں اور کھڑکیاں تھیں۔ اور ان کھڑکیوں میں سے راہب اور پجاری جھانکتے تھے اور اس کی سیڑھیوں پر بے شمار سیاح بیئر کے ٹن تھامے مزے کرتے تھے...

اس راہب خانے کے باہر بھی وہی دو پہلوان پہرا دے رہے تھے... آپ انہیں نیپال کے گاما اور امام بخش کہہ سکتے ہیں۔

دتہ تریا کی تکنیکی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ تین دیوتاؤں کی آماجگاہ ہے...

یعنی ریٹائرمنٹ کے بعد پچھلے پہر گولف کھیلنے والے تین دیوتا یہاں رہائش رکھتے تھے... سب سے اعلیٰ گریڈ کا... تخلیق کا دیوتا براہما... حفاظت کا دیوتا یعنی ڈیفنس منسٹر بشنو اور ماہیشورا... تباہی کا دیوتا... یعنی آرمڈ فورسز کا چیف...

"بھیدوں کی بستی بھگتا پور میں مور ناچا... کس نے دیکھا؟"

بودی شاہ کی یہ خصوصیت ہمیں پسند آئی تھی کہ وہ صرف ایک گائیڈ نہ تھا، صرف ہماری جیب پر پرکاش کی مانند نظر نہ رکھتا تھا بلکہ مسلسل اپنی عاقبت بھی سنوارے چلا جا رہا تھا اور اپنی بودی بھی سنوارے چلا جا رہا تھا...

"بودی بابا اب واپس چلیں..." سُنہری بابا کی آنکھیں اپنی گھڑی پر چیونگ گم کی طرح چپکی ہوئی تھیں "میں نے ابھی اسلام آباد فون کر کے اپنے گھر والوں کو بتانا ہے کہ گاڑی ایئرپورٹ پر بھیج دیں... سرکاری گاڑی آئے گی تو آرام سے چلے جائیں گے ورنہ رکشے پر جانا پڑے گا..."

اسلام آباد کے نام پر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

یہ کونسا شہر ہے...

بھگتا پُور کے مندروں اور راہب خانوں میں... فصیل کشور ہندوستاں کے سائے تلے... شیعہ سنی تصادم اور ایم کیو ایم کی معصوم دہشت گردی سے دُور... سوس بینک کاؤنٹس اور رائے ونڈ کے ونڈسر کاسل سے پرے... یہاں یہ کس نے کس شہر کا نام لیا ہے۔

"واپس کیسے جائے گا... ابھی تو پی کاک وِنڈو دیکھے گا صاحب..."

بودی شاہ عجیب بودا گائیڈ تھا کہ وہ فوری طور پر ہم سے فارغ ہو کر کسی اور سیاح

سے منتھی ہو جانے کی بجائے یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ ہمیں اپنے مُقدّس شہر کا ہر گوشہ دکھائے...

"کدھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُدھر ہے... مندر کے پیچھے جو گلی ہے اُس میں... سب ٹورسٹ لوگ اُسے دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے۔"

"تارڑ صاحب ابھی ہم پچپن کھڑکیاں دیکھ کر آئے ہیں... ایک اور کھڑکی کو دیکھ کر کیا کریں گے... صرف ایک کھڑکی کے لئے کراچی کی فلائٹ مِس کر دینا تو دانش مندی نہیں ہے..."

"لیکن بودی شاہ کہتا ہے اور اپنی بودی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ پی کاک وِنڈو ہے"

"تو پھر؟"

"شاید اُس کھڑکی میں مور ناچتا ہو۔"

"کھڑکی میں مور ناچا کس نے دیکھا۔" سُنہری بابا اس ناگہانی مور کے تذکرے پر اتنے سیخ پا ہو چکے تھے کہ اُسے سیخ میں پرو کر روسٹ کرنا چاہتے تھے یا اُس ناہنجار مور کی مور کڑاہی بنا کر اُسے تناول کر جانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ہماری ایئر بس چھُوٹ جانے کا امکان قوی ہوتا چلا جاتا تھا...

بودی شاہ اس دتہ تریا مندر کے بائیں جانب ایک تنگ گلی میں اپنی بودی پہلے سہلاتا پھر لہراتا اور شاید اُس نامعلوم نشے سے ٹوٹتا جو اُس کے رگ وپے کو لاغر بناتا تھا... ذرا ایک مستانہ انداز میں داخل ہوا... اُس گلی میں۔

کھٹمنڈو کی پہلی شام میں... دھوکا دربار اور کماری کے مندر کے باہر... ہم نے ہر جگہ نیپال وُڈ ورک کے وہ دلکش نمونے دیکھے تھے جو چھوٹے چھوٹے دروازوں اور کھڑکیوں کی صورت میں فٹ پاتھوں پر سیاحوں کی نظر میں آنے کے لئے سجے تھے... اور وہ میری نظر میں بھی آئے... مجھے شیوا کے نقابوں' کالی دیوی اور بدھا کے سیاہ مجسّموں' شہد کے نیپالی پیالوں اور تبتی گھنٹیوں کے انبار میں رکھے نقاشی کے وہ مختصر اور حیرت انگیز شاہکار بے حد بھلے لگے تھے اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وطن واپسی پر ان میں سے ایک

نہ ایک میرے سُوٹ کیس میں ہو گا...

بھگتا پُور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کسانوں' تصویروں' نقاشوں' فن تعمیر' کانسی کے مجسّموں' زیورات اور کوزہ گری کا شہر ہے... یہیں تو ن۔م۔راشد کا حسن کوزہ گر ہے اور گجرات کی سوہنی کمہارن ہے... لیکن... ان سب خصوصیات کے سوا... یہ نیپال بھر میں اپنے لکڑی کے کام کی وجہ سے جانا جاتا ہے... گویا یہ یہاں کا چنیوٹ یا سوات ہے...

ہم جونہی دربار سکوئر میں داخل ہوئے تھے تو پچپن کھڑکیوں اور سُنہری دروازے کے عین سامنے فٹ پاتھ پر سجے ہمیں یہ سیاہ رنگ کے منقش مختصر کھڑکیاں اور دروازے نظر آئے تھے اور ہم ان کی جانب لپکے تھے' اور بودی شاہ نے ہمیں لپکنے سے باز رکھا تھا اور صلاح دی تھی کہ... صاحب یہ تو مشین کا بنا ہوا ہے... ٹورسٹ لوگوں کو پتہ نہیں چلتا... ہم آپ کو ادھر لے کر جائے گا جدھر یہ صرف ہاتھ کی کاریگری کا ہوتا ہے اور اُدھر قیمت بھی کم ہو گا۔

دتہ تریا مندر کے پہلو میں جو گلی تھی وہ نہایت دیدہ زیب اور منقش اور قدیم کھڑکیوں والی گلی تھی... اور اُس گلی کو دیکھ کر مجھے قرطبہ کی پھُولوں والی گلی یاد آئی... کبالا روخو کا ریستوران یاد آیا جہاں میں نے ناڑلا سعد کے ہمراہ شانگریا کا سُرخ رنگ کا نہایت ناقابل اعتبار شربت پیا تھا...

منقش کھڑکیاں اُس گلی پر جھکتی تھیں اور اُن کے نیچے چند دوکانیں تھیں جن کے باہر وہی سیاہ رنگ کے مختصر دروازے' ستون اور کھڑکیاں تھیں۔

"صاحب... ادھر مشین کا کام نہیں ہے... سب ہاتھ کا بنا ہوا ہے..." بودی شاہ نے اپنی بودی کو بے اعتنائی سے لہرایا "ادھر اِن گھروں میں نیپال کا سب سے پُرانا کاریگر لوگ رہتا ہے... پڑھا لکھا نہیں ہے صرف لکڑی میں پڑھا لکھا ہے۔ آپ نے کھٹمنڈو میں جتنا کھڑکی اور مندر دیکھا وہ اُن کے بابا لوگ کا بنایا ہُوا ہے..."

"لیکن بودی بابا وہ پی کاک وِنڈو کہاں ہے جس کا جھانسا دے کر تم ہمیں یہاں لے آئے ہو؟" سُنہری بابا نے داڑھی کو بے طرح کھجلاتے ہوئے اور اپنی گھڑی پر ایئر بس کے وقت کو ٹِک ٹِک کرتے گزرتے دیکھا اور نہایت ایمرجنسی میں پوچھا...

"صاحب اُوپر ہے۔" بودی شاہ نے اپنی نشہ باز مہین اُنگلی سے اُوپر اشارہ کیا۔

اُوپر ایک ایسے مکان میں جہاں نیپال کا پُرانا کاریگر لوگ رہتا تھا اور لکڑی میں پڑھا لکھا تھا ایک چوکور کھڑکی کے نیچے ایک چوبی مور پَر پھیلائے کھڑا تھا اور اُس کے اِردگرد پُھول اور بُوٹے کھلتے تھے۔ یہی وہ مُختصر سی مور کھڑکی تھی جو نیپال کی چوبی کاریگری کی ایک ایسی مثال تھی کہ اُس کے کوچۂ و بازار میں اس وادی کی سب سے اہم تخلیقی علامت کے طور پر فٹ پاتھوں' دوکانوں اور ہوٹلوں میں سجتی اور بکتی تھی۔

پی کاک وِنڈو اگرچہ نہایت مُختصر اور بھولی بھالی تھی لیکن اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی چوبی تختے پر جھکے ہوئے انسان نے اپنے ہاتھوں سے تراشی ہے۔

یہ چوبی مور کئی صدیوں سے بھگتا پُور جنگل میں ناچ رہا تھا اور چونکہ ہم شہروں کے باسی تھے اس لئے ہم نے اِسے نہیں دیکھا تھا۔

پی کاک وِنڈو اتنی مُختصر تھی کہ جب تک کوئی اس کی نشاندہی نہ کرے یہ نظروں میں نہ آتی تھی...

انسان صنّاعی کے بے شمار عجوبے ایسے ہیں جو اُس کے سامنے آتے ہیں تو اُسے مُختصر کر دیتے ہیں... وہ انسان کے ہاتھوں کے بنے ہوتے ہیں اور دیکھنے والے انسان کو حقیر کر دیتے ہیں... تاج محل' اہرام مصر یا اکراپلس کی جانب اشارہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ آپ کی نظر کے آگے ایک عظیم بند باندھ دیتے ہیں... لیکن کچھ عجوبے ایسے ہیں جن کی قربت میں پہنچ کر اُنہیں جُھک کر دیکھا جاتا ہے یا اُن کی جانب اُٹھی ہوئی اُنگلی کے آگے راستہ تلاش کر کے اُنہیں دیکھا جاتا ہے... ان میں بہزاد کی مُختصر تصویریں ہیں... موہنجوڈارو کی رقاصہ کا بالشت بھر مجسمہ ہے اور یہ پی کاک وِنڈو ہے...

مور کھڑکی سے عین نیچے ایک ریٹائرڈ تبتی لاما کی دوکان تھی جو صرف نیپالی وُڈ ورک سجائے بیٹھا تھا... دوکان کا دروازہ تبتی اور نیپالی قامت کے حساب سے ذرا ٹھگنے قد کا تھا اور اُس کے اندر جانے کے لئے ذرا احتیاط کرتے ہوئے سر جھکا کر داخل ہونا پڑتا تھا ورنہ پیشانی پر جو زخم آتا وہ مندمل ہو بھی جاتا تو ایک محراب کی مانند مُقدس نہ ٹھہرتا کہ ایک چوبی مور کی زیارت کے دوران اگر یہ داغ ملے تو یہ داغِ کفر اور شرک ہو گا...

تبتی لاما کی نیچی چھت کی نیم تاریک دوکان کے اندر... نئے نکور دروازے اور کھڑکیاں بھی تھیں اور اُنہیں سیاہ رنگ سے پالش کر کے اُنہیں قدیم شکل دیئے جانے

والے نمونے بھی تھے... یہ مُختصر نمونے... الگ الگ ڈیزائنوں کے چھوٹے دروازے' کھڑکیاں' ستون اور محرابیں قدرے بیش قیمت تھے لیکن ہم بودی شاہ پر اعتبار کر کے یہاں آئے تھے اور اُس کا کہنا تھا کہ یہ سب کے سب ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں مشینوں پر تیار کردہ نہیں... اور وہ ایسا نہ بھی کہتا تو ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہ کسی انسان کی شب و روز کی ریاضت سے وجود میں آئے تھے... کیونکہ انسانی ہاتھ میں تکنیکی طور پر دُرست کمال نہیں ہوتا... ایسا مشینی کمال جو کسی بھی تخلیق کو بے جان کر دیتا ہے... سندھی یا سواتی کڑھائی اگر ہاتھ کی ہو تو اُس کا ہر پُھول' ہر بُوٹا ایک دوسرے سے ذرا مختلف ہو گا... ذرا بے ربط ہو گا کہ مکمل ربط صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ نمونہ کوئی ایسی شے بنائے جو سانس نہ لیتی ہو... اور اگر وہ شے انسان ہو تو وہ سانس لے گا اور اُس کے ہاتھوں سے تخلیق کیا جانے والا نمونہ... وہ بے شک ایک تصویر ہو' کڑھائی یا لکڑی اور پتھر پر کھدائی ہو... ایک عشق خاص ہو... تو اِن سب میں اُس کے سانسوں کا زیر و بم ضرور شامل ہو گا...

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ایورسٹ کے دامن میں پہنچنے کے لئے جو ڈالر میں نے اپنے دامن میں سنبھال رکھے تھے اُن سب سے یہ سب حیرتوں کی کھڑکیاں دروازے اور مور خرید لوں یا قدرے اجتناب کروں... میں ایسے موقعوں پر اکثر غلط فیصلے کرتا تھا اور جب گھر واپس پہنچتا تھا تو احساس ہوتا تھا کہ نراکاٹ کباڑ خرید لایا ہوں... چنانچہ اس بار میں نے صحیح فیصلہ کیا کہ صرف ایک نمونہ خریدوں گا اور ان کی خُوبصورتی کے طلسم میں نہیں آؤں گا اور یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا... تو کوئی ایک نمونہ کونسا خریدا جائے؟

یا تو میں اس دوکان کے اُوپر صدیوں سے ناچ کے انداز میں پَر پھیلائے مور کی ایک شکل خرید لیتا... یا وہ دروازہ حاصل کر لیتا جس کے مُختصر در کھولنے سے قوتِ متخیلہ کے تمام تر در کھل جاتے تھے...

ایک مور جب پَر پھیلا کر اپنے حُسن اور رنگ کی راجدھانی کی نمائش کرتا ہے تو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ سخت جسمانی اذیت میں ہوتا ہے' اُسے پَروں کو پھیلا کر اُنہیں پھیلائے رکھنے اور اپنی چھب دکھلانے کے لئے اپنی تمام تر قوت بروئے کار لانی پڑتی ہے... اگر وہ اپنی توجہ اور زور سے ذرا غافل ہو جائے تو اُس کا رنگین چھتنار محل منہدم ہو

جائے اور اُسکی کرکری ہو جائے...

توکیا مجھے یہ مور خریدنا چاہئے...

تمام جانوروں' پرندوں اور انسانوں کو اپنی جنسِ مخالف کو اپنی کشش میں لینے کے لئے ازحد جسمانی اذیت سہنا پڑتی ہے... اس میں اُن کی میل شاونزم بھی ہوتی ہے اور مجبوری بھی...

توکیا میں ایک ایسا مور خرید لوں جو پَر پھیلائے کھڑا ہے اور اگر میں اُسے اپنی سٹڈی میں آویزاں کرتا ہوں تو وہ ہمہ وقت مجھے اپنی محروم کا احساس دِلا کر شرمندہ کرتا رہے...

میں بھی تو ایک زمانے میں بہت زور لگا کر اذیت میں مبتلا ہو کر اپنے پَر پھیلاتا تھا اور اُن کے رنگ لشکیلے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے ہوتے تھے... جنسِ مخالف کے سامنے بظاہر لاپرواہ ہو کر ناچتا تھا... اور کچھ زیادہ ناکام بھی نہیں ہوتا تھا... اور اِن دنوں... اِن زمانوں میں... جب داڑھی سفید ہو چلی ہے اور قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں تو اِن دنوں میرے پَر اوّل تو بدن سے بلند ہی نہیں ہوتے اور اگر کوشش بسیار کے بعد قدرے بلند اور نیم ایستادہ ہو بھی جائیں تو اُن کے رنگ اتنے پھیکے پڑ چکے ہیں کہ کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا...

چنانچہ ایک ایسے پَر پھیلائے مور کو خریدنے کا فائدہ جو مسلسل وجہِ شرمندگی بنا رہے۔ میں نے ایک مختصر سیاہ رنگ کا چوبی دروازہ خرید لیا جس کے در کھلتے تھے... اور ایسے بے آواز کھلتے تھے جیسے کُھل گئے شہرِ غم کے دروازے... اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی...

وہ دروازہ اب میری سٹڈی میں اُستاد اللہ بخش کی ایک ڈرائنگ کے نیچے آویزاں ہے... اُس کے دَر اب بھی اِک ذرا سے چھونے سے کھلتے ہیں لیکن اُن کے پیچھے سوائے پلاسٹک امَلشن سے سے پینٹ کی ہوئی ایک دیوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا...

"اب واپس چلیں تارڑ صاحب۔" سُنہری بابا جو اپنی سراسیمگی کو اب تک قابو

میں رکھے ہوئے تھے اب اُسے مکمل طور پر ظاہر کر کے بیباک ہو گئے... اُن کے اندر ساڑھے چار بجے روانہ ہونے والی ایئر بس کا ٹائم بم اتنی بلند آواز میں ٹک ٹک کرنے لگا کہ اُس کی دھمک سے تبتی لاما کی دوکان میں جتنے مور پَر پھیلائے کھڑے تھے مزید ساکت ہو گئے اور جتنے دروازے کھلے تھے اُن کے دَر دستک دینے لگے...

ہم واپسی پر بھگتا پور کے اُن گلی کوچوں میں سے ہانپتے ہوئے گذرے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے ہم اطمینان اور شانتی کے گیت الاپتے ہوئے آئے تھے...

"ناگ دیوتا، ایک متروک خدا...
اے ہمالہ... اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں"

دربار سکوئر میں پہنچ کر سُنہری بابا نے اپنی گھڑی پر سے نظریں ہٹائیں کہ وہ بھگتا پُور کی بھاگ دوڑ میں راستہ نہ دیکھتے تھے... یہ نہ دیکھتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں اور تمنّا کا اگلا قدم کہاں رکھ رہے ہیں۔ صرف اپنی گھڑی دیکھتے تھے... "تارڑ صاحب... میں ابھی اس سامنے والی دوکان سے اسلام آباد فون کر کے آتا ہوں... تاکہ گاڑی ایئرپورٹ پر آ جائے... صرف پانچ منٹ میں آتا ہوں..." یہ کہہ کر وہ اپنی سُنہری ریش لہراتے رُخصت ہو گئے۔

تو اِن پانچ منٹوں میں مَیں کیا کروں؟

بودی شاہ کے لئے یہ کوئی پرابلم نہ تھی کہ وہ اگلے پانچ منٹوں میں یا پانچ برسوں میں کیا کرے... وہ سر جھکائے اپنی بودی سنوارتا تھا اور ایک زمینی بھگوان کے چرنوں میں بھینٹ کئے ہوئے زعفران زدہ زردے کو بھوکی نظروں سے دیکھتا تھا اور اُسے اپنے بھوکے پیٹ میں اُتار نہ سکتا تھا کہ یہ کھانا صرف دیوتاؤں کے لئے تھا... وہ کھائیں یا نہ کھائیں یہ اُن کی مرضی تھی... بے شک اُس پر مکھیاں بھنبھنائیں... لیکن وہ خداؤں کی خوراک تھی... انسانوں کی نہ تھی۔ خدا اُسے کھا نہ سکتے تھے... انسان اُسے کھا سکتے تھے۔ اور اس کے باوجود وہ اُسے کھانے کی جرات نہ کرسکتے تھے اور اُس پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں...

میں نے بودی شاہ اور اُس کے بھگوانوں کے بیچ جو خوراک کا جھگڑا تھا اُس میں

دخل نہ دیا اور سامنے دیکھا جہاں "نیشنل آرٹ گیلری" کا بورڈ ایک قدیم محل کی پیشانی پر ثبت تھا۔

میں اُس گیلری کے بے شمار برآمدوں میں سے گذرا... اور سرسری گذرا... کچھ مجسمے دیکھے... تانترک آرٹ کے نمونے اور تصویریں دیکھیں... نیپالی شاہوں کی تصویریں اور زندگی کے حالات دیکھے اور تبتی قدیم دستاویزات دیکھیں لیکن میں اُن سے متاثر نہ ہو سکا... سرزمین گندھارا کا ایک باشندہ جو جانتا تھا کہ مجسموں میں جان ہوتی ہے... تصویریں سانس لیتی ہیں... اور تخلیق کا اوجِ کمال کیا ہوتا ہے وہ کیسے اِن سے متاثر ہو سکتا تھا۔ میں باہر آ گیا...

سُنہری بابا ابھی تک منظر میں نہیں تھے... ابھی تک اُس دوکان میں روپوش اسلام آباد فون کر رہے تھے اور غالباً اُنہوں نے روانگی کے ٹائم بم کی ٹک ٹک کرتی گھڑی کو تھوڑی دیر کے لئے ساکت کر دیا تھا... میں انتظار کرنے لگا۔

اس منظر میں جس میں سُنہری بابا کا نزول ہونا تھا چند دوکانیں اور ریستوران اور چند مندر تھے... ایک دوکان پر ایک بورڈ آویزاں تھا "کشمیری زعفران یہاں ملتا ہے..."

میں نے آج تک زعفران کا پھول نہیں دیکھا...

میں نے زعفرانی چاول تو کھائے ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس کی شکل کیسی ہوتی ہے اور اس کی مہک کیا ہوتی ہے... اور اس کے باوجود تارڑوں کو زعفران سے ایک دُور کی نسبت ہے...

کولو تارڑ کے گاؤں میں دریائے چناب کے کنارے جب اُس کے کھیتوں میں سُنہری گندم کے سُنہرے سمندر ٹھاٹھیں مارتے تھے اور گردنیں اُونچی کرتے تھے تاکہ وہ کسی درانتی کی زد میں آکر کٹ جائیں تو ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ ستر برس پہلے کا قصّہ ہے... میں اپنے گاؤں کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے داخل ہوا تو وہاں ایک الگ لباس اور الگ چہرے مہرے والا اجنبی مسافر خوابیدہ تھا... وہ بیدار ہوا تو کہنے لگا "بابا... میں ایک دور افتادہ ہمالیائی وادی سے آیا ہوں جہاں سے تبت کو درّے نکلتے ہیں۔ بہت مشکلوں سے اس گاؤں کو تلاش کیا ہے۔ میری وادی میں آباد جو لوگ ہیں وہ آپ کے قبیلے سے ہیں۔ بہت متمول اور خوش حال ہیں۔ اُنہوں نے میری ذمہ داری لگائی ہے کہ میں اُن کا

اصل تلاش کروں... کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کیا ہیں... جب انسان مکمل آسائش کو پالیتا ہے اور اُس کے پاس خواب دیکھنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تب اُسے اپنے آبا یاد آتے ہیں اور وہ اپنی جڑوں کو جاننے کی خواہش کرتا ہے... وہاں اُس ہمالیائی وادی میں جو لوگ آباد ہیں اُن کے نام اور ولدیت... یہ... اور یہ ہے... یہاں کون ہے جو پچھلے ایک سو برس کی تاریخ کا... حسب نسب کا حساب رکھتا ہو۔"

بزرگ جو کولو تارڑ میں یہ قصّہ مجھے بیان کرتا تھا اُس اجنبی سے کہنے لگا "ہمارا جدی پُشتی ایک دادا ہے... ایک میراثی ہے جو ہماری پشتوں کا حساب رکھتا ہے۔"

تو وہ قدیم میراث کا دانش مندر میراثی اُس اجنبی شخص کی درخواست پر اُس کے ہمراہ اُس ہمالیائی وادی کو چلا گیا۔

بہت برسوں کے بعد اُس کی واپسی ہوئی تو اُس نے اپنا قصّہ بیان کیا... چوہدری صاحب... وہ اجنبی شخص مجھے دریائے چناب کے کناروں سے سری نگر کی جھیل ڈل تک لے گیا۔ وہاں سے ہم نے کئی روز تک ٹٹوؤں پر سفر کیا... راستے میں برفانی تودے اور بلند گذرگاہیں آئیں... ہم نے دریا عبور کئے... جھیلوں کے پار گئے اور ہمہ وقت چھائے بادلوں اور گرتی برف کے اندر گئے۔ اور تین روز کی مسافت کے بعد ایک ایسی وادی میں پہنچے جو نہایت سرسبز اور ہنستی ہوئی تھی... وہاں تاحد نظر زعفران کے پھولوں کے کھیت تھے اور کہا جاتا ہے کہ جو بھی بہار کے جوبن میں .... زعفران کے کھیتوں کو... اس کشت زعفران کو دیکھتا ہے تو اُس کی خوش نُمائی اور خوشبو ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہنستا چلا جاتا ہے اور اُسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا... اگلی صبح میں اُس وادی زعفران میں بکھرے لکڑی کے گھروں کی چھتوں پر کھڑا ایک موذن کی طرح اُن کے مکینوں کا شجرۂ نسب بہ آوازِ بلند بیان کرنے لگا... کہ فلاں... فلاں کا بیٹا... فلاں کا دادا... اور وہ فلاں تارڑ کا پوتا... اور بالآخر... فلاں چناب کے کنارے گاؤں کولو تارڑ کے فلاں گھرانے کا بیٹا... وہ اپنا حسب نسب جان کر خوشی سے بے حال ہو گئے اور اُنہوں نے مجھے تحائف کے عجائبات سے لاد دیا... وہ کسی زمانے میں اپنے چناب سے جُدا ہو کر روزی روزگار کی تلاش میں خانہ بدوش ہوئے اور ہمالیہ کی گود میں روپوش اُس وادی میں جا قیام کیا... اپنی محنت اور مشقت سے اُس کی ویرانی کو آباد کیا... زعفران اُگایا اور صاحب ثروت ہو گئے..."

اور جب صاحب ثروت اور دولت مند ہو چکے تو اُنہیں چناب کا کنارا یاد آیا...

بزرگ نے بتایا کہ وہ میراثی اُس وادی زعفران سے اُس کے دادا کے لئے اُن کشمیری تارڑوں کی جانب سے پشمینے... کی ایک ایسی شال تحفے کے طور پر لایا تھا کہ اُن کے دادا جان جب پوہ ماگھ کے پالوں میں اپنے صحن میں اُسے اوڑھ کر سوتے تھے تو پسینے سے نہا جایا کرتے تھے...

بھگتا پُور میں جب سُنہری بابا اسلام آباد فون کرتے تھے اور پانچ منٹ کے وعدے کو نصف گھنٹے تک طول دیتے تھے اور روانگی کے ٹائم بم کو نہایت آسائش سے خاموش کرتے تھے تو سامنے ایک دوکان پر... "کشمیری زعفران یہاں ملتا ہے" کے بورڈ کو دیکھ کر مجھے ایک ایسی زعفرانی وادی کی یاد آگئی تھی جس کے کاشت کار تارڑ تھے...

اور چونکہ سُنہری بابا پانچ منٹ کا وعدہ کر کے ایک مدت سے روپوش تھے اس لئے بودی شاہ اپنی بودی کے ہربال کو الگ الگ کر کے سنوارتا تھا...

تو میں فارغ البالی کے اس موسم میں کیا کرتا... میری تو کوئی بودی بھی نہ تھی جسے میں سنوار سکتا' اور یہاں مجھے ایک عدد بودی کی افادیت کا شدید احساس ہوا... ویسے اگر میری ایک بودی ہوتی تو میں نہایت بودا لگتا... اس لئے فارغ البودی کے اس موسم میں صرف وقت گذاری کے لئے میں سُنہری دروازے کے اندر چلا گیا... پچپن کھڑکیوں والے محل کے پہلو میں جو کماری مندر تھا اُس کے اندر چلا گیا...

اور وہاں اب بھی "ادھر صرف ہندو لوگ داخل ہو سکتے ہیں" کا بورڈ آویزاں تھا... کوئی دیکھتا نہ تھا...

آس پاس نہ کوئی غیر ملکی سیاح تھا... نہ کوئی نیپالی نہ کوئی بھگت...

میں اس کے اندر جا سکتا تھا۔

کوئی دیکھتا نہ تھا...

لیکن اُس کے اندر جو بُت تھے... وہ مجھ پر کڑی نظر رکھتے تھے... وہ جانتے تھے کہ سو دو سو برس پیشتر میں نے اپنی بودی کٹوا کر اُن سے بے وفائی کی تھی اور ربِ کعبہ کی پرستش کرنے لگا تھا۔

مجھے بھی بھگتا پُور کے ان بتوں سے نسبت تھی... اگرچہ دُور کی تھی۔

اور اُنہوں نے مجھے ابھی تک اس بے وفائی پر معاف نہیں کیا تھا...

میں چاہتا تو یہی تھا کہ آخری بار اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی بے وفائی کی معذرت کروں لیکن اُن کی خشونت اور پتھریلی نگاہوں سے لگتا تھا کہ وہ معاف کرنے کے مُوڈ میں نہیں ہیں۔

مجھے کوئی نہیں دیکھتا تھا... میں اس مندر کے اندر جا سکتا تھا۔

لیکن ہم تو غالب کے وہ طرف دار تھے کہ اگر درِ کعبہ وا نہ ہوا تو ہم لوٹ آئے...

تو ان بتوں کی خدائی اور خشونت کو کیونکر برداشت کرتے...

ہم لوٹ آئے۔

اپنی مسلمانی کو داؤ پر نہ لگایا...

میں اگر نیپال کھنچا کھنچا چلا آیا تھا' تو سُنہری دروازے کے حُسن کا اسیر ہو کر ہرگز نہیں آیا تھا۔ نہ اس کماری مندر کے طلسم کی گرفت میں آکر نڈھال ہو کر اِدھر آیا تھا۔

مَیں اِدھر آیا تھا تو ایک سانپ دیوتا کے درشن کے لئے آیا تھا۔

اس کماری مندر سے پرے... زمنی بھگوانوں کے چرنوں میں بکھری زعفرانی خوراک' گیندے کے پھولوں اور تیل اور گھی سے پرے... پچپن کھڑکیوں والے محل کے پچھواڑے میں ایک خشک تالاب کے اندر جو سانپ دیوتا اپنا پھن کھلارے کھڑا تھا... اور اُس کے پھیلے ہوئے پھن کے پس منظر میں ہمالیہ کی برفانی زنجیر سفید ہوتی تھی...

ایک خشک تالاب میں۔

واسوکی کا اژدھا اپنا سُنہری پھن ایک زرافے کی طرح اپنی گردن لمبی کئے تھا...

وہ سانپ... وہ پوکماری نہیں جانتا تھا کہ جس بنیاد سے اُس کا لچکیلا بدن اُٹھتا ہے وہاں اب یاتریوں کے اشنان کے لئے پانی نہیں ہیں... ایک خشک تالاب ہے اور وہ اِس خشکی میں سر اُٹھاتا بلکہ پھن اُٹھاتا ذرا متروک ہو چکا ہے۔

متروک خدا بڑے بد قسمت ہوتے ہیں۔

وہ اپنے تئیں خدا ہی رہتے ہیں... بھگوان ہی رہتے ہیں۔

لیکن اُن کے زمانے گذر چکے ہوتے ہیں۔

اُن کے پجاری رُخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔

وہ ایسٹر آئی لینڈ پر سمندر کی بجائے جزیرے کی جانب دیکھتے ہیں کہ اُنہیں تراشنے والے اُن کے قدموں میں آئیں گے اور وہ نہیں آتے...

افغانستان میں... دنیا کے سب سے بڑے ساکیامنی... بدھ کے مجسمے وادی بامیان میں ہیں جنہیں سکندرِ اعظم نے بھی دیکھا تھا اور اور جن کے عظیم اجسام کے اندر بدھ خانقاہوں کی چٹانی بھُول بھلیاں ہیں... اور جن کے چہرے مٹا دیئے گئے ہیں وہ بھی تو اپنے بھکشوؤں کے انتظار میں ہیں... جنہیں طالبان بارود سے اُڑا دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے وطن کو کفر کی آلائشوں سے پاک کر سکیں... اور پوری دنیا کے احتجاج پر فی الحال اپنے اس نیک ارادے سے باز آچکے ہیں... وہ بھی منتظر ہیں۔

لکسور... مصر... کے سُورج دیوتا... جہان آباد سوات کی چٹان میں دھونی رمائے گوتم... یونانی دیوتا... شہر بابل کے اوتار... پرس پالس کے سوختہ مجسمے... میکسیکو کے اہرام میں خوابیدہ بت... موہنجوڈارو کا پادری بادشاہ... ہڑپہ کی مٹی سے پکائی ہوئی ماں دیوی... اور کوہستانِ نمک کے کٹاس مندروں کی دیویاں...

یہ سب کے سب متروک خدا ہیں۔

جو بڑے بد قسمت ہیں کہ اب وہ نرے پتھر ہیں۔

اُن پر سیاحوں کے کیمروں کی آنکھ کے سوا اور کوئی آنکھ نہیں...

وہ متروک ہو چکے ہیں اور اُن پجاریوں کے منتظر ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے...

تو کیا موجود خداؤں کا بھی یہی حال ہو گا...

آج نہیں... آج سے دو تین ہزار برس بعد...

کیا یہ بھی متروک ہو جائیں گے... اور ہم جیسے پجاریوں کو ترسیں گے...

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں...

بھگتاپور کے تہہ در تہہ مندروں' عبادت گاہوں اور راج محلو اور ناگ دیوتا کے ساکت سُنہری پھن کے پسِ منظر میں جو آسمان تھا وہ خالی نہ تھا... اُس کے پیچھے فصیل کشور ہندوستاں تھی... سفید لامتناہی برفانی فصیل جس کی چوٹیاں بُرج میناروں کی طرح بلند ہوتی تھیں اور میں اس فصیل کے دامن تک نہ پہنچ سکا تھا... میں اپنے جوگر شوز اور سنو جیکٹ سے شرمندہ تھا کہ اُنہیں وہاں نہ لے جا سکا تھا... ایک مرتبہ میں نے اپنے ٹریکنگ شوز

کے موٹے تلووں کو غور سے دیکھا تو اُن میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پتھریلے کنکر پھنسے ہوئے تھے... ہر کنکر میں ایک سفر کی داستان تھی... کوئی ایک کنکر بالتورو گلیشیئر کا حصّہ تھا... کوئی پامیر کا تھا اور کوئی سنولیک کے بیس کیمپ کی نشانی تھا... میرے جوگرز کی قسمت میں یہ نہ تھا کہ اُن کے تلووں میں ایورسٹ کے دامن کا کوئی کنکر پھنس کر لاہور شہر کے بُرج میناروں تک سفر کرے...

ہمالیہ... سفید... ایک تسلسل کے ساتھ... دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کا ایک سفید دوپٹہ جو افق تا افق لہراتا تھا اور مجھ سے بہت دُور تھا...

اور بھگتا پُور کے دربار سکوئر سے ہٹ کر پچپن کھڑکیوں والے راج محل کے دامن میں ایک خشک تالاب کی گہرائی سے اُٹھتا ہوا ایک اژدھا پھن اُٹھائے یوں بلند ہوتا تھا جیسے وہ ایورسٹ اور انا پورنا کی برفوں کو ڈس لینا چاہتا ہو... میں نیل کرائیاں نیلکاں میرا تن من نیل و نیل اُن کے سفید کنوارے بدن کو نیلو نیل کر دینا چاہتا ہو... اُس اژدھے کا رنگ دھوپ میں سُنہری ہوتا تھا اور وہ بھگتا پُور کے آسمان پر ایک شِولنگ کی طرح تنا ہوا اور ایستادہ ہوتا تھا...

اور جس تالاب میں سے وہ اُٹھتا تھا وہ نہ صرف خشک تھا بلکہ اُس میں کہیں کہیں کیچڑ بھی تھا...

کبھی یہاں ایسے پجاری بھی ہوتے تھے جو اس تالاب کو گیندے کے پھُولوں' معطر تیل اور زعفرانی چاولوں سے بھرتے تھے...

ناگ دیوتا کی زیارت کے لئے تبت اور چین تک سے آتے تھے...

اب وہ پجاری بھی رُخصت ہو چکے...

ویسے ہر پجاری ہر زائر اپنی خصلت میں نہایت خود غرض ہوتا ہے... وہ درشن کرتے ہیں' زیارت کرتے ہیں۔ پُوجا کرتے ہیں' دعائیں مانگتے ہیں۔ پرنام کرتے ہیں' سلام کرتے ہیں۔ متھا ٹیکتے ہیں' سجدہ کرتے ہیں... اور اپنی آخرت سنوار کر رُخصت ہو جاتے ہیں... پھر اپنی زیارت کی خبر نہیں لیتے۔ چنانچہ اس ناگ دیوتا کے پوجنے والے بھی گم ہو چکے تھے اور باقی صرف ٹورسٹ رہ گئے تھے... اُن کے لئے یہ ناگ دیوتا نہ تھا۔ ایک ساکت اور بے جان اژدھا تھا جو ایک زیبرے کی طرح گردن لمبی کئے بھگتا پُور کے خشک

تالاب میں ایک بیوقوف شتر مُرغ کی طرح کھڑا تھا...

ایک پجاری اور ایک زائر اگر خود غرض ہوتا ہے تو ایک ٹورسٹ ظالم ہوتا ہے... وہ کسی مندر' مسجد یا کلیسا کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ کیا اس کی تصویر اچھی بنے گی۔ وہ ان عبادت گاہوں کی پاکیزگی کو لاتعلقی سے دیکھتا ہے... وہ صرف ایک تصویر کا پجاری ہے...

ناگ دیوتا متروک ہو چکا تھا اور اُس کی زندگی میں اب کوئی مقصد نہ تھا سوائے اس کے کہ... سیّاح اُس کے سُنہری پھن کی تصویریں اُتار کر چلے جائیں... جیسے وہ ابوالہول... تاج محل' مائیکل انجلو کے داؤد اور مُوسیٰ... سٹارونگ بُڈھا... کوہ طور... اور آئفل ٹاور کی تصویریں اُتار کر چلے جاتے تھے...

تو یہ ناگ دیوتا بھی اب بے مقصد اور بے جان کھڑا تھا...

اگرچہ ایک زمانے میں وہ زندہ اور زہرناک تھا...

مجھے آج ساڑھے چار بجے پی آئی اے کی ایئر بس پر شکوک اور کفر اور اِس ناگ دیوتا کی سرزمین سے دُور چلے جانا تھا... لیکن میں اُسے مسلسل دیکھتا تھا...

پچپن کھڑکیوں والے محل کے باہر دربار سکوئر کی کسی ایک دوکان میں سُنہری بابا اسلام آباد فون کر کے ایئر پورٹ پر سرکاری گاڑی کے پہنچنے کا اہتمام کر رہے تھے اور میں... یہاں ایک گہرے خشک تالاب کے کنارے کھڑا... ایک قطب مینار کی طرح بلند ہوتے ہوئے اُس اژدھے کو تک رہا تھا... اُس کے سحر میں آیا ہوا تھا... اُس سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا... جیسے شنید ہے کہ سانپ کی آنکھیں اُس کے شکار کو مسحور کر دیتی ہیں اور وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا... اگرچہ اس اژدھے کے سُنہری پھن کا رُخ ایورسٹ کی برفوں کی جانب تھا' وہ اُدھر دیکھتا تھا لیکن کوئی ایک لمحہ ایسا آیا جب میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کن اکھیوں سے مجھے دیکھتا تھا... اور پھر ایک اور وقت کی ڈھول میں اٹا گذرتا ہوا لمحہ رُکا اور اُس لمحے میں اُس نے مجھے پہچان لیا... لیکن شناخت اور پہچان میں وہ تنہا نہ تھا... میں نے بھی اُسے جان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا ہے... اور ہماری ملاقات اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے۔

یہی تو ہر برس مجھے ڈستا تھا...

میں نے ایک عمر یونانی دیو مالا کی کشتی "آرگوس" میں سمندروں پر اپنی آوارہ گردی اور خواہش کے بادبان پھیلائے سفر کیا تھا... میں ان سمندروں کے سفر میں وہاں سے گذرا تھا جہاں جادو گر دوشیزاؤں کے ایسے جزیرے تھے کہ اُن کی قربت سے گذرنے والے مسافر اُن حسیناؤں کے نغمے سُن کر مدہوش ہو جاتے تھے۔ وہاں یک چشم دیو تھے جو سمندر میں سے اُبھر کر میری کشتی کو تباہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے بھی گذرا جہاں اطالیہ اور سسلی کے درمیان ایک درّہ نُما گذرگاہ ہے اور سسلی کے ایک آتش فشاں میں سے اُبلتی آگ کو رات کے پچھلے پہر عرب مسافر "النار۔ النار" پکارتے تھے۔ اور یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں محاورہ مشہور ہے کہ "شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان" کہ ایک جانب وہ دیو مالائی چڑیل تھی جو جہازوں کو نگل جاتی تھی اور دوسری جانب سمندر میں ایسے بھنور تھے جو کشتیوں کو ڈبو دیتے تھے... عام لوگوں نے جن محاوروں کو صرف کتابوں میں پڑھ رکھا ہے میں نے اُن کے اندر سفر کیا ہے۔ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں اور میں اُن کے اندر سفر کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔

ناگ دیوتا بظاہر مجھ سے روٹھا ہوا اُدھر دیکھتا تھا جدھر ہمالیہ کی سفیدی تھی۔

شاید وہ میرا سامنا نہیں کر سکتا تھا...

میری والدہ نے پورے یقین کے ساتھ میرے ننھیالی گاؤں کے اُس جولاہے کا قصہ سُنایا تھا جس نے بے خبری میں ایک ناگ اور ایک ناگنی کے ملاپ کے دوران خوفزدہ ہو کر ناگ کو ہلاک کر دیا تھا... اور تب ہر برس اُسی موسم میں وہ ناگنی اُس جولاہے کو... وہ جہاں کہیں بھی ہوتا تلاش کر لیتی اور اُسے ڈس لیتی... اور جب بھی اُس کے ڈسنے کے دن قریب آتے تو میری والدہ کا کہنا تھا کہ اُس جولاہے کا بدن ٹوٹنے لگتا... وہ پژمردہ اور نڈھال ہو جاتا اور انتظار کرنے لگتا... راہ دیکھنے لگتا... اور جب وہ ناگنی اُسے تلاش کر کے اپنا زہر اُس کے بدن میں اُتارتی تو وہ پھر سے ہشاش بشاش اور پھرتیلا ہو جاتا... وہ زندہ ہو جاتا...

میں بھی وہی جولاہا تھا...

شاہ حسین بھی ایک جولاہا تھا جو مادھو لال کے ڈسنے کا منتظر رہتا تھا۔

عثمان فقیر بھی عشق کے اژدھے کے ڈسنے سے دوہائی دیتا تھا کہ... یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے...

فرید کو بھی روہی کی نازک جٹیاں جو راتوں کو دِلوں کا شکار کرتی تھیں... ڈستی تھیں۔

وارث شاہ بھی ہیر کے رانگلے پلنگ پر ڈسے جانے کی آرزو کرتا تھا۔

نابینا ہومر بھی اُسی کی راہ دیکھتا تھا۔

غالب خستہ حال بھی یہی کہتا تھا کہ... ہے یہ وہ آتش غالب...

اور اقبال بھی عقل کو بام پر محوِ تماشا دیکھتا تھا اور بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا تھا۔

فیض بھی ایک عشق خاص کو گلے لگانے کی آرزو میں تھا۔

اور منیر نیازی کے دَر بھی اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی کھل جاتے تھے...

اور مجید اَمجد... اپنی شالاط کے لئے... تم پھر نہ آسکو گے' بتانا تو تھا مجھے... تم دُور جا کے بس گئے' میں ڈھونڈتا پھرا... ایک نازک بیاض پر مرا نام... کون سمجھے گا اس پہیلی کو... وہ بھی ایک جرمن ناگنی شالاط کے زہر سے شاعری کرتا رہا...

میں اِن ڈسے جانے والے لوگوں کا ایک ادنیٰ مُرید ہوں...

اس ناگ نے مجھے پہلی بار رتّی گلی کی جھیلوں میں تیرتے برفانی تودوں میں سے پھن کھڑا کر کے مجھے ڈسا تھا۔ مجھ میں آوارگی اور کوہ نوردی کا زہر بھر دیا تھا اور اُس کے بعد کوئی حساب کتاب نہ تھا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ رتّی گلی کی جھیلوں میں سے جس ناگ نے پھن پھیلایا تھا... اُس نے مجھے نہیں... میں نے اُسے ڈس لیا تھا... اُس کے تن بدن میں زہر بھر دیا تھا۔

اس کا فیصلہ تو نہیں ہو سکتا کہ کس نے کس کو ڈسا تھا۔

کہ تُو من شدی... من تُو شدم...

کون ہے جس نے پہلا وار کیا تھا۔

اور یہ اژدھا ہر کسی کو نہیں ڈستا... اس لائق ہی نہیں سمجھتا کہ اپنا زہر ضائع کرے... صرف اُس میں اپنا زہر داخل کرتا ہے جو خود یہ چاہتا ہو کہ ایسا ہو...

تب بھگتا پُور کے دربار سکوئر میں... بچپن کھڑکیوں کے راج محل میں پوشیدہ لِنگ کے طرح تنا ہوا اُس ناگ دیوتا کا پھن زندہ ہوا... اُس نے ہمالیہ کی برفوں سے پھن

موڑا... مجھے دیکھا۔ مجھے پہچانا اور جانا... اور میری جانب جھکتا چلا گیا... اُس کا سُنہری پھن میرے چہرے کے سامنے تھا... میں نے تمہیں پہچان لیا ہے... وہ جھکا... اور اُس نے ایک مرتبہ پھر مجھے ڈس لیا... میرا جولاہا بدن ٹوٹتا تھا... اچھا کیا جو اُس نے مجھے پھر سے ڈس لیا۔

یا شاید... میں نے اُسے ڈس لیا...

ہم میں سے کون زیادہ زہرناک ہے... اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔